پٹھان اور بلوچ

مُصنف

ایڈورڈ۔ ای۔ اَیور

مُترجمہ

پروفیسر ایم۔ انور رومان



پٹھان اور بلوچ

مُصنفہ :

ایڈورڈ۔ای۔آلیور

مُترجمہ :

پروفیسر ایم انور رُومان

نساء ٹریڈرز
کوئٹہ (پاکستان)

جُملہ حقوق محفوظ

طابع ———— عابد بُخاری

مطبع ———— علی پرنٹرز۔ پیسہ اخبار۔ لاہور

طبعِ اوّل ———— ۱۹۸۴ء

تعداد ———— ایک ہزار

قیمت ———— ۶۰ روپے

•

اصل کتاب "Across the border
Pathan and Baluch" کے نام سے
Edward . E . Oliver نے تحریر کی اور
پروفیسر ایم انور رُومان نے اِس کا اُردو ترجمہ کیا۔

•

اشاعتی ادارہ : نساء ٹریڈرز ۶۔ براؤن جیمخانہ بلڈنگ۔
پٹیل روڈ۔ کوئٹہ (پاکستان)
فون : ۷۴۶۸۱

انتساب

ایک لائن مین کی معاشرے میں کیا حیثیت ہے اور ادب تو خیر، ماشاءاللہ چشمِ بددُور، معاشرے سے بھی ماورا ہے۔ اس میں بیچارے ایک لائن مین کا کیا گذر؟

فیض (المعروف بہ فیضو) ایک لائن مین تھا، واپڈا کا ایک ادنیٰ ملازم: وہ اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر گھر جا رہا تھا۔ ایک کُوچے میں بجلی کی ایک تار ٹوٹ کر گِر پڑی تھی۔ قریب ہی چھوٹے چھوٹے بچے کھیل رہے تھے۔ اُس نے اِن البیلے، خودمست بچوں کو دیکھا، دستانے پہنے اور تار کو ہاتھ میں پکڑ کر کھمبے کے اوپر چڑھ گیا تاکہ اِسے جوڑ سکے۔ اِسی دوران اُسے بجلی کا ایک زبردست جھٹکا لگا اور وہ دھڑام سے نیچے گر گیا اور جاں بحق ہو گیا!

واپڈا والوں کو اُس کی فکر نہ تھی کیونکہ وہ ڈیوٹی پر نہ تھا:
کوچے والوں کو اُس کی فکر نہ تھی کیونکہ وہ اپنی ڈیوٹی کی نذر ہوا تھا!
بچوں کو اُس کی فکر نہ تھی کیونکہ وہ ہنوز ناداں تھے:

اُس کی بیوی بیوہ ہو گئی ، اُس کے بچے یتیم ہو گئے۔ آپ کو کیا فکر ؟

میں آپ کی جبین پر اُبھرتے اور اُمنڈتے ہوئے شکنوں کے باوجود اِس کتاب کا اِنتساب اسی وارفتۂ انسانیت، فیضؔ کے نام کرتا ہوں !!

انور رُومان

فہرست مضامین

پیش لفظ

ایڈورڈ آلیور کی یہ کتاب ۱۸۹۰ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئی تھی۔ اُس وقت ہمارے سرحدی صُوبوں میں انگریزی حکومت نسبتاً نئی تھی، لہٰذا انگریز ایک طرف اِسے اندرونی طور پر مستحکم کر رہے تھے اور دوسری طرف خارجی طور پر اِس کے سیاق و سباق میں آنے والے علاقوں اور ممالک کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ اِن میں ایران، افغانستان اور ہمارے قبائلی علاقے شامل تھے۔ وہ یکے بعد دیگرے سروے پارٹیاں ترتیب دے رہے تھے، اِن علاقوں کے نقشے تیار کر رہے تھے، سفارتی سطح پر سلسلہ جُنبانی کر رہے تھے، اپنے علماً فضلاً کو اِن علاقوں میں بھیج رہے تھے اور علم دوست لیکن خطر پسند نوجوان فوجی افسروں کو بھی ان کے مطالعہ و معائنہ کے لئے روانہ کر رہے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ ان نامعلوم و نامحرم خطّوں اور ان کے لوگوں کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کی جائیں تاکہ آئندہ سیاسی و عسکری روابط کے لئے روشنی و رہنمائی حاصل ہو سکے۔ آلیور بھی اِنہی مطالعہ کاروں میں سے ایک تھا۔ اُس نے یہاں بلوچوں کا ایک مختصر سا خاکہ کھینچا (صرف ابتدائی سات ابواب پر) اور پھر شمال مغربی علاقے کا بالتفصیل جائزہ لیا۔ قلم اُٹھانے سے پہلے اُس نے جغرافیائی اور طبعی حصّوں کو خوب سمجھا، خطّہ وار باشندوں کے نسلی کوائف اور اُن کے پھیلاؤ کو دیکھا، اُن کی زبان، تاریخ، اور

ثقافت کا مطالعہ کیا، انگریزی حکومت کے ساتھ ان کے مراسم (خوشگوار یا ناخوشگوار) پر نظر ڈالی، ان کی افرادی بالخصوص متحارب طاقت کا اندازہ لگایا، ان کے محاسن و معائب اور نفسیات و امکانیت پر غور کیا، ایک جمعیت اور دوسری جمعیت کا تقابلی مطالعہ کیا، غرضیکہ قبائل کے ہر رُخِ حیات پر نظر دوڑائی اور یوں ایک ایسا مرقع تیار ہوگیا جو وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اہم سے اہم تر ہوتا چلا جا رہا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب بعض دیگر کتب کی طرح معدنِ معلومات ہے۔

مجموعی طور پر مطالعہ معروضی تھا اور اُسے مجبوراً ایسا کرنا پڑا، اس لئے کہ یہ خطّے اور اس کے لوگ نئے تھے لیکن چونکہ قارئین اکثر و بیشتر انگلستان کے لوگ اور انگریزی بولنے یا لکھنے یا سمجھنے والے تھے لہٰذا تشبیہات و استعارات زیادہ تر انگریزی اور یورپی ہی کام میں لائے گئے، لیکن اس کی بعض باتیں قارئین کو بُری طرح کھٹکتی ہیں۔ وہ موقع بے موقع انگریزی تہذیب نظم و نسق اور معیارِ اخلاق کے قصیدے پڑھتا ہے، اسے اسلام سے بھی سخت کد ہے۔ وہ اسے رجعت پسندوں اور امن شکنوں کا مذہب سمجھتا ہے غالباً اس لئے کہ یہی وہ واحد نعرۂ اتفاق اور رشتۂ اتحاد تھا جو باہم دست و گریباں قبائل کو انگریزی استعمار کے خلاف لا کھڑا کرتا تھا۔ اسلام کے بغیر یہ شعوب و قبائل سامراج کا لقمۂ تر بن گئے ہوتے! وہ سُنّی شیعہ فرقوں کے اختلافات کو بھی اُچھالتا ہے حالانکہ ان کے درمیان جو بنیادی یگانگت موجود ہے اس کے مقابلے پر فروعی اختلافات پر کاہ جتنی اہمیت بھی

نہیں رکھتے۔ اصل میں وہ اسلام کو ناقابلِ مزاحمت دیکھ کر اُسے کمزور کرنے کے لئے رخنے ڈھونڈتا تھا۔ اسلام سے بُغضِ للّٰہی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ باب دہم میں وہ قیس عبدالرشید کا ذکر کرتا ہے کہ وہ مشرّف بہ اسلام ہو کر واپس قبائلی علاقہ میں آئے اور زور شور سے تبلیغ شروع کی تو اُسی کی زبان میں "بیشتر آبادی اسلام سے منوّر ہو گئی (گویا راہِ جہنّم اختیار کر لی!") دیکھا آپ نے؟ پٹھانوں اور دوسروں کو جنونی کہنے والا خود کیسے صلیبی جنون سے مغلوب ہے!

آلیور کے مطابق پٹھان معاشرہ مردزدہ، انتقام جُو، مبتلائے آویزش، انفرادیت پسند، مرکز گریز اور لوٹ مار کا دھنی ہے لیکن اس نے حتی الوسع تصویر کا دُوسرا رُخ بھی پیش کیا ہے مثلاً خٹک، مہمند اور بجوڑی اپنے موروثی سرداروں کو مانتے ہیں اور عام پٹھان بھی جرگے کے فیصلہ کا احترام کرتے ہیں۔ سوات کے یوسفزئی اپنے معاشرہ میں عورت کو نہ صرف افضل مقام دیتے ہیں بلکہ اُس کی حاکمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اپنے علاقہ میں وافر چربی سے صابن بھی تیار کرتے ہیں اور اس سے اپنے پارچات اور جسم وجان صاف کرتے ہیں۔ وہ اپنے دیگر بھائیوں کے برعکس نوواردوں سے گریزاں یا متنفّر بھی نہیں بلکہ اُن سے نہایت تپاک سے پیش آتے ہیں (باب بتیسواں)۔ پٹھان میں وفاداری کا بھی قدرتی مادہ موجود ہے اور وہ 'یک در گیر و محکم گیر' کے مصداق جس کا حلقہ بگوش ہو جاتا ہے مرتے دم تک اُسی کا دم بھرتا ہے۔ ستائیسویں باب میں خوشحال خان کا کردار

اس کی اِس جبلّی وفاداری کا ایک روشن نمونہ ہے ۔ وہ فرنٹ ہارڈی سے
کچھ ایسے منسلک ہُوا کہ اُسے چھٹی لینا یا پنشن پر جانا منظور نہ تھا ۔ پٹھان
عموماً اِنتہاؤں کا انسان ہے ۔ وہ اِدھر یا اُدھر ہوتا ہے ۔ اگر عالم ہے
تو اجلّ اور جاہل ہے تو اجہل، دوست ہے تو سر بکف اور دشمن ہے
تو ہر وقت گھات میں، عامی ہے تو توہم پرست اور روحانی ہے تو
اکثر خدا رسیدہ ۔ چونتیسویں باب میں جناب عبدالغفور اخوند سوات کا مطالعہ
ایسا ہی ہے ۔ پٹھان ایک طرف تو موروثی دشمنیوں میں اتنا اُلجھا ہُوا ہے کہ
ساری عمر انہیں چکاتے چکاتے ہی ختم ہو جاتا ہے اور انہیں ورثے میں
آئندہ نسل کو منتقل کر جاتا ہے یا پھر بعض اوقات اِن سے تنگ آ کر کبھی
کاروبار اور کبھی ملازمت کے سلسلے میں اپنے اِن آسیب زدہ علاقوں سے
بہت دور نکل جاتا ہے ۔ اپنے علاقے کے اندر وہ ہر وقت رزم و پیکار
اور اِنتقام کی گرفت میں رہتا ہے لیکن کبھی کبھی چند لمحاتِ دزدیدہ میں وہ بزمِ
رقص و موسیقی بھی برپا کرتا ہے، ڈھول، سرنا اور رباب کی سُروں پر بھی
سر دُھنتا ہے اور بے حد مقیّد ماحول میں آدم اور دُرخانئی کے اثر انگیز اور
روح افزا رُومان کو بھی جنم دیتا ہے (چھتیسواں باب) ۔ وہ جہاں بہت
سے فیصلے تلوار کے زور سے کرتا ہے وہاں شعرِ گداز سے بھی متاثر ہوتا
ہے ۔ رحمٰن بابا ہو یا خوشحال خان خٹک، وہ سب اسی کی فطرتِ بے تاب
اور امکانیتِ بے پناہ کے مظاہر ہیں اور وہ ان آئینوں میں اپنی تصویریں دیکھ
دیکھ کر کبھی اُچھلتا ہے اور کبھی کُڑھتا ہے، کبھی آگ کی طرح بھپر جاتا ہے

اور کبھی برف کی طرح گر جاتا ہے: (سینتیسواں باب)۔

انگریز (اور اہلِ یورپ) ہمیشہ پٹھان کے مذہبی جنون و تعصب کا ڈھنڈورہ پیٹتے رہے ہیں اور اُن کے خیال میں یہ اُس کی توہم آلودگی اور مُلّا پرستی کا نتیجہ ہے۔ لیکن یہ ان کی غلط اندیشی ہے۔ انگریزوں کی آمد اور اُن کے استعمار و اقتدار کو ہندوستان کے کسی بھی طبقے نے پسند نہیں کیا تھا اور ہر ایک نے اپنی اپنی باری پر اُس کی مزاحمت کی تھی، لیکن یہ مزاحمت اکثر و بیشتر اجتماعی نہیں تھی بلکہ چند افراد میں حلول کئے ہوئے تھی۔ اور اُن کے ساتھ ہی یہ ختم ہوتی گئی۔ اس کے برعکس پٹھان علاقے میں نوعیت مختلف رہی۔ یہ علاقہ بے سردار تھا بلکہ زیادہ صحیح طور پر ہر فرد اپنا اپنا سردار تھا اور یہ افراد باہمی رقابتوں اور جنگوں کے باوجود مشترکہ دشمن کے خلاف متحد بھی ہو جاتے تھے لہٰذا فرد من حیث الفرد، قبیلہ من حیث القبیلہ اور اجتماع من حیث الاجتماع انگریزی سامراج کی نمود سے لے کر آخر تک اس کے خلاف صف آرا رہا۔ بہتر اسلحہ، تنظیم، قیادت، مسافات اور وسائل کے باوجود یہ جانباز شمہ بھر نہیں گھبرائے اور بار بار بے پناہ مالی و جانی نقصانات کے باوصف یہ سرفروش ان سے گتھم گتھا ہوتے رہے؛ میرے خیال میں انگریزی سامراج کو جو مسلسل اور مصمم مخالفت پٹھانوں سے برداشت کرنا پڑی وہ سلطنت برطانیہ کی تاریخ میں بے نظیر ہے اور خود انگریز مصنفین کے رشحاتِ قلم سے ہی نمایاں ہو جاتی ہے۔ یہ سخت جانی، یہ سرفروشی، یہ جذبۂ جہاد انگریزوں کے لئے ایک چیستان تھا جسے اُنہوں نے یہ کہہ کر حل کرنے کی کوشش کی کہ ان میں

پیر، ملّا اور سادات مقتدر تھے لیکن وہ اِس جوشِ عناد میں یہ بھول گئے کہ یہ بھی خود بھی پٹھان تھے، وہ پٹھان جن کا فلسفۂ حیات نظیریؔ نیشاپوری کے اِس مصرع میں نہایت جامع اور دلکش انداز میں بند ہے ؎

کسے کُشتہ نہ شُد از قبیلۂ ما نیست

اور یہ نظریہ فلسفۂ اِسلام سے عین ہم آہنگ ہے۔" یہ لوگ مقتدر رہی محض اِس لئے تھے کہ وہ اِس نظریئے سے سرشار بلکہ خود بھی اسی کی پیداوار تھے وہ جو کچھ کہہ رہے تھے اِسلام کے عین مطابق تھا، پٹھانیت کے عین مطابق تھا؛ لہٰذا اصل چیز یہی نظریہ تھا، یہی جذبۂ آزادی تھا، یہی ذوقِ شہادت تھا، یہی پٹھانیت تھی؛ ملّا اور پیر ہوتے یا نہ ہوتے، پٹھان کو تو انگریزی سامراج سے ٹکرانا تھا، ہر سامراج سے ٹکرانا تھا۔ ہار اور جیت کا سوال نہ تھا، فتح و شکست کا مسئلہ نہ تھا، قیادت کا بکھیڑا نہ تھا، اسلحہ کا تردّد نہ تھا؛ جب نظریئے کی آزمائش ہو تو ہر فرد مجاہد تھا، قائد تھا، ہراول تھا، عقب تھا، میمنہ تھا، میسرہ تھا؛ اور انگریز کیا، کوئی بھی سطح بین شخص اِس راز کو نہ پا سکے گا اور ٹامک ٹوئیاں مارتا ہُوا اِس قافلۂ سرشار کو کبھی مُلّا کا پیرو اور کبھی پیر کا مقلّد بتادے گا؛

رہی بلوچوں کی بات جن کا آلیور نے تھوڑا سا ذکر کیا لیکن کم و بیش ان کا لب لباب بیان کردیا۔ بلوچ بھی پٹھانوں سے کم بہادر یا جیدار نہیں اور انگریزوں نے بھی بار بار اِن کے ذوقِ وغا کا اعتراف کیا لیکن پھر بھی انگریز سامراجی (حکمران ہو یا سیاست کار) اِن سے پٹھانوں کی طرح الرجک نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ بلوچوں کی قبائلی تنظیم اور پٹھانوں کی قبائلی تنظیم میں بنیادی فرق ہے۔ پٹھان

معاشرہ فرد کے گرد گھومتا ہے۔ وہی اُس کا کرتا دھرتا ہے، وہی اُس کا جرگہ ہے، وہی اُس کا پرزۂ فکر و عمل ہے، وہی سربراہِ خاندان ہے، وہی سفید ریش ہے، وہی مجرم ہے اور وہی منصف ؛ لیکن بلوچ معاشرے کا محور سردار ہے اور وہی افراد کے لیل و نہار، این و آں، فکر و عمل اور زندگی اور موت پر حاوی ہے لہٰذا سامراجی نقطۂ نظر سے پٹھان معاشرہ اپنے آخری متحارب فرد تک نبرد آزما رہتا ہے لیکن بلوچ معاشرہ یکساں طور پر مزاحم ہونے کے باوجود اُسی وقت تک کارگر ہے جب تک سردار ہار نہیں جاتا یا رام نہیں ہو جاتا ؛ سامراج کو یہاں پوری افرادی طاقت کا سامنا نہیں بلکہ صرف سردار کا سامنا ہے اور اگر سامراج بزوریا بزریا بلطائف الحیل سردار کو قابو کر لے تو مزاحمت ختم ہو جاتی ہے اور قبیلہ من حیث القبیلہ اور فرد من حیث الفرد مزاحم نہیں رہتا ؛ اگر اِس نظام کے کُل پرزوں کو بغور دیکھا جائے تو اِس کے بلوچوں کو بہت سے فوائد بھی ہیں۔ مثلاً بالائی حکومتیں خواہ کتنی بھی بدلتی رہیں سردار قانون، امن و امان، رسم و رواج اور آبائی دستور کی علامت کے طور پر موجود رہتا ہے لہٰذا افرادِ معاشرہ اپنے اپنے کام میں لگے رہتے ہیں ؛ انتقام جوئی بلوچوں میں بھی بہت راسخ ہے لیکن اسی وقت تک جب تک سردار مداخلت نہ کرے اور جب سردار فیصلہ کر دے تو اُبھرے ہوئے فتنے بیٹھ جاتے ہیں اور طرفین اسے قبول کر لیتے ہیں۔ اگر دو قبائل میں شکر رنجی ہو تو دونو متعلقہ سرداروں یا جرگہ کا فیصلہ قابلِ احترام ہو جاتا ہے۔ لہٰذا انگریزی سامراج کے لئے چند سرداروں کو قابو کرنا آسان تھا لیکن لاکھوں افراد کو رام کرنا سخت دشوار تھا۔ یہ بات ضرور

ہے کہ پٹھان میں شدّت و حدت بہت زیادہ ہے جو اُس کے فکر و عمل میں بھی منعکس ہوتی ہے لیکن بلوچ عموماً اعتدال پسند ہے جسے بعض مبصّرین کاہلی و تن آسانی سے تعبیر کرتے ہیں اور بعض سردار پرستی سے۔ لیکن اِس کا یہ مطلب نہیں کہ بلوچ پُرجوش نہیں یا اُسے مذہب اِسلام سے لگاؤ نہیں۔ اِسلام سے اس کی عقیدت اگر پٹھان کی طرح نمایاں نہیں تو اُس سے زیادہ استوار ضرور ہے۔ یوں سمجھیئے کہ مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ میں پٹھان اگر ایک وارفتہ سیلاب کی مانند ہے تو بلوچ اپنی گذرگاہ میں بہنے والی جوئبار ہے! اگر آلیور سے اُس کی لن ترانیاں اور.... تعصّب نمایاں منہا کر دی جائیں تو اُس کی کتاب جغرافیائی، تاریخی اور ثقافتی معلومات کے لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔ لیکن غالباً اُس کا طغرائے امتیاز زیرِ بحث علاقوں کا مکمّل حربیاتی مطالعہ ہے۔ مشکل سے مشکل خطّوں، گھاٹیوں اور وادیوں میں پہنچنے کے راستوں کا بہت خوب جائزہ لیا گیا ہے اور مواصلات کو بہتر بنانے کے ذرائع بھی زیرِ غور لائے گئے ہیں۔ کچھ بھی ہو یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ انگریز مسافیات میں ہم سے بہت آگے تھے اور وہ دور کی کوڑی لاتے تھے۔ جو کچھ انہوں نے دیکھا، پایا، سمجھا، سوچا اور محسوس کیا اور نگاہِ تصوّر سے بھانپا اُس کے کچھ حصّہ کو تو وہ عملی جامہ پہنا سکے اور کچھ بوجوہ زیرِ عمل نہ آسکا لیکن وہ اتنا حقیقت پسندانہ اور اِمکان پرور ہے کہ ہمیں اپنے وسائل سے کام لیتے ہوئے اسے بھی مرئی شکل دینی چاہیئے۔

کافرستان آخر آج بھی کافرستان کیوں ہے؟ یاغستان کے بظاہر مسلمان

قبائل ابھی تک بُت پرست کیوں ہیں اور ان میں غیر انسانی رسمیں کیوں جاری وساری ہیں ؟ مجموعی طور پر یہاں کے باشندے اِتنے غریب و نادار اور جاہل وگنوار کیوں ہیں ؟ اِن علاقوں میں بہ آسانی اور بلا خوف وخطر آج بھی پہنچنا کیوں مشکل ہے ؟ — کیا یہ اہلِ پاکستان کے لئے چیلنج نہیں ہے ؟ یقیناً ہے . تو پھر کیا اِسے مردانہ وار قبول نہیں کرنا چاہیئے ؟

کوئٹہ — انور رُومان

سرحد کے اُس پار
گذشتہ و آئندہ

ہندوستان کی شمال مغربی سرحد کے ساتھ ہمارے سابقہ اور موجودہ تعلقات مسٹر کپلنگ کے دو خاکوں سے بخوبی واضح ہو جاتے ہیں۔ اب تک تو کارواں کا آراستہ و پیراستہ سالار وسط ایشیا کے دُور افتادہ شہروں سے دشوار گذار درّوں اور لق و دق صحراؤں سے گذرتا ہُوا ہندوستان کے تجارتی مراکز میں پہنچتا تھا لیکن وہ دن دور نہیں جب انجن اُس کی جگہ لے گا جو کم رومانوی ہی سہی لیکن اُس سے کہیں زیادہ طاقتور ہے اور پھر آہنی سڑک بن رہی ہے جس کے لئے مسٹر او، کالاعن کے آدمی ہمیں قندھار سے جُدا کرنے والے آخری سلسلۂ کوہ میں چھید کر رہے ہیں۔ اغلب ہے کہ اِس سڑک کے ذریعے کچھ ہی دیر بعد یورپ کو براستہ سمرقند و بخارا جانا ممکن ہو جائے گا۔

پچھلے چند سالوں تک اِس سرحد کے متعلق ہماری پالیسی کو 'تساہل پُرکار' کی اِصطلاح سے ظاہر کیا جاتا تھا لیکن ایک عشرہ سے بھی کم مدّت کے اندر اندر نہ صرف افغانوں کو ان کے حال پر چھوڑنا پڑا بلکہ سائنسی سرحد ایک مذاق بن کر رہ گئی۔ معاہدۂ گنڈمک منسوخ کر دیا گیا، قندھار کو خیرباد کہنا پڑا اور کوئٹہ ریلوے کو بند کرنا پڑا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہم پشین اور سبّی کو بھی جلد

خالی کرنے کا سوچنے لگے۔ سب ماورائے سندھ اضلاع میں پشاور سے لے کر صوبہ سندھ تک (۴۰۰ یا ۵۰۰ میل کے طول میں) اور اہم ترین دروں سمیت ہمارے پینتیس سالہ قبضے کے بعد بھی ایک بھی سڑک کام کی نہ تھی۔ دریائے سندھ پر ہنوز پل نہیں باندھا جاسکا تھا گو ریلوے ضرور پشاور کی طرف رینگتی ہوئی بڑھ رہی تھی لیکن وہ بھی شدید احتجاج کے تحت اور اس گرما گرم بحث کے بعد کہ آیا جرنیلی سڑک کے کنارے کے ساتھ ساتھ چھوٹی پٹڑی ہی کافی نہیں ہوگی؟ ہندوستان اور خود انگلستان میں اُن اہل الرائے کی کمی نہ تھی جو زیادہ جرأت مندانہ پالیسی کے علمبردار تھے لیکن عام رُجحان یہی تھا کہ حالات کو اپنے ہی رُخ پر چلنے دیا جائے اور بحث و تمحیص اسی پر مرکوز تھی کہ جائے کاروائی پر صرف کچھ اسلحہ کا خرچ روا رکھا جائے۔

سرحد کا انتظام و انصرام بجائے خود قدغنوں کے تحت انجام دیا جاتا تھا۔ دربارِ کابل کے ساتھ مذاکرات کلیتہً کمشنر پشاور کے سپرد تھے اور عسکری معاملات پنجاب کے لیفٹننٹ گورنر کی صوابدید پر چھوڑ دیئے جاتے تھے۔ قبائل کے ساتھ تعلقات کا فیصلہ ملحقہ اضلاع کے افسر کرتے تھے جو گوناگوں پابندیوں کی وجہ سے بے دست و پا ہوتے تھے۔ روسی اپنی سرحد سے اس علاقے کا دقیق مطالعہ و معائنہ کرتے تھے جس پر ہمیں تشویش ہوتی تھی لیکن بایں ہمہ ہمارے افسروں کو یہ پردۂ مجاز اٹھانے کی اجازت نہ تھی گویا اس کے پیچھے مقدس ترین حرم سرائے چھپی ہو! بجائے اس کے کہ ہمسایہ لوگوں اور علاقوں کے متعلق معلومات اندوزی کے لئے اُن کی

حوصلہ افزائی کی جائے اُن کی کسی ایسی اکا دکا کوشش کے لئے حوصلہ شکنی کی جاتی تھی بلکہ اِس کی مخالفت تھی اور اِسے مستوجب سزا اور قابلِ تعزیر بنا دیا گیا تھا۔ اِس یک طرفہ رکاوٹ کے چند میل کے اندر اہم درّے اور کافی کشادہ و زرخیز وادیاں تھیں جو ہمارے نقشوں میں خالی جگہوں سے ظاہر کی جاتی تھیں اور ان کے وسائل و امکانات راز ہائے سر بمہر تھے۔ بعض پھکڑباز تو یہاں تک کہہ دیتے تھے کہ "ہماری ناواقفیت کا عالم یہ تھا کہ اگر کوئی دشمن فوج سرحد کے اِتنا قریب آجاتی کہ نشانہ بنا سکتی تو ہمیں اِس کے صحیح ٹھکانے کا بھی پتہ نہ چل سکتا۔ قسمت ہماری یاور تھی ورنہ ہم تو اپنے جوانوں اور حیوانوں کا پیٹ بھی نہ بھر سکتے" یہ نری مجذوب کی بڑ نہ تھی بلکہ تمام ممکنہ اور پیش آئند واقعات و واردات نے ہماری چشم پوشی کی پالیسی پر ایک لطیف طنز تھی۔ جو تھوڑی بہت معلومات حاصل تھیں وہ بھی احکامات کی خلاف ورزی (وہ بھی چپکے چپکے) کرکے دستیاب ہوئی تھیں۔ اب بھی ایسی معدودے چند معلومات نہایت رازدارانہ انداز میں سات پردوں میں رکھی جاتی ہیں اور گو ان کے مشتاق تو بہت ہیں تاہم صرف وہی افسران تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں جنہیں ان کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ "بصیغۂ راز" سرحدی نقشے اور مطبوعات غالباً پشاور کی نسبت پیٹرزبرگ میں زیادہ آسانی سے دستیاب ہیں۔

یہ صورتِ حال جہاں انتظامیہ کے لئے کلنک کا ٹیکہ تھی وہاں ہندوستان کے لئے بھی مہیب ترین خطرے کا موجب اور خود انگلستان کے لئے

معصیت کا پیش خیمہ تھی لہٰذا پچھلے دس سال میں اُس کی اصلاح کے لئے سرتوڑ کوششیں کی گئیں اور اگر اس مقولہ میں کوئی صداقت ہے کہ جنگ کے لئے ظاہری تیاری ہی امن کی بہترین ضمانت ہے تو مزید دس سال کی مساعی کسی بلائے برُرم کو کافی پیچھے دھکیل سکتی ہیں۔ اس ضمن میں سر چارلس ییک گریگر وغیرہم کا بھی ممنونِ احسان رہنا ہوگا (جنہیں اُس وقت ہر اس پسند کہا گیا) جنہوں نے اہلِ وطن کے سامنے مستقلاً حقائق پیش کئے اور ناقابلِ عبور صحراؤں کے مضحکہ خیز نظریات کو اپنے لاجواب دلائل اور اقوال فیصل کی بارود سے اڑادیا۔ ساتھ ہی ساتھ لارڈ ڈفرن اور سر فریڈرک رابرٹس جیسے انسانوں کے بھرپُور تعاون اور دور اندیشی سے یہ اصلاح احوال راسخ ہوگئی۔

کم ازکم ورائے سرحداب مواصلات کو مکمّل نہیں تو قابلِ استعمال ضرور بنایا جارہا ہے۔ ریلوے کراچی سے سیدھی پشاور تک پہنچادی گئی ہے اور دریائے سندھ کو سکھّر اور اٹک کے عظیم الشان پُلوں کے ذریعے پار کرلیا گیا ہے۔ لائن کی دونو انتہاؤں سے ہرنائی اور بولان ریلوے کے ذریعے خواجہ عمران تک براہِ راست رابطہ استوار ہوگیا ہے۔ چند ماہ کے اندر اندر اس سلسلہ میں سُرنگوں کے ذریعے ہماری بیرونی چوکی، چمن کے لئے دوہری پٹڑی بچھ جائے گی جسے فوری ضرورت کے تحت قندھار تک توسیع دی جاسکے گی۔ شیر شاہ کے قریب چناب کے پُل نے ایک ایسی لائن مکمل کر دی ہے جو ڈیرہ غازی خان اور ڈیرہ اسمٰعیل خان کی سرحدی چھاؤنیوں کو راولپنڈی کے فوجی مستقر اور لاہور کے صدر کیمپ سے مربوط کرتی ہے۔

کالاباغ کے مقابل ماڑی کی طرف توسیع زیرِ تعمیر ہے اور ایک سروے کیا جا رہا ہے جو اسے ایک طرف خوشحال گڑھ سے ملا دے گا اور دوسری طرف اٹک پر بڑی لائن سے جوڑ دے گا اور اِس طرح دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ دریائے کابل سے سمندر تک ایک سڑک حاصل ہو جائے گی۔ اِس کے بعد اِسے ایک طرف تو بمبئی، بڑودہ اور متوسط ہند سے ملانا ہوگا اور دوسرے سرے پر براستہ ہزارہ وادئ جہلم اور کشمیر سے، تاکہ آئندہ ابواب میں زیرِ بحث آنے والی پوری سرحد از کراچی تا کشمیر کے کسی بھی مقام پر بوقتِ ضرورت ہندوستانی وسائل کو چشم زدن میں مجتمع کیا جا سکے۔ بنّوں کی مجوزہ لائن (جس کا سروے پہلے ہی ہو چکا ہے) سرحد کی اہم گیریزن کو ریلوے سے مربوط کر دے گی اور دریائے کابل کے راستے کے پاس ڈھاکا میں جو سروے شروع ہونے والا ہے وہ اِس مواصلاتی نظام کے دوسرے بازو کو ژوبلا کی طرف پھیلا دے گا تاکہ قندھار کے قریب تک ہماری توسیع و پیشقدمی کا ساتھ دے سکے۔

ہمارے پاس پنجاب سے قلبِ کشمیر، سرینگر تک ایک چوڑی سڑک ہے جسے بد انتظامی بھی محو نہیں کر سکتی اور ریذیڈنٹ، کرنل نسبت پر پورا وشواس ہے کہ وہ اسے بہت جلد گلگت تک توسیع دے سکے گا۔ پکی اور پُل دار سڑکیں (جو ہر عسکری شعبہ کے لئے کارآمد ہیں) خوشحال گڑھ سے مکمل کر دی گئی ہیں از کوہاٹ تا بنّوں، از ڈیرہ اسمٰعیل خان تا بنّوں، از ڈیرہ غازی خان تا پشین اور اُمید ہے کہ کرنل سنڈیمن کے محسود وزیریوں کے ساتھ حالیہ کامیاب

مذاکرات غالباً جلد ہی ایک ایسی سڑک پر منتج ہوں گے جو گومل اور ژوب سے گذرے گی۔

موقعہ شناسی اور ثابت قدمی کی بدولت بلوچستان میں ایسی حیثیت حاصل ہو گئی ہے جو ایک طرف قبائل میں مقبول اور اُن کے لئے نفع رساں ہے تو دوسری طرف ہمارے لئے سیاسی اور انتظامی لحاظ سے بے حد مفید ہے۔ بلوچ علاقے کا ایک بڑا حصّہ بلا کشت وخون ، بلا رقابت اور بلا کینہ و بُغض باقاعدہ حکومت کے زیرِ سایہ آگیا ہے اور سلطنتِ ہند کا اٹوٹ انگ بن گیا ہے اور صرف چند سال پہلے تک بین القبائلی جنگ و جدل میں مسلسل مشغول رہنے والے لوگ اب تاجِ برطانیہ کے بہترین وفاداروں میں شمار ہونے لگے ہیں۔ اسی طرح خیبر کے بے باک و بے خوف ترین وحشی آفریدیوں کو رام کرکے دنیا کے بہترین بے قاعدہ فوجی بنا دیا گیا ہے۔ انہوں نے حالیہ کوہ سیاہ کی مہم میں اپنے کمانڈنٹ میجر اسلم خان کی سرکردگی میں جس جیداری وجاں سپاری کا ثبوت دیا وہ بمصداق مشتے نمونہ از خروارے اس بے پناہ قوتِ جدال وقتال کی تمہید ہے جو ہنوز منتظرِ شہود ہے اور بوقتِ ضرورت ہمیں یہاں سے فراواں فراواں مل سکتی ہے۔

فرنٹیر فورس براہِ راست سپہ سالار کے تحت کردی گئی ہے اور یوں وہ بے ضابطگی دور ہو گئی ہے جس کے مطابق ایک بریگیڈ کی کمان ایک غیر فوجی گورنر کے ماتحت ہوتی تھی اور اس طرح ملک کی عسکری تنظیم سے متصادم رہتی تھی۔ اس فوج کے حصّہ کی حیثیت سے جو ایک طرف پشاور

کو اپنے دامنِ حفاظت میں لئے ہوئے ہے اور دوسری طرف کوئٹہ کو، میدانِ تمیز و تخصیص وسیع تر، تجربات و مفادات بسیط تر اور انتظام و انصرام بہر لحاظ سے اکمل تر ہونا چاہیئے۔ اِس پر مستزاد یہ کہ (سخت جان و دیر میر) نظامِ کہنہ، نظامِ اجتناب و گریز اب خوار و زبوں ہے۔ سرحد پار کرنے اور اُس کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے انضباطی احکامات نرم کر دیئے گئے ہیں گو اب بھی افسروں کو اجازت لینا پڑتی ہے جو مخصوص حالات میں ہی دی جاتی ہے اور اگر مخالفانہ قبائلی ردِ عمل کا شائبہ بھی ہو تو نہیں دی جاتی تاہم یہ بھی سرحدی پالیسی کے ایک معقول نظریہ کی طرف مراجعت کا مظہر ہے۔
اِس میں تو کوئی اختلاف کی گنجائش ہی نہیں کہ سرحد پار علاقے اور وہاں کے لوگوں کے متعلق سب کچھ جاننا انتہائی سود مند ہے تاکہ اُن کے مزاج، خصائص، طرزِ عمل اور صلاحیتوں کو سمجھا جا سکے۔ خواہ ہم اپنا دفاعی خط جیحوں پر ہرات کو بنائیں یا اُس سے مختصر، محفوظ تر اور زیادہ قدرتی جگہ پر کابل اور قندھار کے درمیان جس کے دونو بازوؤں پر ریلوے ہو، خواہ ہم اسے دروں کے بالمقابل رکھیں یا ان کے عقب میں اور سرحد کے آزاد خرام جنگ آزماؤں کا رُخ دشمن کی طرف ہو یا ہماری طرف، اور خواہ ہم ڈلہوزی کے حرکت پذیر سُرخ خط کی مشکوک کہانی کی طرح اُس کا سہل طریقہ یہی سمجھیں کہ اسے ٹھیٹ ماسکوی (روسی) انداز میں ایک پنسل سے دوبارہ کھینچ دیں جس کے دوسرے سرے پر ربڑ بھی لگی ہوئی ہو، بہرکیف اِس کا قطعاً کوئی جواز نہیں ہے کہ ہم ایسے معاملات میں بدھو ہی رہیں۔ ایسی صورتِ حال (جو ہمارے

افسروں کو ان علاقوں میں بھی قدم نہیں رکھنے دیتی جہاں سے اُن کے خیمے زیرِ اثر (جو اُن کی زد میں ہیں) دنیا کی کوئی اور عظیم طاقت برداشت نہیں کر سکتی۔ اگر خوانینِ مقدّمین ہمارے مخالف نہیں تو آزادانہ ربط وضبط پر کیا اعتراض؟ اور اگر وہ مخالف ہیں تو جتنی جلدی اس مخاصمت کا پتہ چل جائے اتنا ہی بہتر ہے اور ان کو خوش اسلوبی اور خیراندیشی سکھانے کی ضرورت اتنی ہی واضح اور اشد ہو جاتی ہے۔

حالات نے بار بار ہمیں ہماری جغرافیائی عدم واقفیت کا احساس دلایا ہے۔ ۱۸۷۸ء کی جنگِ افغان میں ہماری فوجوں کو ٹھوکریں کھا کھا کر آگے بڑھنا پڑا اور سڑکیں، فرودگاہیں اور پانی خود تلاش کرنے پڑے اور یوں ہر منزل پر بلا ضرورت تاخیر اور صعوبت کا سامنا کرنا پڑا۔ علی مسجد پر ایک جانب سے حملہ اپنا آدھا زور محض اس لئے کھو بیٹھا کہ ہمارے پاس ایک اچھا نقشہ نہ تھا سیدھا حملہ چند گھنٹوں میں اپنا کام کر جاتا بشرطیکہ ہمیں یہ پتہ ہوتا کہ پالنسہ میسرہ کی طرف سے کیسے آسانی سے پلٹا جا سکتا تھا۔ وادیٔ کرم کی مہم میں پیوار کوتل کی ابجد سے بھی ہم واقف نہ تھے لہٰذا حملے میں تعویق سے کام لینا پڑا۔ کوہِ سیاہ کی مہم کے ابتدائی اقدام سے ہی یہ ثابت ہو گیا کہ ہمارے نقشے تو دریائے سندھ کو اس جگہ سے میلوں دور دکھا رہے تھے اور ہم تباہی سے محض اس لئے بچ سکے کہ دشمن حقیر تھا۔ سرحد پار کی چھوٹی چھوٹی مہمات اکثر و بیشتر اس ناواقفیت سے متاثر ہوئی ہیں جس کی وجہ سے متعدد لغزشیں ہوئیں اور کئی جانیں بلا جواز ضائع ہوئیں حالانکہ ہمارے افسر سرحدی چوکی پر اپنے لمحات

فرصت میں معلومات کا ذخیرہ جمع کر سکتے تھے یا کشمیر میں تعطیلات گذارنے
کی بجائے ایک وادئ نامحرم میں شکار کے ساتھ ساتھ قراولی بھی کر سکتے تھے
بشرطیکہ انہیں مزید سہولیات دی جاتیں!

اچھا ہوا کہ اِس نظام میں کچھ تبدیلیاں آئیں بلکہ بہتر ہوتا اگر پچھلے سال
کی تبدیلی زیادہ بنیادی ہوتی! موجودہ خاکے (یعنی اِس کتاب) کی تحریک
بھی ایک تجویز کی مرہونِ منت ہے کہ جتنی معلومات بھی دستیاب ہیں اگر
انہیں ایک جامع اور قابلِ فہم شکل دے دی جائے تو بہت سے ہندوستانی
قاری اِسے بنظرِ استحسان دیکھیں گے اور اسی کے زیرِ اثر لاہور کے ایک
اخبار میں اہم سرحدی قبائل کے متعلق چوبیس مضامین کا ایک سلسلہ منظرِ اشاعت
پر آیا۔ اِن میں سے اوّلین مضمون میں تبدیلی کی ضرورت کا احساس دلایا گیا اور
یہ بھی واضح کیا گیا کہ ہمہ جہتی معلومات کا حصول خدانخواستہ کسی جارحیّت کا مظہر
نہ تھا۔ بقایا ابواب کا لبِ لباب بھی وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی شکل میں سول اینڈ ملٹری گزٹ
اور پائونیر میں بھی چھپتا رہا ہے۔ گو اِن میں مجوزہ پالیسی کی جزوی قبولیت شاید
ان کی دوبارہ اشاعت کا قوی جواز نہ ہو تاہم مصنف کے خیال میں ہندوستانی
معاملات پر روزافزوں توجہ یقیناً اِس کی متقاضی ہے کہ اہم ترین سرحدی
لوگوں کے متعلق مواد چھاپا جائے تو وہ پبلک کے لئے باعثِ دلچسپی ہو سکتا
ہے خواہ وہ ادھورا ہی ہو!

اِتنی طویل سرحد کے ساتھ ساتھ اور اِس کے پار بے شمار قبائل اور
طائفے، درّے اور چوٹیاں، اور وادیاں اور ندیاں ہیں کہ ان کے جغرافیائی

خصائص، نسلیاتی کوائف، اعداد و شمار اور تاریخ کے لئے مقالات، رپورٹوں اور رسائل کے علاوہ آٹھ نو خصوصی گزیٹیر درکار ہوں گے لہٰذا یہاں ان کا صرف عمومی سا تذکرہ ہی ممکن ہو سکے گا اور جہاں بعض قارئین کرام کے مطابق فرق صرف ناموں کا ہی ہے اور جہاں کے لوگ اتنے ہی شعوب و قبائل میں منقسم ہیں جتنی وہاں وادیاں اور گھاٹیاں ہیں وہاں ان میں نہایت لطیف باہمی امتیاز کرنا صبر آزما بھی ہوگا۔ لہٰذا خطِ امتیاز صرف وہیں کھینچا گیا ہے جہاں نمایاں اور بیّن تفاوت تھا اور یہاں بھی کوشش یہی رہی ہے کہ مستور خصائص کی بجائے واضح خد و خال پر ہی توجہ مرکوز رہے۔ جو قاری زیادہ دلچسپی رکھتے ہوں یا زیادہ قطعی معلومات کے متلاشی ہوں انہیں وسیع تر میدانِ مطالعہ میں جانا ہوگا جو اتنا ہی بسیط اور اکثر و بیشتر اتنا ہی خشک ہے جتنا میدانہائے ہندوستان لیکن جو قاری محدود اور تازہ بتازہ، نو بنو مواد کے شائق ہوں ان کے لئے درویش کا یہی برگِ سبز شاید کافی حد تک تسکین بخش ہو۔[1]

---

[1] میں نے مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کیا ہے اور اکثر اقتباس دیئے ہیں: افغانستان، بلوچستان اور شمال مغربی سرحد کے سرکاری گزیٹیر بشرطیکہ مواد 'صیغۂ راز' کا نہ ہو + ڈیرہ غازی، ڈیرہ اسمٰعیل، بنّوں، کوہاٹ، پشاور اور ہزارہ کی بندوبست رپورٹیں + پیگٹ اور میسن کی "شمال مغربی سرحدی قبائل کے خلاف مہمات" + نعمت اللہ کی تاریخِ افاغنہ + پریسٹلی کی 'حیاتِ افغانی' + پلاؤڈن کی کلیدِ افغانی' + بلفنسٹن کی کابل' + بیلیو کی' یوسفزئی اور افغانستان کی نسلیں' +

(باقی اگلے صفحہ پر)

یہ پہاڑ اور ان کے کوہستانی باشندے صد رنگ دلچسپیوں کے حامل ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ مرکزِ دلچسپی دیکھنے والے کی نگاہ کا کرشمہ ہے۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت کی جدید تخلیقات کا مدح سرا، کانگرس کا شورش پسند یا ملاءِ اعلیٰ کا آرزومند، ہر ایک کا اپنا اپنا نکتۂ نگاہ ہو سکتا ہے۔ بہرحال اس پیش رفتہ جماعت کی صفِ اوّل میں کوئی پٹھان یا بلوچ نہیں ملتا۔ ان کے ہاں تو غالباً ایک بھی ایسا گریجویٹ یا شعلہ بیان مقرر نہیں جو ہمہ جہتی تعلیم کا مطالبہ کرتا ہو۔ البتہ وہ اخلاق و اطوارِ فاضلہ کے ضرور خواہاں ہیں۔ نمائندہ کونسلوں کے موضوع پر ان کے نظریات غالباً قبائلی جرگوں تک ہی محدود ہیں۔ سکاٹ کے ایک مشہور سرحدی کی طرح اگرچہ "وہ ڈھول پیٹنے میں تو خوب ہیں" تاہم اُنہیں 'نفیس' کا لقب نہیں جچتا۔ اس کے باوجود اُن میں کچھ ایسی جبلّی چاشنی ہے جو بعض دیگر ہندوستانیوں کی نسبت (اُن کی غوغا آرائی کے باوصف) انگریزوں کا دل زیادہ جیت لیتی ہے۔ سطحی غور و فکر میں بھی ان کے متعلق یہ احساس ضرور رہتا ہے کہ وہ بھی بالآخر انسان ہیں۔

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ ہم نے ان کے رومانوی پہلو تاخت و تاراج، قتل و غارت اور مرگہائے ناگہانی کو اپنے رنگین جذبات کی

(بقیہ حاشیہ)

راورٹی کی 'گلشن روہ' اور 'منتخبات' + ہیوگز کی 'بلوچستان' + ہتو رام کی 'بلوچ نامہ' + برٹن کی 'سندھ' اور بڈلف کی 'ہندوکش کے قبائل' وغیرہ وغیرہ۔

وجہ سے کچھ زیادہ ہی بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے اور بقول الفنسٹن ان کی بہادری کے ایسے راگ الاپے ہیں جو کسی چرواہے کی بانسری سے ہم آہنگ ہیں۔ لیکن یہ لوگ محض شاندار جنگجو حیوان ہی نہیں بلکہ دونو بلا شک و شبہ دلپذیر اور اعلیٰ و ارفع صفات کے بھی مالک ہیں اور یہ مفروضہ کہ ہر بلوچ چور ہوتا ہے اور ہر پٹھان قاتل (ہمارے اصطلاحی معنوں میں) سراسر بے محل اور بے جواز ہے۔ دونو نے صدیوں کے انتشار کے باوجود اپنی آزادی برقرار رکھی ہے اور دونو میں برطانوی کا جذبہ گونجتا ہے کہ

' آزادی کا اِک لمحہ ہے بہتر۔ غلامی کی حیاتِ جاوداں سے '

ان کی اپنی ہی مشہور و مقبول کہاوت ہے کہ "اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن آزادی عینِ زندگی ہے۔" دونو میں ویسی ہی جنگجویانہ جبلت و جرأت ہے جو برطانوی کو ہندوستان لے آئی اور اب اس کے استحکام کا باعث ہے اور جس نے کسی وقت پٹھان قسمت آزما یا اس کے ورثاء کو پنجاب سے اُٹھا کر دکن میں متمکن کر دیا اور انگریز واپس چلے جائیں تو اغلب ہے کہ وہ اسی کی بناء پر دوبارہ مسندِ اقتدار پر براجمان ہو جائے: ہماری رجمنٹوں میں بلوچ سرداروں یا پٹھان سپاہیوں کا اجتماع ایک ایسا منظر ہوتا ہے کہ تعریف و تحسین کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ ایک حالیہ کیمپ میں ایک ٹھیٹ برطانوی افسر نے کہا۔ "بخدا اگر مجھے ایک برطانوی رجمنٹ کی کمان نہ ملتی تو میں کسی پنجاب رجمنٹ کی قیادت کا آرزومند ہوتا؟" رجمنٹ میں پٹھانوں سے زیادہ سکھ تھے لیکن جذبۂ تحسین دونو پر صادق آتا ہے اور یہی ایک سپاہی کی تذلیل د

تشویش کے لئے کافی ہے۔

شاید یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان آزاد قبائل کو براہ راست ہماری حکومت کے تحت لانے کا خیال غیر منطقی ہے اور اُن کی آزادی سلب کرنے کا تاثر دیتا ہے۔ یہ صرف محدود ترین معنوں میں ہی صحیح ہو سکتا ہے۔ بلوچ، خٹک یا یوسفزئی نے اپنی کوئی مردانہ خصلت نہیں کھوئی کیونکہ اس نے لاقانونیت کا تبادلہ مہذب حکومت سے کر لیا۔ وہ آج بھی پہلے کی طرح آزاد ہے، زیادہ خوشحال ہے اور مطمئن ہے بلکہ برطانوی شہری بننے پر فخر محسوس کرتا ہے مان لیا کہ وہ اپنا چھرا یا بندوق اپنے ہمسایوں کے خلاف استعمال کرنے کے حق سے محروم ہو گیا ہے لیکن اب بھی اُسے ایک دشمن کے خلاف استعمال کرنے کے مواقع حاصل ہیں۔ مزید برآں یہ تو صورتِ حال کا تقاضا ہے۔ زُود یا بدیر (اور زود بہر حال بدیر سے بدرجہا بہتر ہے) سرحد کی یہ پٹی لازماً برطانیہ کے زیر اثر آئے گی۔ یہ نظریہ کہ ہم صرف سندھ کے بائیں کنارے پر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں اور دوسری طرف منتقل ہونے والے کسی حملہ آور دشمن کا انتظار کریں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ترک کر دیا گیا ہے خواہ اس کا نتیجہ کچھ بھی ہو۔ اس کی جگہ ایک دوسرے نظریئے نے لے لی ہے کہ دشمن کا سامنا قلعہ کے دروازے کے باہر کیا جائے نہ کہ اسے اندر آنے دیا جائے اور پھر دُو بدُو مقابلہ کیا جائے۔ اس میں کوئی درمیانی راستہ نہیں۔ اسے وسط راہ میں ملنے کا کوئی سوال نہیں اور نہ ہی ایسی جگہ لڑنے کا سوال ہے جہاں دریا عین ہماری پشت پر ہو سوائے اس کے کہ اشد ترین ضرورت ہمیں مجبور کر دے۔

سرحدی درّے شمال میں ہندوستان کے دروازے ہیں اور اُن پر مناسب قابو رکھنے کے لئے ہمیں دو طرف آمد و رفت میں آزاد ہونا ہوگا اور جب یہاں تک تسلیم کر لیا جائے (جو میرے استدلال کا منطقی تسلسل ہے) تو دروں کے باسی قبائل کو ہمارے پختہ اتحادی یا وفادار رعایا ہونا ہوگا اور آخری امکان محفوظ تر ہے۔

یہ خیال کہ اس مشکل پر اِدھر اُدھر قلعے بنا کر اور ان میں اپنے دستے رکھ کر قابو پایا جاسکتا ہے سراسر خام اور ناممکن العمل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس خیال کے پیشکاروں نے ایک نقشہ کو بھی بغور دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی اور اپنی قوتِ تصور کو ان پہاڑیوں اور وادیوں کا مہیب جال سمجھنے کی تکلیف نہیں دی جن کا دفاع مقصود ہے اور نہ ہی اس پہلو پر غور کیا ہے کہ ہم اپنی محدود فوج سے اتنے دستے کس طرح مستقلاً علیحدہ کر سکتے ہیں۔ اگر قلعے اور دستے مطلوب ہیں تو ان کی جگہ دروں کے سامنے ہے نہ کہ ان کے عقب میں بالکل ایسے ہی جیسے برج کی جگہ فصیل کے سامنے ہے نہ کہ اس کے عقب میں۔ اور ان قدرتی فصیلوں اور قلعہ بندیوں میں سرحدی قبائل کو لازماً ان دستوں میں شریک ہونا چاہیئے اور عین ممکن ہے کہ وہ مستقبل میں ان کا اہم ترین حصّہ ثابت ہوں!

لاہور　　　فروری ۱۹۰۹ء

پہلا باب

صوبہ سندھ اور زیریں دریائے سندھ

یہ شمال مغربی سرحد کراچی سے کشمیر تک اور بحیرۂ عرب سے نانگا پربت کے گلیشیروں تک ۱۰۰۰ میل لمبی ہے اور اِس کے پہلے ۲۰۰ میل صوبہ سندھ کی سرحد ہیں۔ یہ ۳۰۰ میل کی لمبائی اگرچہ طبعی حالات کے لحاظ سے پنجاب کے ڈیرہ جات ڈویژن سے کچھ زیادہ مختلف نہیں (فرق اگر ہے تو اِس کے صرف کبھی کبھار بدتر ہونے میں ہے) لیکن یہاں کے سرحدی قبائل ان سے ہماری راہ و رسم، ان کے علاقے سے ہماری واقفیت اور اِس پر اثر انداز ہونے والے حربیاتی حالات ایک بالکل جُداگانہ قسم سے تعلق رکھتے ہیں اندازاً کہا جا سکتا ہے کہ اِس لمبائی اور ضلع ڈیرہ غازی خان کی قریباً ۱۰۰ میل لمبائی میں ہمارے ہمسائے مختلف القبیلہ بلوچ ہیں اور ان سے اوپر سب افغان یا ان کے متعلقین ہیں۔ ان دونو کے باہمی نسلی اختلاف کے علاوہ ان کی قدرتی اور سیاسی تنظیم بھی جُدا جُدا ہے، اور ہمارے ان سے روابط بھی دو مختلف طریقہ ہائے کار پر مبنی ہیں۔ بلوچ میں ہمیں ایسا انسان ملتا ہے جس میں مسلّمہ سرداروں کے تحت اشرافی و استبدادی طرزِ حکومت کا رجحان بہت قوی ہے جبکہ افغان حتمی طور پر جمہوریت پسند ہے اور وہ صرف چھوٹے چھوٹے طائفوں کے چھوٹے

چھوٹے مقدمین کو ہی تسلیم کرتا ہے۔

ایران اور قلات (بلوچ دارالحکومت، میدان سندھ سے پچاس میل سے بھی کم) نے سندھ ہمارا غیر محفوظ ترین مقام ہے کیونکہ ایک حملہ آور فوج اس راستے سے بآسانی ہندوستان پہنچ سکتی ہے لیکن افغانستان یا ہندوکش کے راستے اس کا آنا کافی مشکل ہے لیکن اس کے برعکس یہاں ہماری دفاعی حیثیت بھی بے حد ساز گار ہے۔ کراچی کے صدر کیمپ سے (جو اُس وقت تک حملے سے محفوظ ہے جب تک انگلستان ملکۂ بحر ہے) ہمیں نہ صرف دریائے سندھ کی عظیم شاہراہ میسر ہے بلکہ ریلوں کا جال بھی بچھا ہوا ہے، جو ہندوستان کے کونوں کونوں سے درّوں کے ماورا پہنچتی ہیں اور ہمیں سلسلۂ خواجہ عمران پر ناقابلِ تسخیر حیثیت بخش دیتی ہیں اور قندھار کو بھی ہمارے حملے کی عین زد میں لے آتی ہیں۔ خان قلات کے ساتھ ہمارے دوستانہ انتظامات اور کوئٹہ پر قبضہ نے (جو شمال اور مغرب میں قندھار سے پنجاب آنے والے تمام سیدھے راستوں اور جنوب میں سندھ کو آنے والے تمام درّوں پر حاوی و قادر ہے) اُس سمت سے جارحانہ حملہ کو قریب قریب ناممکن بنا دیا ہے۔ مزید براں سطح مرتفع پشین کافی وسیع ہے اور وہاں ہماری چھاؤنیوں کو کسی وقت بھی توسیع دی جا سکتی ہے۔ آب وہوا اہلِ یورپ کے لئے موزوں ہے اور ہندوستان سے ریلوے کے ذریعے مربوط ہونے کی وجہ سے یہ بہت جلد ہندوستانی فوج میں بھی مقبول ہو جائے گا۔ شاید خان قلات بھی ہمارے وہاں نفوذ کا زیادہ مشتاق نہ تھا جیسے ایران، بخارا وغیرہ روسیوں کو خوش آمدید

کہنے کے اتنے مشتاق نہ تھے لیکن اب وہ سرتاپا ہم سے منسلک ہو گیا ہے اور
بلا شک و شبہ بلوچ ریاست کے مسلمہ سربراہ کی حیثیت میں وہ ہماری پشت پناہی
سے زیادہ مستحکم ہو گیا ہے۔ مسلسل جنگ و جدل اور مکمل نزاع کے بدلے امن و امان
کا دور دورہ ہو گیا ہے۔ بالائی سندھ فرنٹیئر پر چند غیر اہم مری بگٹی چھاپوں کے
سوا، لوگوں نے ہماری حکومت کو تسلیم کر لیا ہے اور جوں جوں ان کی خوشحالی
بڑھے گی (کیونکہ ہماری آمد سے انہیں ٹھوس نقد فائدے ہوئے ہیں) ووں
ووں وہ ہماری آمد کو نعمتِ غیر مترقبہ سمجھیں گے۔ کراچی سے کوئٹہ صرف
۶۰۰ میل اور براستہ بولان ۵۵۰ میل ہے اور خوجک کی سرنگ بہت جلد مکمل
ہو جائے گی۔ سلسلہ کی دوسری طرف سے قندھار تک ریلوے لائن لے
جانے کا سامان تیار ہے اور اس قریباً ستر میل ٹکڑے کی تعمیر کے لئے
اب صرف کراچی سے قندھار یا ہلمند پر کسی موزوں جگہ تک گھنٹوں کے حساب
سے شمار فاصلہ باقی ہے اور یہ گھنٹے بھی اتنے ہی کم کئے جا سکتے ہیں جتنے
بمبئی سے دہلی تک کئے گئے ہیں۔

پورے بلوچستان کی چھان بین کر لی گئی ہے اور کسی حد تک ایرانی سرحد
تک بھی سروے کر لیا گیا ہے۔ قبائل اور غیر معروف راستوں کے متعلق
سر رابرٹ سنڈیمن نے اپنے جنوبی بلوچستان کے مشن کے دوران کافی معلومات
اخذ کر لی ہیں۔ سر آلیور سینٹ جان کے ایرانی سروے کو ہندوستانی سروے
سے مربوط کر دیا گیا ہے گو ابھی نقشوں کے سلسلہ میں مزید کام درکار ہے۔ ہمارے
سرویئر اس سے آگے بڑھ چکے ہیں۔ مری بگٹی کی وحشیانہ پہاڑیاں بلکہ موجودہ

نقشوں کا پورا اسیوستان بتدریج باقاعدہ سروے کے تحت لایا جارہا ہے۔ ضلاع ہرنائی، تھل چوٹیالی اور دوٹاکری ہر جہت سے زیرِ معائنہ لائے جا چکے ہیں اور سیوستان کا "راہ نامہ" بہت جلد اتنا ہی مکمل ہو جائے گا جتنا ہندوستان کے کسی اور حصّہ کا۔

اُن سنگلاخ پہاڑیوں کو عبور کرنے سے پہلے جو سنگلاخ تر بلوچ کو دریائے سندھ کے ڈیلٹا اور زیریں وادی سے جُدا کرتی ہیں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ذرا ٹھہریں اور اپنی ہندوستانی سرحد کے اِس مختصر سے لیکن مغربی ترین اور گرم ترین حصّہ کا عمومی جائزہ لیں۔ یہ ایک گرم تر کا مصر ہے جو بہت سی طبعی و سیاسی مشابہتوں کا مظہر ہے، ایک ایسا ملک جسے ایک دوسرے اور عظیم تر نیل نے تشکیل دیا ہے۔ اِس کا جو حصّہ ڈیلٹا نہیں ہے وہ کسی نہ کسی وقت دریائے سندھ کی گذرگاہ یا کنارہ یا جزیرہ رہا ہے جس کے سیلانی پانی تاریخ و روایات کے مطابق اِس کے طول و عرض میں پھرتے اور پھیلتے رہے ہیں، آگے اور پیچھے، کچھ سے کراچی تک! اِس کا نام ہی سنسکرت کا لفظ ہے بمعنی پانی۔ گاد، ریت اور خشک چٹانوں کے وسیع و بسیط قطعے جن میں کہیں کہیں پرانی کھاڑیوں، آبی گذرگاہوں اور نہروں کے جال کی وجہ سے جنّت نما کاشتہ رقبے ہیں۔ اس کے دیہات و قصبات جن کے مکانات زیادہ تر سکھائی ہوئی اینٹوں سے بنے ہیں یا گھاس پھوس کی جھونپڑیاں ہیں۔ اِس کے پہاڑ چٹیل اور نسبتاً پست گھاٹیوں پر مشتمل ہیں جنہیں مقامی طور پر کیرتھر کہتے ہیں (۷۰۰۰ فٹ تک بلند) ہالا اور پب اِسے مغرب میں بلوچستان سے جُدا کرتے ہیں۔

باقی حصّوں میں ۵۰۰ فٹ اونچی پہاڑی ان کے ہمہ گیر مسطّح پن کو کہیں کہیں توڑتی ہے اور اِس کے پورے طول میں زبردست دریائے سندھ بہہ رہا ہے اور اِس تصویر کا شوخ ترین نقش ہے۔ پنجاب کے پانچوں دریاؤں کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے کوہِ سلیمان، کوہِ سفید اور ہمالیہ کی طویل شاخوں سے برآمد ہونیوالی تمام ندیوں کو جذب کئے ہوئے، ایک گدلے دھارے کی صورت میں ؛ یہ دریا بیک وقت اِس مُلک کا عظیم سیراب کنندہ اور اِس کے تجارتی سامان کی شاہراہ ہے اور مدّتوں اس کے باشندوں کے لئے واحد ذریعۂ آمدورفت رہا ہے ؛

یہ آندھیوں اور جھکڑوں کی سرزمین ہے، انتہائی گرمی اور سردی کا ملک گرمی جس میں مسلسل کئی ہفتوں تک درجۂ حرارت ۱۰۰ سے نیچے نہیں ہوتا اور سردی جس میں یہ اکثر نقطۂ انجماد سے نیچے گر جاتا ہے ؛ اِس میں کم سے کم بارش اور زیادہ سے زیادہ حدّت ہوتی ہے۔ شان و شکوہ کم، حسنِ فطرت کا تنوّع محدود، جہاں عظیم بحرِ شیریں آب بھی ایک سپاٹ بے کیف دریا ہے ! ساحل کے پست، مسطّح اور اکثر مضرِ صحت دلدلی کناروں سے لے کر شکارپور کے دُھندلے (گرد آلود) میدانوں تک (جو خراسان کا دروازہ ہیں) بن، جھنڈ اور باغات بہت خال خال ہیں اور جنگلات کا تو سرے سے وجود ہی نہیں۔ کچھ کھاڑیاں ہیں جو گاہے ماہے چھوٹی چھوٹی جھیلوں کا روپ دھارتی ہیں لیکن یہ دیرآید اور زود میر رچنا جل پریوں اور بنات البحر کے بسیرے ہونے کی بجائے پر ریت ندی کے پانی معلوم ہوتے ہیں اور تھوڑی بہت منظر خیزی اور تصویر آفرینی

زیادہ تر تغیر پذیر روشنی کے شوخ حواشی اور اُس کے مصوّرانہ تاثرات پر منحصر ہے
شور میدانوں پر اُونٹوں، دلدلوں میں بھینسوں اور ہر جگہ سانپوں کے سوا اس میں
حیوانات بہت کم نظر آتے ہیں گو یہ قدرتی طور پر پرندوں اور مچھلیوں سے مالامال
ہے اور اگرچہ یہ ہندوستان پر ہر حملہ آور (یونانی، عرب، مغل، ایرانی، افغان اور
بلوچ) سے رابطے کی وجہ سے ایک کلاسیکی سرزمین ہے تاہم انہوں نے اپنے
پیچھے کوئی یادگاریں یا دستاویزات نہیں چھوڑیں۔ شاید سندھ جیسے علاقے
میں ایسے ورثے کے زندہ رہنے کا سان و امکان نہ تھا؛

لیکن آبادکار قبائل کی صورت میں بہت سے زندہ دستاویزات موجود
ہیں — عرب، افغان، بلوچ اور افریقی بھی جو اکٹھے ہو کر آبادی کا ایک اچھا خاصا
تناسب ہیں۔ خالص سندھی (قدرے مخلوط النسل ہندو) خلفاء کے تحت مشرّف
بہ اسلام ہوا لیکن مشرقی اقوام میں اُس کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ اگر اُس کے
تحقیر کنندگان اُس کی تنقیص میں غلو سے کام لیتے ہیں تو اُس کے مدّاح بھی
اُس کی خوبیوں کو قدرے منفی رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ بے ضرر، مہربان (گو
صاف ستھرا نہیں)، لاتعلق، ایماندار۔ حملوں کے ایک غیر مختتم سلسلہ نے
اُس کا کیا حشر کیا، سرحدی قبائل نے اُسے کس طرح نشانۂ تاخت و تاراج بنایا
اور ہندو ساہوکاروں اور دلالوں نے اُسے کس حد تک لوٹا؛ نتیجہ یہ ہے کہ
اُسے اپنی شیرینئ مزاج اور روشنئ طبع کے اظہار کا کوئی موقع نہ مل سکا! اس
علاقے اور اس کے باشندوں کی مرفہ الحالی انگریزی قبضے سے شروع ہوئی۔
انگریزی حکومت آب و ہوا اور طبعی خصائص کو تو نہ بدل سکی لیکن اس کے

سوا اُس نے سندھ کے لئے سب کچھ کیا۔ دریائے سندھ اور اُس کے معاونین سے نہریں نکال کر ایک ایسا نظامِ آب پاشی وجود میں لایا گیا کہ یہ دریا سندھ کے لئے مصر کا نیل بن گیا۔ دخانی جہازوں کا ایک بیڑہ اور بعد میں قلب سندھ میں پھیلی ہوئی ریلوے (جو سکھر پُل کی تعمیر کے بعد ہندوستان کے ریلوے نظام سے بلا رکاوٹ اور بلا تعطّل رابطہ کا ضامن ہے) نے اسے پنجاب اور شمال مغربی سرحد کی بیشتر تجارت کی شاہراہ بنا دیا ہے۔ ماہی گیروں کا ایک پنڈورہ (جسے تالپور امیروں نے نصف صدی پیشتر میکان سے چھینا) اب سلطنتِ ہند کی صفِ اوّل کی سمندری بندرگاہوں میں شمار ہوتا ہے اور اِس کی وسیع سہولیات، اعلیٰ ترین لنگر گاہ اور اُس کے ترقی پذیر اداروں کی بدولت یہ کہنا مشکل ہے کہ مستقبل کراچی کے لئے کتنے لامحدود امکانات پیش کرتا ہے!

Across the border Baloch and Pathan.

دُوسرا بابؒ

بلوچستان اُور بلوچ

بلوچستان عام اصطلاح میں اس تمام علاقے کو گھیرے ہُوئے ہے جو بحیرہ عرب، افغانستان، سندھ اور ایران کے درمیان ہے۔ ایرانی سرحد مستقلاً متنازعہ فیہ مسئلہ تھی لیکن ۱۸۷۰ء میں سر ایف گولڈ سمڈ کی سرکردگی میں ایک مشترکہ کمیشن نے اس کا فیصلہ کر دیا۔ شمال کی طرف بلوچ صحرا ہے جو قندھار کے سابقہ اضلاع سے پیوستہ ہے لیکن یہ سرحد بھی شمال مشرقی سرحد کی طرح بالکل غیر واضح ہے۔ شاید یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ یہاں اس کی حدبندی مستجار علاقے یا برطانوی بلوچستان کرتے ہیں جن کی شمالی سرحد فی الوقت حکومتِ ہند کے دفترِ خارجہ کے زیرِ غور ہے۔ ان حدود میں سراوان کا پہاڑی صوبہ شامل ہے جس کا دارالحکومت قلات ہے۔ سلسلۂ ہالا کے مغرب میں جھلاوان کا یکساں طور پر پہاڑی صوبہ ہے جس کا سردار بلوچستان کی سردارشاہی میں دوسرے نمبر پر ہے۔ کوہ ہالا اور سندھ کے درمیان مشہور گرم علاقہ کچھی گنداوا ہے جو بادِ سموم کا خطّہ ہے۔ یہ مسطح ترین اور گرم ترین صوبہ ہے لیکن چونکہ سندھ کی دو شوارعِ عام کی گذرگاہ ہے لہٰذا تجارتی لحاظ سے بہت ہی اہم ہے۔ جنوب کی طرف سلسلۂ ہالہ

کی آخری شاخوں اور سمندر کے درمیان لس کی چھوٹی سی مثلث ہے جس کا دارالحکومت بیلا ہے اور جو اپنے موروثی حکمران، جام کے تحت ہے۔ سب سے آخر میں، غیر معلوم، ویران ترین لیکن وسیع ترین علاقہ مکران ہے (قدیم جیدروشیا) جو لس سے سرحدِ ایران تک محیط ہے۔ اس کا مغربی حصّہ کوہستان ہے اور بلوچستان کے سمندری ساحل کا بیشتر حصّہ بھی اسی کے جنوب میں ہے۔

تقریباً اس سارے علاقے کی نمایاں ترین خصوصیات سنگلاخ پہاڑوں اور تنگ وادیوں کے سلسلے میں جو زیادہ تر پٹیلی یا غیر مزروعہ ہیں کیونکہ پانی کی اشد قلت ہے۔ دریا قریباً ناپید ہے اور جو ندیاں ہیں وہ بھی نالوں کی ہم منزلہ ہیں۔ یہ نالے بھی طویل وقفوں کے بعد پُر آب ہوتے ہیں اور ان کا پانی بھی اکثر و بیشتر منبع سے تھوڑے ہی فاصلے پر زمین میں جذب ہو جاتا ہے۔ شمال میں اضلاع نوشکی، چاغی یا سیستان کے بیشتر حصے صحرائے مطلق ہیں۔ میدانوں کے نام ہی اس گھمبیر خلا کے مظہر ہیں جیسے دشتِ بے دولت، دشتِ بیدار (بمعنی بلا درو دیوار) دشت گوران (بمعنی گورخر) اور ریگستان۔ کہاوت ہے کہ یہاں مسافر کے لئے مفید ترین علم آب گاہوں کا جاننا ہے جسے بلوچ شیریں، خوب، خوردنی اور تلخ میں تقسیم کرتے ہیں۔

واقعتاً یا برائے نام، یہ تمام صوبے براہوئی خان قلات کے زیرِ نگیں ہیں اور سردار اسی کو اپنا حاکم اعلیٰ تسلیم کرتے ہیں۔ یہ حاکمیت حقیقی سے زیادہ فرضی ہے اور اس میں شک ہے کہ آیا یہ کبھی کارگر رہی ہے۔ شاید ہی کبھی

خود سر بلوچ سردار خان کے اطاعت گزار رہے ہوں سوائے اُس وقت کے جب برطانوی حکومت نے نہ صرف خان کو تسلیم کیا بلکہ اسے ٹھوس مادی مدد دی۔ دستِ امانت اٹھا لیا گیا تو وہ مہیب نزاج عود کر آیا اور اب بھی اگر برطانوی تسلط ختم کر دیا جائے تو وہی لاقانونیت لوٹ آئے گی۔ خاندان کی پچھلی ایک صدی کی تاریخ زیادہ تر وسیع پیمانے پر کامیاب ڈاکوؤں کی کہانی ہے اور لاقانونی، قتل و غارت اور کشت و خون کا ایک غیر مختتم سلسلہ ہے۔ کیونکہ ایک عام بلوچ بچی چوری کو انتہائی شرمناک سمجھنے کے باوجود کسی علاقے کی لوٹ کھسوٹ کو شریفانہ اور مستحسن ترین کارنامہ سمجھتا ہے۔ سراوان اور جھالاوان کے موروثی سرداروں کے اپنے موروثی علمبردار ہیں جو ان کے سرخ اور زرد پرچموں (اعلام) کو اٹھاتے ہیں اور ہمیشہ خان کے دائیں اور بائیں طرف بیٹھتے ہیں اور قلبِ لشکر کے بھی دائیں اور بائیں چلتے ہیں۔ قومی جھنڈا بھی ترنگا ہے یعنی سُرخ، زرد اور (شاہی) سبز۔ کوئی اہم قدم ان کی مرضی کے بغیر نہیں اٹھایا جا سکتا اور نہ ہی ان کے بڑے بڑے صوبوں پر کوئی ٹیکس عائد کیا جا سکتا ہے البتہ وزیر کو ایسا کرنے کا اختیار ہے جو تو اجیک سے لیا جاتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ تو اجیک ہی زیادہ تر محصول دیتے ہیں اور ان کے بھی قریباً یکساں طور پر موروثی مالی اختیارات ہیں۔ خانی کا مالیہ اتنا ہی ہوتا تھا جتنا خان سرکاری مالیہ لینے کا اہل ہوتا تھا۔ فوجی خدمت جاگیری میقات پر منحصر تھی لیکن قدیم نارمن یا قدیم راجپوت طریقہ سے بھی مختلف تھی کیونکہ لشکری لام پر جاتے تھے تو حکومت ان کی کفیل تھی۔ یہ مسلّمہ اصول تھا لیکن

فوجیوں کی تعداد خان کی مقبولیت یا مقصدِ جنگ پر منحصر تھی۔ کئی سردار جیسے جام لس بیلہ اِس سے مبرّا تھے اور صرف سربراہِ اتحادیہ کو بوقتِ ضرورت جاگیرداری مدد مہیا کرتے تھے۔

براہوی اور بلوچ شجراتِ نسب (جو زیادہ تر خیالیہ ہیں) ایک تاریخی دُھند میں ملفوف ہیں لیکن براہوئی خان نصیر[1] اِس دھندلکے میں نمایاں ترین ہے۔ اُس نے سرداروں کی زبردست اتحادیہ کو متحد کر لیا۔ اس پر قدرے سیادت قائم کر لی اور کسی حد تک ایک اچھی حکومت کی بنا ڈالی۔ لیکن پہلے پہل وہ ایرانی فاتح، نادر شاہ کا نامزد کردہ تھا اور پھر والئی کابل احمد شاہ کا جاگیردار تھا اور ۱۷۵۸ء میں اُس کا اعلانِ آزادی بھی اُسے اُس شکنجہ سے پوری طرح نہ چھڑا سکا۔ اُس کا چالیس سالہ دورِ حکومت (۱۷۵۵ تا ۱۷۹۵) بقول ایک ممتاز مورخ بلوچستان کا سنہری زمانہ تھا لیکن اُس وقت بھی 'حکمران' سردار شاہی اور رعایا کے مختلف اور مخصوص حقوق کی وضاحت یا نشاندہی مشکل تھی۔ سر کیہ دمہ اُسے ایک 'سپاہی، مدبر اور حکمران کی حیثیت سے ممتاز ترین بلوچ گردانتا ہے جس نے اپنی زوردار حکومت میں صفاتِ نادرہ پیدا کر دی تھیں۔ اُس نے بغاوت دبائی، تجارت کی حوصلہ افزائی کی، فاتحانہ جنگیں لڑیں اور وسیع باغات لگوائے۔ اُس کا عدل و انصاف آج بھی زبان زدِ خاص و عام ہے اور اُس نے نہایت دانشمندی سے سرداروں کے دائرہ

---

[1] مصنف نے نصر لکھا ہے' دو تین دفعہ جو غلط ہے۔ صحیح نصیر ہے (مترجم)

کار و اختیار میں کم سے کم مداخلت کی لیکن جب وہ جاہ و جلال کا تاج پہنے ہوئے عالمِ ضعیفی میں فوت ہوا تو سلطنت جلد ہی لاقانونی کی دلدل میں پھنس گئی۔ صوبوں اور ضلعوں کے حاکم اطاعت سے منحرف ہو گئے، ملک میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھی اور خان قلات کا دبدبہ و طنطنہ اتنی تیزی سے زائل ہو گیا جتنی تیزی سے نصیر اسے قائم نہ کر سکا تھا۔ جب انگریز ۱۸۳۹ء میں بولان کے راستے افغانستان گئے تو خان صرف نام کا خطرناک تھا اور اصل میں نسبتاً غیر اہم تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ جنرل ولشائر نے صرف ایک ہزار آدمیوں کی جمعیت کے ساتھ قلات پر چند منٹ میں قبضہ کر لیا۔ جب ۱۸۴۱ء کے آؤٹرم معاہدہ کے تحت نصیر دوئم کو تسلیم کیا گیا تو وہ اپنے آپ کو کابل کا باجگزار کہتا تھا ۱۸۴۳ء میں سر چارلس نیپئر کی فتح سندھ سے لے کر ۱۸۵۴ء میں میجر جیکب کے قلات سے نظرِ ثانی شدہ معاہدہ تک خان ایک دسیسہ کار وزیر کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا اور قبائل اپنی مرضی سے چہار دانگ عالم میں لوٹ مچاتے پھر رہے تھے۔ سرحد پر اکثر حملے ہوتے رہتے تھے اور جان و مال ہر جگہ غیر محفوظ تھے۔ جیکب کے معاہدہ اور اُس کے زبردست ضبط سے حیرت انگیز خوشحالی کا ایک مختصر دور آیا لیکن جلد ہی معاہدہ کی خلاف ورزی ہوئی اور بدامنی دوبارہ شروع ہو گئی۔ کہا جاتا ہے کہ نصیر دوئم کو زہر دیا گیا اور موجودہ خان، میر خداداد (جو ہنوز ایک لڑکا تھا) کو مسند نشین کیا گیا لیکن ایک غاصب نے اُسے نکال باہر کیا گو وہ خود بھی نذرِ شمشیر ہوا۔ لس کا جام اور وڈھ (جھلاوان) کا سردار مستقلاً باغی تھے اور اہلِ کیچ (مکران) نے اطاعت کا

جوا اتار پھینکا تھا - مری اور بگٹی آئے دن جدال و قتال کرتے تھے - غرضیکہ لاقانونیت یہاں تک بڑھی کہ برطانوی حکومت کو پھر مداخلت کرنا پڑی جس کی استدعا خان نے بھی کی اور اس کی رعایا نے بھی تاکہ قبائل اپنے آپ کو اور ملک کو پاش پاش کرنے سے باز رکھے جا سکیں ؛

۱۸۷۶ء میں کچھ اضافوں کے ساتھ ۱۸۵۴ء کے معاہدہ کی تجدید کی گئی جس کی رُو سے خان کو برطانوی حکومت سے ٹھوس امداد ملنے لگی - اس میں ایک لاکھ روپیہ سالانہ نقد امداد بھی شامل تھی - وہ کسی اور غیر ملکی طاقت سے رابطہ نہ رکھ سکتا تھا اور حکومت ہند اپنی صوابدید کے مطابق اس کے علاقے کے کسی حصے میں اپنا لشکر متعین کر سکتی تھی - اس وقت سے تعلقات گہرے ہو گئے ہیں - ہماری (برطانوی) حکومت نے حاکم اعلیٰ کی ذمہ داری سنبھال لی ہے ، سرداروں کے دیرینہ اختلافات ختم کر دیئے گئے ہیں اور خان کی حیثیت ایک زبردست اتحادیہ کے سربراہ اور بلوچستان کے حکمران کے طور پر قائم کر دی گئی ہے - بعض اضلاع مشمولہ بہ وادئ کرّم ہماری فوجوں کے دائمی قبضے میں دے دیئے گئے ہیں اور معاہدۂ گنڈمک کی رُو سے تھل چوٹیالی ، سبی اور پشین کے تمام افغان حقوق (اصلی یا فرضی) اس وادی کو میدان قندھار سے جدا کرنے والی پہاڑی رکاوٹ تک ہمیں منتقل کر دیئے گئے ہیں اور اب یہ علاقے برطانوی نظم و نسق کے تحت لے لیے گئے ہیں - خط سرحدی اصل میں سلسلۂ خواجہ عمران تک بڑھا دیا گیا ہے -

جن قبائل نے اس علاقے کو اپنا نام دیا ہے وہ نہ آبادی کا جزوِ اعظم

ہیں نہ طاقتور ترین ہیں۔ موجودہ حکمران اپنی نسل کو براہوئی بتاتے ہیں اور قدرے
مشکوک سند پر دیرینہ آبادکاری اور ایک جداگانہ ماخذ کا دعویٰ رکھتے ہیں لیکن
علاقے کا نام براہوستان کی بجائے مسلمہ طور پر بلوچستان ہے جسے
براہوئی بھی تسلیم کرتے ہیں اور باشندے بلوچ ہی کہلاتے ہیں۔ بلوچ یا
ان کے پارے پوری سرحد کے ساتھ ساتھ شمال میں ڈیرہ اسماعیل خان کے
آغاز تک آباد ہیں اور وہ ہمارے ہمسایوں میں خوش طبع ترین لوگ ہیں۔
بنیادی طور پر ایک خانہ بدوش، خوش وضع، بے تکلف، واضح ناک نقشہ
کا مالک، سیاہ اور روغن میں تر لہراتے ہوئے بالوں اور داڑھی والا، ایک
لمبے چغے میں ملبوس جو اصلاً سفید ہوتا ہے (اور صرف دربار میں جانے
کے نادر و نایاب موقع پر ہی دھویا جاتا ہے) — بلوچ ہر ایک کا
دلپسند ہے۔ وہ قدرے چھیل چھبیلا ہے اور جب وہ ذرا سخت اور زرد
ہو جائے تو اپنے بالوں کو خضاب لگاتا ہے۔ بڑے بوڑھے عموماً اپنے
ابروؤں کو گہرا سیاہ رکھتے ہیں اور ان کی داڑھیوں کے سرے بتدریج
ارغوانی نما سُرخ ہوتے ہیں گو ان کی جڑیں خالص سفید ہوتی ہیں۔ ان کی مستورات
بناؤ سنگار کرتی ہیں اور اپنے بالوں کو کاکلوں کی صورت میں گوندھتی ہیں لیکن
دونو اصناف کے نزدیک صابن اور پانی کا استعمال بدترین زنانہ پن کا نشان
سمجھا جاتا ہے۔ وہ پٹھان کے ساتھ بہت سے محاسن و معائب میں شریک
ہے جو ایک وحشی اور نیم مہذّب قوم میں ہوتے ہیں لیکن اکثر و بیشتر وہ
خوشگوار ترین تضاد کا مظہر ہے۔ دونو مہمان نواز ہیں، دونو آنکھ کے بدلے

آنکھ اور جان کے بدلے جان' کے قائل ہیں لیکن بلوچ اپنے دشمن پر سامنے سے حملہ کرنا پسند کرتا ہے اور پٹھان پیچھے سے۔ دونو "اللہ اکبر اور محمد رسول اللہ" پر اعتقاد رکھتے ہیں لیکن پٹھان اکثر ایک خطرناک جنونی ہوتا ہے جبکہ بلوچ نماز میں بھی کسی دوسرے کو وکیل بنالیتا ہے۔ ایٹسن کی پُر معنی زبان میں اُس کے دماغ میں خدا کم اور اُس کی فطرت میں شیطان کم ہے۔" ایک بلوچ کی کہانی بیان کی جاتی ہے کہ جب اُسے پوچھا گیا کہ وہ روزے کیوں نہیں رکھتا تو اُس نے جواب دیا کہ اُسے معاف تھے کیونکہ سردار اُس کے لئے روزے رکھ رہا تھا۔ ایک اور بلوچ نے ایک پارسا مسلمان (جو میدانوں میں نمازِ مغرب ادا کر رہا تھا) سے پوچھا۔ "تم کیا کر رہے ہو؟" میدانی نے جواب دیا۔ "خدا کے ڈر سے نماز پڑھ رہا ہوں"۔ بلوچ نے فوراً جواب دیا۔ "میری پہاڑیوں میں آجاؤ جہاں ہم کسی سے نہیں ڈرتے۔" دونو کا نظریہ "میرے اور تیرے" کی تمیز میں بہت دھندلا ہے اور وہ پرانے' سیدھے سادے اصول کو ترجیح دیتے ہیں یعنی "وہی لے گا جو صاحب قوت ہے اور وہی رکھے گا جو صاحب مقدور ہے"۔

ایک بلوچ کہاوت ہے کہ "خدا اُس پر کبھی مہربان نہ ہوگا جو چوری نہیں کرتا اور ڈاکہ نہیں مارتا۔" اور واقعی وہ کام کرنا زیادہ پسند نہیں کرتا لیکن روپوں کا بہت حریص ہے؛ جو کچھ وہ کرتا ہے وہ پہلے پوچھتا ہے کہ اُس کا حق کیا ہوگا؟ دونو انگریزوں کی طرح گھوڑوں اور ان کے لوازمات کے شوقین ہیں۔ 'ڈینڈی ڈِک' میں ڈین کی ہمشیرہ کی مانند، جو بلوچ سالم گھوڑی نہیں رکھ سکتا وہ حسب استطاعت اُس کی ٹانگیں خرید لے گا اور ہر خریدی ہوئی ٹانگ کے

بدلے وہ گھوڑی کو ایک سہ ماہی تک چلائے گا۔ دونو کی سیاسی تنظیم
قبائلی ہے لیکن پٹھان فطرتاً انتہا پسند ہے اور ہر آدمی اپنے ہمسائے کے
برابر بلکہ اس سے بہتر ہے اور وہ کسی کا حکم نہیں مانتا سوائے جرگہ کے اور وہ بھی
ہمیشہ نہیں (یعنی اس کا حق اطاعت محفوظ ہے) جبکہ بلوچ اپنے سردار کا
سچا وفادار ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ حکومت ایک بلوچ تمندار سے ایسے ہی
بلا خوف و خطر کاروباری تعلق رکھ سکتی ہے جیسے ایک محدود الاختیار بادشاہ
سے اور صرف اسی حقیقت نے بلوچستانی سرحدوں پر ہمارے تمام
انتظامات کو عملاً آسان بنا دیا ہے۔

ظاہر ہے جاہل ہے۔

بہت سے شعوب و قبائل کے پاروں کا تفصیلی ذکر صبر آزما ہوگا۔
لیکن اکثر کے خصائص ایک جیسے ہیں اور وہ انہیں فرماں بردار رعایا اور قابل قدر
باجگزار بنا دیتے ہیں۔ وہ جسمانی لحاظ سے طاقت ور، سخت جان، بے خوف
اور دلیر ہیں، فطرتاً جنگجو، کشادہ اطوار اور عموماً راست گو اور قابل اعتماد ہیں۔
انہیں نسلیاتی اور دیگر لحاظ سے بہت سے مصنفین نے اکثر اور کلیتہً بیان کیا
ہے کہ مزید تفصیل غیر ضروری ہوگی۔ امدادی فوج کے طور پر ان کی افادیت
میں اختلاف کی گنجائش ہی نہیں۔ سر چارلس میک گریگر آنجہانی انہیں خوب
جانتا پہچانتا تھا اور وہ ان کی بہت قدر و منزلت کرتا تھا۔ وہ ان کے متعلق
لکھتا ہے: "سخت جان، جنگجو نسل جن کا طریقہ جنگ مخصوص اور پٹھان
ہمسایوں کے طریقہ سے زیادہ خطرناک ہے۔ بلوچ اترتا ہے، اپنی
گھوڑی باندھتا ہے اور پھر تلوار اور ڈھال لئے ہوئے گھمسان کی جنگ

میں داخل ہوتا ہے۔ پٹھان فاصلے سے اپنی توڑے دار بندوق چلاتا ہے بلکہ چھپ کر اور شاذونادر ہی اپنے حریف کے رُوبرو ہوتا ہے۔ ان کی ہمت سخت ترقسم کی ہے جو ہمارے خلاف معرکوں میں اتنی ظاہر نہیں ہوتی (گو مجموعی طور پر وہ افغانوں کی نسبت ہمارے خلاف بہتر طور پر لڑے ہیں) جتنی قبائلی جنگ وجدل اور ہمارے علاقے میں بے باک چھاپے میں ہوتی ہے افغان اپنے ہمسائے سے برسرپیکار ہو تو وہ ایک مینار میں چڑھ جاتا ہے یا چٹان کے پیچھے دُبک جاتا ہے اور گھات میں رہتا ہے حتےٰ کہ وہ اسے نہایت بیدردی سے قتل کر دیتا ہے۔

بلوچ اپنے قبیلے کے شوریدہ سر اکھٹے کرتا ہے اور دشمن پر بڑی تعداد میں حملہ کرتا ہے۔ ... ، بگٹیوں کی مصمم بہادری (جنہوں نے میرڈیدر کے رسالہ کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے گو سلامتی ناممکن تھی تاہم وہ دوتہائی سے زیادہ گولیاں کھا کر مرے) تاریخ کا ایک قرطاس زریں ہے۔ اگرچہ نسلی لحاظ سے وہ غریب ہیں اور بمشکل گذر اوقات کرتے ہیں پھر بھی وہ مستقل نوکری نہیں کرتے کیونکہ وہ نہ وردی پہن سکتے ہیں نہ ضبط میں رہ سکتے ہیں بلکہ ضبط سے گریزاں ہیں۔ ہماری ملازمت پر اُن کے اعتراضات مندرجہ ذیل ہیں: اُنہیں ڈر ہے کہ اُن کے بال کٹ جائیں گے، اُنہیں صرف سفید یا گدلے سفید کپڑے پسند ہیں اور وہ اپنے گھروں سے باہر نکلنا نہیں چاہتے۔ یہ صرف بلوچوں کا ہی نہیں بلکہ ابتداء میں سب وحشی نسلوں کا حال ہوتا ہے۔ اُنہیں احتیاط سے رام کیا جا سکتا ہے اور پھر وہ

سب کچھ پہن لیں گے، کہیں بھی چلے جائیں گے اور ہر کام کر لیں گے۔" معمولی ترین موقعہ شناسی سے ہمیں بہترین افرادی طاقت مل سکتی ہے جو بالخصوص بے قاعدہ رسالہ کے لئے نہایت موزوں ہوگی۔ وہ پیدائشی شاہ سوار ہیں، کرڑیل اور پائدار گھوڑوں کی نسل پالتے ہیں۔ خود بھی ویسے ہی کرڑیل اور ثابت قدم ہیں اور اِس پر مستزاد یہ کہ نسلہا نسل سے ان کی آزادی نے ان میں ایک روح پھونک دی ہے!

آپ بعور اپنی استالی تنگے (اہری) کے باوجود
سچ کہنے پر کیوں مجبور رہے؟

تیسرا باب
بلوچ تاریخ کے تبرکات

اکثر سرحدی لوگوں کے مقابلے پر بلوچوں کے یہاں مستند تاریخ کا قریباً فقدان ہے۔ وہ کہاں سے آئے، اُن کا راستہ کونسا تھا، ان کے مورث کون تھے ۔۔ اِس قبیل کے سوالات آج بھی معرضِ قیاس میں ہیں۔ وہ تحریری حروفِ تہجی سے محروم ہیں لہٰذا اُن کا کوئی ادب نہیں۔ جنگ و جدل ایک معزز کا فرضِ اوّلیں ہے اور ہر بلوچ ایک معزز ہے۔ کاشت کاری قابلِ نفرت ہے اور فنون بنظرِ تحقیر دیکھے جاتے ہیں اور فنِ تحریر کو تو تحقیر کے قابل بھی نہیں سمجھا جاتا۔ 'مارمیئن' میں ڈگلس اپنے مرشد کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ "میرا بیٹا گاوِن کے سوا ایک لفظ بھی نہ لکھ سکتا تھا" اور بلوچ کا رویہ من و عن یہی ہے۔ قبائلی یا قومی روایت صرف شعروں اور منظوم قصّوں کی صورت میں ملی ہے (اور وہ ان پر جان دیتے ہیں) جن میں سے کافی غالباً بہت دیرینہ ہیں۔

"خوش گلو، نغمہ نواز مطرب! آؤ، اپنا ستار لاؤ
اپنے سر پر بھاری بھرکم پگڑی باندھو
اور مردِ ہنر کی طرح اہلِ دل سے تحفے اور بدھائیاں وصول کرو؛
"شیریں نغمہ نواز ریحان! طرب افشاں ستار یہاں لاؤ۔

میری زندگی میں نسیم سحری کی تازگی لاؤ
اپنے ستار کو خوب زور سے بجاؤ
اور اِس روشن جسم و جاں سے تفکرات بھگاؤ"

اور دیگر التجائیں ڈیمز[1] نے نہایت عرق ریزی سے اکٹھی کر کے اُن کے بہت خوبصورت تراجم کئے ہیں جو بلا تغیّر و تبدّل سر والٹر سکاٹ کے منتخبات میں موتیوں کی طرح شامل ہو سکتے ہیں۔ اکثر مسلمان قبائل کی طرح بلوچ روات بھی عرب کو ہی اُن کا وطنِ مالوف قرار دیتی ہے۔ ایک مقبول کہانی لفظ بلوچ کو بچ (= بچہ) + لُچ (= محمد بن ہارون کے حرم کی ایک لونڈی) سے ماخوذ بتاتی ہے۔ رالنسن کے مطابق یہ بیلوس سے ماخوذ ہے جسے کتاب اللہ کے نمرود ابن کُش سے پہچانا گیا ہے۔ ایرانی بلوشؔ اور کوشؔ و بلوشؔ کو چند خانہ بدوش قبائل کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ذاتی طور پر وہ اِسے "بدلوگ" (بُرے، قانون شکن لوگ) سے ماخوذ سمجھتے ہیں جو اُن کی قتل و غارت کی عالمگیر شہرت کے عین مطابق ہے۔ ایک مشہور رُبیت کا مطلب یہ ہے کہ جو بلوچ چوری اور قتل کرتا ہے وہ اپنے آباؤ اجداد کی سات پُشتوں کے لئے بہشت حاصل کر لیتا ہے۔ اگر ان کے سابقہ عادات و اطوار کی آدھی کہانیاں بھی مبنی بر صداقت ہوں تو ان کے سرحدی چھاپہ مار آباد اجداد اور ان کے ابناد اخلاف دونو بہشت کو فتنہ و فساد اور ہمسایوں کے مویشی

---

[1] سکیچ آف دی بلوچ لینگوئج (بلوچ زبان کا خاکہ) از ڈیمز

چرانے کے امکان کے بغیر ایک ناقابلِ برداشت مقام بے لطف پائیں گے۔ ہتورام[1] کے بلوچی نامہ کے مطابق وہ پیغمبرِ اسلامؐ سے پہلے موجود تھے ایرانی بادشاہ نوشیروان شاہنامہ میں شکوہ کرتا ہے کہ "زمین بلوچوں کی وجہ سے سیاہ ہوگئی تھی"۔ اِن گذشتہ ایام میں وہ حلب کی پست پہاڑیوں کے باسی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ حلبی انہیں بلوچ پکارتے تھے اور ایک سے زیادہ مسلمان مصنّفین نے اس کا معنی بتایا ہے۔ "بربریت پسند قبائل، جو گرم سیر، سیستان اور مکران کے پہاڑوں میں آباد تھے"۔ جب دوسرا اموی خلیفہ، یزید[2]، حضرت امام حسینؓ[3] سے لڑا اور موخر الذکر شہید ہوگئے تو بلوچوں نے اپنی روایات کے مطابق ان کا ساتھ دیا تھا لہٰذا انہیں ایران میں کرمان و سیستان کو بھاگنا پڑا جہاں سے وہ پھر مکران (موجودہ بلوچستان) اور سلیمان کی طرف نقل مکانی کرآئے۔ اُن کی جہاں گردی کئی نظموں کا موضوع بنی ہے۔

"ہم حضرت علیؓ کے مُرید ہیں
جو دین کے سچّے اِمام تھے
ہم حلب سے آئے

---

[1] ڈیمز کا ترجمہ 'بلوچ نامہ'

[2] مصنّف نے یزید کی بجائے یزیز لکھا ہے جو غلط ہے (مترجم)

[3] مصنّف نے حضرت امام حسینؓ کی بجائے حضرت امام حسنؓ لکھا ہے جو غلط ہے (مترجم)

یزید کے ساتھ جنگ کی وجہ ہے۔"

"چوالیس قبائل ہیں، سرِ فہرست میر جلد نخان ہے۔" یا شاعر کا قبائلی سردار

"ہم منزل بہ منزل چلے ہیں۔ کربلا اور سیستان کے شہروں سے

ہوت[1] مکران میں آباد ہوتے ہیں

کھوسہ کچھ میں

پانی اور زمین تقسیم کرتے ہوئے

نوح[2] نلی میں

جتوئی اور دیگران سبتی اور ڈھاڈر میں

رند سراوان میں، لاشاری گنداوہ میں

یہی ہمارے نقشِ پا ہیں۔ یہی بلوچ دفتر یعنی دیوان البلوچ ہے۔"

ایک اور کہانی میں حاکم کرمان اور بلوچ سردار، علمش رُومی کی دوستی کا ذکر ہے جو بہت طاقتور ہوگیا تھا — ایک قدیم ایرانی تاریخ کے مطابق دس دس ہزار کے چوالیس تُمن؛ تمندار ... ۱۰۰ کا سردار و سالار تھا۔ ہوتے ہوتے حاکمِ کرمان کے جانشین کی سردار کے جانشین سے اَن بن ہوگئی کیونکہ اس نے ہر تمن سے اپنے حرم کے لئے ایک لڑکی مانگی۔ بلوچوں نے لڑکوں کا بھیس بدلوا کر بھجوا دیا لیکن روایت کے مطابق حاکم کے غصہ دیکس سے ڈرتے ہوئے

---

[1] مزاری اور دریشک

[2] رِندوں کا ایک حصّہ

کرمان چھوڑ کر مکران میں پناہ گزیں ہوئے جو قدرے ویران علاقہ تھا لیکن جس پر انہوں نے 'پانچ سو سال تک کاشتکاری کی'۔

قصے اور روایات اِن قبائل کے مشترکہ ماخذ کی تصدیق کرتے ہیں جو اب منتشر و مختلف ہو گئے ہیں۔ یہاں تک ایک شمالی بلوچ شاید ہی جنوب کے مکرانی کے لیے قابلِ فہم ہو اور گو قلات کا براہوئی ایک بگٹی کو سمجھ سکتا ہے تاہم بعض علمائے لسانیات کے مطابق اُن کی زبانیں مختلف زمروں سے تعلق رکھتی ہیں۔ جس سردار کے تحت وہ مکران آئے اُس کے چار بیٹوں اور ایک بیٹی کے نام پر بہت سے مشہور قبیلے وجود میں آئے جن میں سے دو نمایاں ترین ہیں یعنی رند اور لاشاری۔ اوّل الذکر کے نام کا اب کوئی قبیلہ نہیں گو بڑے بڑے سرحدی قبائل رند ہونے کا دعوےٰ کرتے ہیں۔ تمام ٹھیٹ سرحدی بلوچ رند یا لاشاری ہیں اور انہی سے ان کے دو داستانی ہیرو، میر چاکر رند اور میر گہرام لاشاری برآمد ہوئے جو گویا سرحدی داستانوں کے پرسی اور ڈگلس ہیں۔

" اصل میں یہ دونو بھائی تھے
خدا شاہد ہے، ایک ہی خاندان کے۔"

دونو ریحان رند اور رامن[1] لاشاری ایک ہی عورت پر فریفتہ تھے "ایک معشوقۂ ہزار غمزہ و ادا اور شیرینیٔ گفتار، ایک آفتِ عاشقان!" انہوں

---

[1] کتاب میں راون ہے جبکہ بلوچ روایات میں رامن ہے (مترجم)

نے ایک گھوڑ دوڑ پر اپنی قسمت داؤں پر لگا دی۔ ہرنے والے کو اُس
شعلۂ جذبات سے دستبردار ہو جانا تھا۔ کچھ رندوں نے بدنیتی سے رامن کے
گھوڑے کا زیر بند کھول دیا اور وہ ہر گیا۔

"رندوں نے بہت بڑا دھوکہ کیا
رامن بہت ناخوش ہُوا
وہ جھٹ پٹے میں غائب ہو گیا۔"

اور پھر جنگ وجدل شروع ہو گئی۔ فاتح اعظم میر چاکر کی ایک محبوبہ تھی جو بیحد
حسین اور دولت مند تھی اور بہت سے ریوڑوں (بالخصوص اونٹوں کے) کی
مالکہ تھی۔ ایک لاشاری سردار بھی اُسی کی زلفوں کا اسیر دلگیر تھا اور اُس
نے عدم التفات پر اُس کے کچھ اُونٹ چُرا لئے۔ اِس پر رند سردار
"آتشِ غضب سے جلنے لگا
حسین گوہر کے شترزادگان کے بدلے
ہم اپنی تلواروں سے سات گنا بدلہ لیں گے
ہم سروں اور بالوں اور پگڑیوں سے کھیلیں گے۔"

"دونو طرف نقصان ہُوا
اِس طرف گوہرام تھا تلوار بدست
اور اُس طرف میر چاکر تھا۔ پورے تیس سال
گوہر کے شترزادگان کے لئے لڑائی جاری رہی۔"

یہ بالآخر ایک عظیم محاربہ میں بدل گئی۔ لاشاریوں نے فتح پائی۔ ایک رند

سردار اور اُس کے ... ۸۰ پیرو مار دیئے۔ اِس پر میر چاکر نے حاکمِ خراسان (غالباً سلطان حسین بیقرا) سے مدد مانگی اور لاشاریوں کو ایک شکستِ فاش دی کہ ان میں سے بہت سے گنداوا (کچھی) سے نکل کر ٹھٹھہ اور حیدر آباد (سندھ) میں چلے گئے جہاں وہ اب بھی آباد ہیں۔ کچھ قلات کی رِند حکومت کے زیرِ سایہ ہی رہ گئے۔

میر چاکر قومی رِند ہیرو ہے، بلوچوں کا شاہ آرتھر! وہ بے شمار کہانیوں کا موضوع ہے، رومانوی، تاریخی اور فرضی کہانیوں کا۔ وہ اپنی منشائے قبائلی بھینسوں کو پتھروں میں بدل سکتا ہے اور یُوں اپنے دشمنوں کے خلاف گھاٹیوں کی ناکہ بندی کر سکتا ہے۔ اُس کا نام اب بھی "چاکر کی ماڑی" "چاکر کی تنگ (گھاٹی)" اور سیوستان کی بہت سی چوٹیوں اور درّوں میں زندہ ہے۔

اُسے پندرھویں صدی میں حاکمِ خراسان کا اِتحادی بتایا جاتا ہے اور یہ دونو سولھویں صدی میں مُغل ہمایوں کی مدد کرتے ہوئے بیان کئے جاتے ہیں۔ اُس نے رِندوں کی مکران میں قیادت کی، سبّی کا قدیم قلعہ تعمیر کرایا جو مرکزِ سلطنت بنا اور پھر شاید متنفّر ہو کر پنجاب چلا گیا اور لاہور (؟) میں فوت ہُوا۔

"اُس کی دعوت پر چالیس ہزار آدمی آئے
ڈھال، تیر اور ترکش سے مسلّح
ریشمی قبا و عبا پہنے ہوئے اور پاؤں میں سُرخ جوتے
نقرئی چاقو اور خنجر لئے ہُوئے اور ہاتھوں میں زرّیں انگوٹھیاں
پہنے ہُوئے!"

اور وہ سب اُس بے خوف میر کے عزیز و اقارب تھے "جو سرحدی جنگ کے باب خونیں کو وا کرنے کے لئے اُس کے اشارۂ ابرُو کے منتظر تھے۔ میرُ مردم مستیؔ" یا "گرد آلود گندا دا" سے مطمئن نہیں ہے اور گو وہ موٹی چکنیوں کی بھیڑیں کھاتے ہیں اور نشہ آور شراب کشید کرتے ہیں" تاہم وہ اپنی مونچھوں پر خوشبو نہیں لگا سکتے اور اپنے ہاتھوں میں بچوں کے لئے ڈنڈے لئے پھرتے ہیں" وہ رندوں سے آگے بڑھنے کو کہتا ہے۔

" تاکہ ندیوں اور خشک زمینوں پر قبضہ کریں
اور انہیں آپس میں بانٹ لیں
حکومت اور حکمران کا لحاظ کئے بغیر؛"

رندوں کو دوسروں کا آقا و حاکم ظاہر کیا گیا ہے۔ ان کے مقابل پر دیگر حصے ماند پڑ جاتے ہیں۔ قبائل کی ایک طویل فہرست گنوائی گئی ہے۔

" وہ سب چاکر کے سامنے پانی بھرتے ہیں
اُس نے انہیں اپنی بہن بانڑی کو دیا
بطورِ جہیز، جب اُس کی شادی ہدیا سے ہوئی
لیکن ہدیا انہیں لینے سے متنفر تھا"

وہ (رند) اپنے قائد کے مشوروں پر کاربند رہے۔ اُن کا حصولِ اقتدار کا زمانہ غالباً وہ تھا جب وہ ڈیرہ جات کی سرحد اور دیگر علاقوں (جو ان کے ناموں پر مشہور ہوئے) کے ساتھ ساتھ اپنے چھوٹے سرداروں کے تحت موجودہ مقبوضات میں آباد ہونے لگے۔

یہ ہے وہ کہانی جو قبائلی گائکوں (شجراتِ نسب کے پیشہ ور مُطرب) نے گیتوں (دفتروں) میں بیان کی ہے۔ ایسے ہمہ صفت موصوف اور حاضر ناظر انسان، میر چاکر کی کوئی تاریخ مقرر کا تو سوال ہی نہیں لیکن ٹھوس تاریخی شہادتوں کی بنا پر یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ بلوچ قسمت آزنا پندرھویں صدی کے آخر تک ضلع ملتان تک پھیل گئے تھے اور کچھ سولھویں صدی کے اوائل میں شمال میں جہلم تک جا پہنچے تھے لہٰذا وہ پندرھویں صدی کے وسط تک کوہ سلیمان کے گرد و نواح میں بہت زور پکڑ چکے تھے۔

نئی زمینوں اور چراگاہوں کے سلسلہ میں رند قائد کی خواہش کے علاوہ ایک اور سبب بھی کارفرما تھا جس نے پیش قدمی کو مطلوب تر بنا دیا۔ بلوچوں کو اس وقت ان کا مبیّنہ ہم اصل قبیلہ، براہوئی قلات کی زرخیز وادی سے باہر دھکیل رہا تھا جو پندرھویں صدی میں یہاں بہت طاقت پکڑ گیا تھا اساطیر، براہوئیوں کو بھی بلوچ بتاتی ہیں اور حلب سے ہی ماخوذ گردانتی ہیں اور 'بلوچ نامہ' میں ہے کہ یہ لوگ پہاڑ (روہ) میں رہنے کی بدولت روہی کہلاتے تھے اور یہی لفظ بروہی میں بدل گیا۔ جب میر چاکر نے قلات پر قبضہ کیا تو وہ ابھی تک مکران و سیستان ہی پہنچے تھے، جب رند زیریں سلیمان سے پٹھانوں کو پیچھے دھکیل رہے تھے اور جواٹ کو ڈیرہ جاتی سرحدوں سے نکال رہے تھے اور اسماعیل خان، فتح خان اور غازی خان ڈیرہ جات (پڑاؤ یا خیمے) کی بنیاد رکھ رہے تھے تو براہوئی مندی (مندو۔ مترجم) خان سے قلات چھین رہے تھے (اس کا مقبرہ اب بھی قلات میں ہے) اور خان قلات

کا خاندان قائم کر رہے تھے جو اس سے پہلے ایک معمولی تمندار تھا اور اس کے پاس کوئی قابلِ ذکر فوج نہ تھی۔ براہوئیوں نے مستونگ، کوئٹہ، بولان اور برخے از کچ گنداوا اقلات میں شامل کئے۔ بالآخر وہ سب پر غالب آ گئے اور ان کے سردار کو تمام موجودہ ماورائے سرحد بلوچ قبائل نے حاکم بالا تسلیم کر لیا۔ فرقِ مراتب اب بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے اور براہوئیوں کو خان کی مہمات کے دوران گندم کا آٹا ملتا ہے لیکن بلوچوں کو باجرے پر ہی قناعت کرنا پڑتی ہے۔ براہوئی خوانین کی سیادت کاملاً ختم ہو گئی ہوتی اگر ہماری سرحدی پالیسی نے اسے سہارا نہ دیا ہوتا!

ہماری سرحد کے اندر سردار ڈومکی (ایک رند قبیلہ) برائے نام سربراہ ہے لیکن قبائل ایک دوسرے سے آزاد ہیں اور قدیم بین القبائلی جنگوں اور ہمسایوں کی ایذا رسی اور ان کے چوپایوں کو ہنکا کر لے جانے سے صرف انگریزی راج کی وجہ سے باز رہتے ہیں اور کچھ عرصے کے لئے تو وہ اس کے باوجود بھی بے لگام رہتے تھے۔ لیکن بہت سی اور مہنگی عدالتوں اور زر طلب وکلاء کے طریقۂ کار نے انہیں کافی حد تک ایک جوش انگیز بدل دے دیا ہے اور اب سردار جنگوں کے طویل سلسلوں کے زیر اثر زہر کی بجائے اپنے آپ کو اور اپنے قبائل کو ایک مقدمے کے ذریعے زیادہ تیزی سے تباہ و برباد کر سکتے ہیں اور سرحدی بلوچ دن بدن مہذب ہو رہا ہے اور اس طریقۂ کار کو اختیار کر رہا ہے۔

چوتھا باب

سندھی سرحد کی تین اساطیر

یوسف زلیخا کے ہاں جو درجہ راندۂ تقدیر عاشقانِ سوختہ آدم خان اور درخانی کو حاصل ہے وہی درجہ سندھی سرحد کے رومانوی بلوچ کے ہاں سسّی پنوں کے المیہ کا ہے۔ موخر الذکر قدیم تر ہے اور یہ مستانِ الست کوئی ۹۰۰ سال پہلے ظہورِ اسلام کے قریب ہو گذرے ہیں۔ بلوچی پیرائے کے علاوہ یہ کہانی فارسی[1]، بلوچکی اور پنجابی میں بھی لکھی گئی ہے۔ موخر الذکر میں سسّی کو 'رُل موئی' (وہ جو ماری ماری پھرتی ہوئی مری) کہا گیا ہے تاکہ 'ڈُب موئی' (وہ جو ڈوب کر مری) سے تمیز ہو سکے۔ یہ کہانی سندھ اور بلوچ سرحدات کے تمام وحشیانہ قبائل میں مقبول ہے اور بقول سر رچرڈ برٹن (جس نے سندھ پر اپنی تصنیف میں اِس کا خلاصہ دیا ہے) "شتربان سفر کے دوران، چرواہا اپنے مویشی چراتے ہوئے اور کسان تن تنہا اپنا خون پسینہ ایک کرتے ہوئے — سب اِسے اپنے گنوار اور لوک رنگ میں گاتے ہیں۔"

پنوں بے حد خوش وضع بلوچ ہے، اپنے خاندان کا بنجمن (بنیامین)

---

[1] میر معصوم بھکری نے "حسن و ناز" میں یہ کہانی بیان کی۔

اپنے والدین کا پرستیدہ اور مستورات کا مقناطیسی ڈان جوآن ! اس کا
باپ آری گیج (مکران) کا جام ہے۔ سستی بھونبہ کے ایک برہمن کی بیٹی تھی
اور اس کے متعلق پیشگوئی کی گئی تھی کہ وہ مسلمان ہوکر اپنے خاندان کا ناک
کٹوائے گی۔ اس کا والد اسے مار دینا چاہتا تھا لیکن اس کی ماں کی التجا پر
اس نے اسے ایک صندوق میں بند کیا اور دریائے سندھ میں بہا دیا
لیکن ایک دولتمند دھوبی کے پانچ سو شاگردوں میں سے ایک نے اُسے
بچا لیا اور چونکہ بھمبور کا یہ دھوبی، محمود بے اولاد تھا لہٰذا اس نے اسے
اپنی بیٹی بنا لیا۔ اس کا نام سسوئی (مہ پارہ) رکھا گیا۔ وہ بڑی ہوئی تو جامع
صفات و کمالات ثابت ہوئی اور اُس کے حُسنِ بے پناہ سے نہایت
المناک نتائج نکلے۔ "جو اسے دیکھتا فدا ہو جاتا اور جہاں وہ بیٹھتی لوگ
مجمع النجوم کی طرح اس کے گرد اکھٹے ہو جاتے "
جام گیج کا ایک ملازم، بہیوا اونٹوں اور سامان کا ایک قافلہ لے کر
بھمبور[1] آیا۔ وہاں اُس کی ملاقات سسی سے ہوگئی جو اپنی سہیلیوں کے ساتھ
تھی اور اس کے سامان کی قیمتوں پر کچھ نوک جھونک بھی ہوئی۔ لڑکیوں نے
اسے اس کے حُسنِ خلق کا واسطہ دیا اور تحفتہً تھوڑا سا مُشک مانگا لیکن اُس
نے ہندو ہونے کی حیثیت سے اعتراض کیا۔ سسی نے اُسے حوصلہ دیا کہ اگر

---

[1] بھمبور اُس وقت مشہور ترین بندرگاہِ سندھ تھی اور اب کراچی اور غرہ
کے درمیان ایک کھنڈر ہے۔

وہ اپنی چیزیں انہیں دکھادے تو وہ انہیں نقد پیسے دے گی۔ جب اُس نے چیزیں دکھانا شروع کیں تو سسّی اُس کے ناک نقشہ سے متاثر ہو گئی۔

"اے میری ساتھیو! دیکھو یہ کتنا خوبصورت ہے"! لیکن ببیہو نے کسرِ نفسی سے کام لیا اور کہا کہ اُس کے آقا کا بیٹا، پنہل خان واقعی خوش وضع ہے۔

"خوبصورت ہے وہ بلوچ، وہ لمبی لمبی لہراتی ہوئی لٹوں والا، مجھے تو اس کے جمال کا چالیسواں حصّہ بھی نصیب نہیں"! اُس نے پنہوں کی اتنی تعریف کی کہ سسّی محض سماعت سے اُس پر مفتون ہو گئی۔ "گوش اکثر چشم سے بھی پہلے عشق سے گھائل ہو جاتے ہیں"! اُس نے ببیہو سے درخواست کی کہ وہ مَرکری (رومی دیو مالا میں دیوتاؤں کا قاصد) کی طرح اُس بلوچ کو اُس کے پاس لے آئے جس کے لئے وہ اُسے بہت سا انعام دے گی۔ ببیہو نے بے شمار مشکلات کا اظہار کیا۔ "پنّوں کو تو شکار کے لیے بھی اپنی ماں سے رخصت نہیں ملتی، میں اُسے یہاں تک کیسے لا سکتا ہوں؟ اُس کے گرد تو پہرہ ہوتا ہے اور پھر اُس سے بھی مشکل تر یہ ہے کہ پنّوں کی دو بیویاں ہیں جن کی آوازیں کوئل کی طرح شیریں ہیں"! نوجوان سسّی ان مشکلات پر ہنستی ہے اور عذر یا انکار سُننا نہیں چاہتی۔ "میں بھی ایک دوشیزہ ہوں، بھمبور کا سرمایۂ افتخار اور میری آواز بھی کوئل سے کم دلکش نہیں"! بالآخر تاجر پنّوں کے لئے بہت سے سلام و پیام اور جام کے لئے بہت سے قیمتی نذرانے لے کر کیچ کو روانہ ہو گیا۔

ببیہو اپنے آقا کے پاس واپس آیا، اپنے سامان کا حساب کتاب

دیا اور موقعہ ملتے ہی پنّوں کو سسّی کے پیغامات و تحائف دیئے اور اس
کے حسن کی بے حد تعریف و توصیف کی۔ پنّوں یہ سُن کر بے اختیار ہو گیا اور فوراً
روانہ ہونے کے لئے کمر بستہ ہوا خواہ اُس کے والدین مانیں یا نہ مانیں۔
اُسے جانے میں اچھی خاصی مشکل پیش آئی۔ باپ بنیامین کے سوا کسی بھی
بیٹے کو بھیجنے پر رضامند تھا۔ اُس کی ماں مجسّم تردد بنی ہوئی تھی اور سب
اہلِ کارواں کو تاکید کر رہی تھی کہ "وہ اُس کے چھوٹے سے پنّوں کی ہر طرح
احتیاط کریں۔" اُس کی بڑی بیوی نے کوئی تعرض نہ کیا لیکن چھوٹی بیوی باہر
نکلی اور اونٹ کی مہار پکڑ لی۔ "میرے سرتاج! خدا کے لئے مجھے اکیلے نہ
چھوڑو۔ رات میرے ساتھ گذار دو یا مجھے میرے میکے بھیج دو!" لیکن
عاشقِ دل باختہ، سراپا مسلح، اپنے پسندیدہ اونٹ پر سوار ہوا۔ اُسے کون
روک سکتا تھا؟ وہ خوشی خوشی روانہ ہوا اور قافلے والوں کے دل اپنی
روح افزا باتوں سے بہلانے لگا۔

ابھی بہت دُور نہیں گئے تھے کہ ہوائے نفس نے اُس کا پیچھا کیا
راستے میں ایک قصبہ لوہی آیا جہاں 'سہ جان' رہتی تھی — ایک حسینۂ دلنواز
لیکن اخلاق باختہ! وہ پنّوں کو دیکھ کر اُس پر فریفتہ ہو گئی اور مرد کا بھیس
بدل کر اظہارِ محبت کے لئے اُس کے خیمے میں آ گئی جہاں پنّوں اور بنیھو
شطرنج کھیل رہے تھے۔ پنّوں نے بھیس میں بھی مستور حسن کو دیکھ لیا۔ بساط
اُلٹ دی اور اُس سے اتنا مسحور ہوا کہ نہ صرف خود اُس کی دعوت منظور
کر لی بلکہ سارے کارواں کو رُکوا لیا۔

دریں اثنا سسّی اپنے نوخیز بلوچ کے لئے بے قرار ہو کر اُسے خط لکھنے کا سوچنے لگی بلکہ اپنے ایک عاشقِ خاموش، اخوند لعل سے خط لکھوانے لگی۔ اخوند لعل سسّی کے عشق میں روتے روتے اپنی بینائی کھو چکا تھا لیکن اُس نے ایسا درد انگیز خط لکھا کہ پھر اُسے خود سُن کر اُس کی بینائی عَود کر آئی لہٰذا یہ پنّوں کو جلد بُلانے میں کارگر سمجھا گیا۔ یہ درد انگیز خط ایک ایلچی کے ذریعے پنّوں کو بھیجا گیا جو اُس وقت لوہی میں سہ جان سے لیت و لعل کر رہا تھا اور وہ اُس سے ایک لمحہ جدائی بھی برداشت نہ کر رہی تھی۔ بالآخر پنّوں نے اُس کے پیالوں میں افیم ڈال دی اور بیبو کو وہیں چھوڑا تاکہ ہوش آنے پر اُسے یہ کہہ کر مطمئن کر دے کہ کیچ سے ایک ایلچی اُس کی ماں کی وفات کی خبر لے کر آگیا تھا۔ اِس فرضی واقعہ سے بیبو کی جان بچ گئی جس نے مدہوش و بدحواس سہ جان کی سہیلیوں سے کہا۔ "آؤ اور میرے محبوب پنّوں کی خاکِ پا کو اپنی آنکھوں سے چُومو"۔ اور پھر وقت پر کارواں سے آملا۔ وہ بھمبور میں شاہانہ انداز سے داخل ہوئے تو سب لوگ انہیں دیکھنے کے لئے گھروں سے نکل آئے۔

انہوں نے اپنا خیمہ سسّی کے باغ میں لگایا لیکن سسّی اپنے قابلِ پرستش بلوچ کو اتنا قریب پا کر شرمانے لگی اور کئی پاپڑ بیلنے پڑے۔ پنّوں کی ملاقات تبھی ہوئی جب اُس نے نہایت چابکدستی سے ایک چاہتا کبوتر مار گرایا اور وہ سیدھا اُس کی چچی کی گود میں گرا۔ ضعیفہ اُسے کوسنے لگی تو سسّی نے اُس کا تیر اُس کے حوالے کیا اور یوں بیانِ حال کا موقعہ دیا۔

آزمائش کی خاطر اُس نے پنّوں سے ایک دھوبی بننے کے لئے کہا اور یوں بہت سے عشقیہ گیت وجود میں آئے۔ پنّوں بھی اُس کی محبت کے آبِ زلال سے دُھلتا رہا حتیٰ کہ ان دونوں کی شادی ہو گئی لیکن بھیبو سے لڑائی ہو گئی اور وہ سخت رنجش میں مکران واپس چلا گیا۔

لیکن اُن کی ازدواجی خوشی دیرپا نہ تھی۔ بیوی نے اپنے متلوّن مزاج شوہر سے التجا کی کہ وہ شہر کے فلاں دروازے سے نہ گذرے لیکن اُس نے فوراً ہی وہ دروازہ تلاش کر لیا اور وہاں ایک صرّاف کی نرم و نازک اور حسین و ماہ جبین بیوی، باغلہ سے ملا جس نے حسین و جمیل بلوچ سے فوراً اظہارِ محبت کر دیا اور اونچے سے کہا۔ "خدا ہمیں ملائے"۔ پنّوں نے دیکھا کہ اُس کی تلوار کی نیام ٹوٹ چکی تھی اور اُسے فوراً اُس کی مروّت کا خیال آیا۔ باغلہ پنّوں کا دل جیت کر مطمئن نہ ہوئی تو اُس نے ایک اور تیر چلایا اور اُسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ سسّی بے وفا ہے۔ سسّی بھی فوراً صورتِ حال کو سمجھ گئی اور اپنے دیوانے شوہر کے دل سے اِس زہر آلود تیرِ تشکیک کو نکالنے کے لئے ہر طرح کوشاں رہی لیکن اپنی حریف کے بہتان پر مطالبہ کیا کہ جھگڑا آگ سے طے کرا لیا جائے۔ چنانچہ ایک الاؤ جلایا گیا جس کو دیکھ کر باغلہ کا رنگ فق ہو گیا اور وہ بھاگنے والی ہی تھی کہ سسّی نے اُسے کانوں سے پکڑ لیا اور اُس میں کودنے پر مجبور کر دیا۔ یہ کہنا تحصیلِ حاصل ہے کہ عیّارہ جل کر راکھ ہو گئی اور اُس کے صرف دو کان بچے جو پاکدامن سسّی کے ہاتھوں میں تھے۔ پنّوں کو اپنی بیوی کی محبت و عصمت کا ثبوت مل گیا اور وہ دونوں ایک مختصر مدّت کے لئے پھر

شیر و شکر ہو گئے۔

لیکن اب آخری منظر شروع ہوا۔ غضبناک بہو کی کہانیاں سُن سُن کر مکران میں بوڑھے جام کے کان پک گئے۔ رُسوائی الگ ہوئی اور اس نے اپنے چھ گبھرو بیٹے بنیامین کو واپس لانے کے لئے روانہ کئے۔ وہ بھمبور آئے اور شور و شغب سے بچنے کے لئے انہوں نے پنّوں اور اس کی بیوی کو ایک نشہ آور سفوف پلا دیا اور آدھی رات کو پنّوں کو اونٹ سے باندھ کر واپس چل دیئے۔ سسی جاگی تو اُس کی دُنیا لُٹ چکی تھی۔ شوہر بستر پر نہ تھا اور نہ ہی اُس کے دیوروں کے اُونٹ تھے۔ وہ سمجھ گئی کہ وہ پنّوں کو بھگا کر لے گئے۔ اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ خون کے آنسو گرنے لگے گویا وہ انہیں اُس پہاڑی پر چھڑک رہی ہو جس پر اُس کا شوہر سفر کر رہا تھا۔"

"ہیہات، ہیہات! میرا زخم خوردہ دِل کس طرح اس محرومی کو
برداشت کرے گا؟"

سکون و اطمینان کافور ہو گئے:

"میرے شوہر کے بعد میرے چرخے میں کوئی خوشی نہیں رہی۔
نہ ہی سہیلیوں کی باتوں میں میرا جی لگتا ہے۔
میری رُوح اُن پہاڑیوں میں تحلیل ہو گئی جہاں بلوچ اپنے اُونٹ
لے جا رہے ہیں۔"

اُس نے اپنے محبوب کے نقوشِ پا پر پیچھا کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُس کی سہیلیوں نے بھمبور اور بلوچ گاؤں (معمولی جھونپڑیوں کا) کے درمیان خوفناک ترین

خطرات کا ذکر کیا، صرف اُس کے مفاد میں لیکن خطرات اُس کے پائے استقلال میں لغزش پیدا نہ کر سکتے تھے خواہ یہ اصلی ہوں یا نقلی۔ اُس نے اپنی سہیلیوں کی رفاقت کو بھی ٹھکرا دیا۔ "مَیں اپنے سرتاج کے بغیر واپس نہیں آؤں گی لیکن تم بھوک پیاس سے نڈھال ہو کر اُسے کوسو گی؟" وہ سفر پر روانہ ہو گئی، اکیلی، تن تنہا، پہاڑیوں سے سوال پوچھتی ہُوئی:

"تم میرے محبوب کی جہتِ سفر کا کیوں نہیں بتاتی ہو؟
کل ہی تو تمہارے اُوپر سے اُونٹوں کا قافلہ گذرا۔
کیا میرا شوہر قافلے میں نہیں تھا؟"

اور راستے کے خطرات (جس پر مصنّف نے خوب زورِ قلم صرف کیا ہے!) مہرِ سوزاں، بادِ سموم، حدّت بے پناہ، تھکاوٹ اور آبلہ پائی کے باوجود وہ تلاشِ محبوب میں چلتی رہی۔ آخر کار جنگل کے ایک کنج میں اُسے ایک چرواہا ملا جو اتنا بدنما، کریہہ المنظر اور وحشی تھا کہ غولِ بیابانی معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے اُسے خدا کے نام پر پوچھا کہ اُس کے دیور کونسے راستے پر گئے تھے؟

اُس بدبخت کو اس کی بیوی نے بتایا تھا کہ آج اُسے ایک قیمتی لباس میں ملبوس اور جواہرات سے لدی پھندی خوبصورت دُلہن ملے گی لہٰذا اُس نے سسّی کو وہی دُلہن سمجھا اور فوراً ہی غیر شائستہ عاشق مزاجی سے پیش آنے لگا۔ مُہلت حاصل کرنے کے لئے سسّی نے پیاس کی شکایت کی اور اپنے اُس پھوہڑ مدّاح سے ایک بکری کا دُودھ دوہنے کے لئے کہا۔ اُس نے جواب دیا کہ برتن نہ تھا جس پر اُس نے ایک پیتل کی ہنڈیا نکالی اور جب وہ بکری

پکڑنے لگا تو اُس نے اُس کی تہہ میں سوراخ کر دیا۔ یہ حیوان صفت اِنسان اُس کے حُسن سے اِتنا مسحور تھا کہ اُسے یہ احساس بھی نہ رہا کہ دُودھ کا ایک گھونٹ نکالنے کے لئے کتنا وقت درکار تھا۔ دریں اثنا سسّی مایوسی کے عالم میں دعا مانگتی رہی کہ اُس کی عزت و آبرو محفوظ رہے اور اگر خدانخواستہ کوئی اور راہِ نجات نہ ہو تو وہ زمین میں غرق ہو جائے۔ اُس کی دُعا مستجاب ہُوئی اور آناً فاناً زمین شق ہُوئی اور اُسے اپنے اندر چھپا گئی۔ شقی القلب چرواہے نے اپنی غلطی کا احساس بہت دیر سے کیا اور پھر کفّارہ یوں ادا کیا کہ لگ لپٹ کر اُس کے اعزاز میں مقبرہ اور چبوترہ تیار کرنے لگا۔

چند گھنٹے بعد پنّوں اپنے ایک غلام، لُلّو کے ساتھ اپنے بھائیوں سے بچ بچا کر بھمبور کی طرف ہَوا کے گھوڑے پر سوار روانہ ہُوا۔ چبوترے سے متاثر ہو کر (جو چرواہے نے بہت جلد بنا دیا تھا) وہ یہاں سُستانے کے لئے رُکا تو مقبرے سے اُس کی محبوبہ کی آواز آنے لگی:

"میرے پنّوں! حوصلے سے داخل ہو جاؤ اور تنگ بستر کا نہ سوچو
یہاں باغات ہیں اور چار سُو خوشبو پھیلی ہُوئی ہے۔
یہاں شیریں پھل ہیں، خواب پرور سائے اور خُنک ندیاں
اور اِسلام کی روشنی ہمارے مسکن پر برستی ہے۔
اور زوال اور موت کو بھگا دیتی ہے۔"

پنّوں نے اپنا اُونٹ اپنے غلام کو تھما دیا اور الوداعی پیغام دیا کہ اُس کا انجام والدا اور دوستوں کو بتا دے اور خدا تعالیٰ سے دُعا کی کہ وہ اُسے سسّی

سے واصل ہونے دے۔ زمین کھلی اور اُسے بھی سسّی کی طرح ہڑپ کر گئی۔
للّو نے بوڑھے جام کو اِطلاع دی کہ عاشقانِ صادق ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جا ملے۔ یہاں کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ للّو کہتا ہے:

"اِن دونو عاشقوں کی رُوحیں آنند کے تار بجا رہی ہیں
اور گلاب بالآخر اپنی کیاری میں سج گیا ہے"۔

ان کے مقبرے کراچی اور لس بیلہ کے درمیان کوہِ پب میں ہیں اور بہت سے زائرین کا مرجع ہیں۔ صاحبِ زہد و یقین کو کسی مقبرے سے نکلنے والا ایک ہاتھ روٹی اور دُودھ مہیا کرتا ہے اور کئی مومنوں کے پاس تو سسّی یا پنّوں بنفسِ نفیس آ جاتے ہیں، مرپارہ عموماً مرد زائرین کے پاس اور وجیہہ بلوچ زائرات کے پاس۔ لیکن کوئی اُونٹ سسّی کے مقبرے کے پاس نہیں پھٹک سکتا کیونکہ یہی اُس کے شوہر کو لے گیا تھا اور اُسے کبھی معاف نہیں کیا گیا۔

زیریں وادیٔ سندھ کی ایک اور مقبول محبوبہ "ڈوبنے والی حسینہ" ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ڈُوب موتی 'سوہنی ایک جاٹ کسان کی بیٹی تھی جس نے اُس کی شادی اپنے ہی قبیلہ کے ایک فرد 'دَم سے کر دی۔ دَم موسیقی سے عاری تھا اور غالباً دلکش نہ تھا اور جب برات چند رسومات کی ادائیگی اور فالگیری کے لئے سندھ کے کناروں پر گئی تو شوہر نے سوہنی کو دودھ لانے کے لئے جنگل بھیجا۔ یہاں اُس نے اپنے لئے ایک شگون دیکھا جو مہینوال کے رُوپ میں تھا۔ وہ بانسری بجانے میں ماہر تھا اور سوہنی اُسے دیکھتے ہی فریفتہ ہو گئی۔ اُس کا سر (پنجابی خاکوں کی بھینسوں کی طرح) پھر گیا اور وہ بانسری

کی آواز کی رہنمائی میں ہر رات ایک بڑے گھڑے پر سندھ کو پار کرتی (جو دھوبی بھی اِسی مقصد کے لئے استعمال کرتے ہیں) اور اندھیرے میں اپنے عاشق کے گیت سُنتی اور صبح سے پہلے گھر لَوٹ آتی۔

کینہ پرور اور بدنیّت ساس کو پتہ چلا تو اُس نے بالکل اسی گھڑے جیسا مرتبان اُس کی جگہ رکھ دیا جو کچّا تھا۔ ایک رات سوہنی چاندنی میں اپنے عاشق کے ساتھ بیٹھی تھی کہ اُس نے اُس کی آنکھ میں ایک چھوٹا سا داغ دیکھا اور اُسے بتایا۔ جس پر اُس نے بتایا کہ یہ کئی ماہ سے تھا اور شاید دونوں پر کسی ٹوٹنے والی آفت کا شگون تھا۔ عاشق کا خوف سچ ثابت ہُوا۔ اگلی دفعہ جب وہ دریا پار کرنے لگی تو کچّا گھڑا ٹوٹ گیا اور حُسنِ مجسّم سوہنی (: حسینہ) ڈوب گئی۔ اب بھی دریا اُس کی ہمدرد ہے اور اس کی مدح میں گائے جانے والے اشعار و ابیات اب بھی ظاہر کرتے ہیں کہ اُس کا حُسنِ بے پایاں اُس کی بعض معمولی غلطیوں کی تلافی کر دیتا ہے:

"سوہنی حُسنِ صورت و سیرت کا مجموعہ تھی
اُس میں ایک خامی تک نہ تھی
اُس نے تلاشِ مسرت میں گھر بار چھوڑا، سرتاج چھوڑا
تلاشِ محبت میں؛ لیکن وہ گورنصیب، گورنصیب ہو گئی!"

ایک اور کہانی دریا کی گذرگاہ سے متعلق ہے۔ یہ مفروضہ کسی حد تک مُستند ہے کہ مشرقی نارہ یا دریائے سنا کا سندھ کی پُرانی گذرگاہ ہے۔ اسی سے سکندر اپنے بیڑے کے ساتھ گذرا، اپنی کشتیاں اروڑ پر رکوائیں جو بھکّر سے زیادہ

دُور نہیں ہے اور پھر ایک جگہ کے خلاف ایک مختصر مُہم لے کر گیا جسے جنرل کننگھم نے لاڑکانہ بتایا ہے۔

مزید برآں پنجاب اور سندھ کے قدیم دریا آج بھی متعدد محققانہ مقالات کا موضوع ہیں۔ آیا یہ 'دریائے گمشدہ' (جو رَن کچھ میں گرتا تھا) دریائے ستلج یا مقدس سرسوتی سے علیحدہ ایک پُورا دریا تھا یا خیرپُور کے اردگرد کے ریگزاروں میں گھومتے گھامتے تھک تھکا کر اسے اچانک ایک خلا مل جاتا تھا اور یہ یک لخت مغرب کی طرف مُڑ جاتا تھا ــــ ہنوز ایک دلچسپ مسئلہ ہو سکتا ہے لیکن لوک کہانی اِس کا بہت سیدھا سادہ حل بتاتی ہے۔

بھکر اور خیرپور کے درمیان ایک شہر تھا اروڑ یا الرور جو اَب بھی قریبی قصبہ روہڑی کے نام میں زندہ ہے۔ یہ ایک شہر تھا "محلات، کاشانوں، باغات، کنجائے دلنشیں، حوضوں، ندیوں، چمن زاروں اور پھولوں سے مزین" غرضیکہ عالم میں انتخاب تھا۔ یہ شہر اور ملتان ("خانۂ زرکی سرحد") اُس وقت مُلک کے دو اہم ترین ستون تھے، دو عمدہ ترین دارالحکومت اور شاہی اقامت گاہیں۔ ایک اِبتدائی سندھی مورّخ نے اپنے بھتیجے کو لکھا "اگر تم کہیں سکونت اختیار کرنا چاہو تو دلکش ترین جگہ کا انتخاب کرو۔" ملتان اور راوڑ دونوں اتنے جانفزا تھے کہ ان میں سے ایک کا انتخاب کرنا مشکل ہوتا تھا۔ مدّت تک اِس سلطنت پر ایک شاہی خاندان اطمینان و خوشحالی سے حکومت کرتا رہا، ایک ایسا خاندان جو جاہ و حشم کا مالک تھا، روئے زمین پر انصاف کا بول بالا کرتا تھا اور اُس کی سخاوت تو چار دانگِ عالم میں مشہور تھی۔ اُس کا

دارالحکومت اروڑ تھا اور سلطنت کشمیر سے کیکانان تک پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ آسودہ حال تھے بالخصوص وہ جنہیں دریائے سندھ کا پانی ملتا تھا۔ لیکن لاڑکانہ، مہار اور سہوان محض بنجر اور چٹیل تھے کیونکہ 'پانی جو خوشحالی کا سرچشمہ ہے' اروڑ کے پاس سے اس علاقے سے بہتا تھا جو مشہور قصبہ محمد طور کے جنوب میں تھا اور جس میں اکابر و ابطال رہتے تھے، شیخ الشیوخ بہاول حق کے مریدانِ باصفا! یہ گنگرو پر موجودہ شکارپور سے زیادہ دُور واقع نہ تھا۔ "ان تمام علاقوں کو سیراب کرتا ہُوا، دریا دیول کی بندرگاہ پر اپنا فاضل پانی نذرِ سمندر کر دیتا تھا۔" یہ بندرگاہ بموجب سر ایچ۔ ایلیٹ کراچی یا اُس کے قریب تھی۔

لیکن کچھ عرصے بعد یہ شاداں و فرحاں علاقہ بدقسمتی سے دلُورائے جیسے ظالم و زانی بادشاہ کے زیرِ پا آگیا۔ وہ تاجروں پر بے غل و غش ٹیکس لگاتا تھا، دریا کے راستے اروڑ کو آنیوالی تمام اشیاء پر پچاس فیصدی محصول لیتا تھا اور ہر رات ایک نئی کنیا اُس کی سیج کی زینت بنتی تھی۔ آخرکار ایک سوداگر، شاہ حسین نامی دہلی سے آیا۔ اُس کے پاس غیر معمولی سامانِ تجارت اور وافر سرمایہ کے علاوہ ایک خادمہ بھی تھی، جو "بدرِ کامل کی طرح نوجوان اور حسین تھی۔" وہ مکہ معظمہ کو جا رہا تھا۔ ظالم بادشاہ نے نہ صرف اُس سے زیادہ محصول کا تقاضا کیا بلکہ اُس خاتون کا بھی مطالبہ کیا۔ مسافر نے 'اللہ تعالیٰ کی نصرت اور اُس کے خصوصی نمائندہ خواجہ خضر کی برکت سے' ایک جرأت مندانہ اقدام کا فیصلہ کیا جو روزِ حشر تک جریدۂ

تقدیر پر ثبت رہے'. اُس نے محصولات ادا کرنے اور دوشیزہ منتقل کرنے کے لئے تین روز کی مہلت مانگی اور پھر کثیر التعداد ماہرین اور ہنرمند جمع کئے جو کوہکنی میں فرہاد کو مات کرتے تھے اور سکندر کے آدمیوں کی طرح شگاف کو سدّ سکندری سے بند کر سکتے تھے: اُس نے اُنہیں ایک نہر کھودنے پر مامور کیا اور راروڑ سے اُوپر ایک مضبوط پُشتہ تعمیر کرنے کا حکم دیا لیکن بدیں احتیاط کہ اُس کی اپنی کشتیاں اُس سے اونچی رہیں۔ انہوں نے ایسی محنت کی اور اللہ کا فضل ایسا شاملِ حال رہا کہ تین دنوں کے ختم ہونے سے پہلے پہلے سندھ کی گذرگاہ بدل دی گئی اور یہ سہوان اور لکّی پہاڑیوں کی طرف بہنے لگا اور سوداگر اور اُس کے بیڑے کو بھی اسی طرف بہا کر لے گیا۔ دلورائے ایک صبح جاگا تو دیکھا کہ دریا راجدھانی کے پاس سے بہنے کی بجائے صرف کیچڑ اور کچھ گدلا پانی یہاں چھوڑ گیا تھا اور سوداگر بمعہ مال لا غائب تھا اور علاقہ تباہ ہو گیا تھا۔ دریا کو پرانی گذرگاہ میں واپس لانے کی ہر کوشش ناکام ہو گئی۔ راجہ بہت پچھتایا لیکن 'اب کیا ہووت جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت'! وقائع نگار لکھتا ہے "بیوقوف! جب سارا چلا جاوے تو پچھتاوے سے کیا فائدہ؟" ظالم بدی سے باز نہ آیا، حتیٰ کہ وہ خود اور اُس کا ملک تباہ ہو گیا۔

اگرچہ اروڑ کے کھنڈرات کے پاس اب بھی کیچڑ ہے تاہم سندھ بھکر کی چٹانوں میں ہی بہتا ہے جہاں اُس پر حال ہی میں پل تعمیر ہوا ہے اور جس کے متعلق گزیٹیئر بتاتے ہیں کہ اِسے "کسی عظیم قدرتی

انقلاب نے اِس طرف منتقل کر دیا"۔ لیکن گزیٹیر نگار سندھی مورخین کے ماہر اور ہنرمند کاریگروں، اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا کوئی ذکر نہیں کرتے!

پانچواں باب

کوہِ سلیمان کے دو رُخ

طویل اور تنگ علاقے کی پٹّی جو سندھ کے شمال کی طرف پھیلی ہوئی ہے، کوہِ سلیمان کی چاقو نما چوٹیوں کے خشک اور سپاٹ سلسلے اور دریائے سندھ (جس کے تغیّر پذیر کنارے اس کے ریتلے جزائر کی طرح سپاٹ تر ہیں) کے درمیان محصور ہے اور قریب قریب ضلع ڈیرہ غازی خان پر محیط ہے۔ یہ پٹّی قریباً ۲۵۰ میل تک شاذ و نادر ہی پچیس میل سے زیادہ چوڑی ہے۔ اس کی زیریں طرف کا سندھ اور بالائی طرف کا ڈیرہ جات کا باقی ماندہ حصّہ ایک ایسا خطّہ ہے جو بارش سے قریباً محروم ہے۔ بے سبزہ پہاڑیوں سے آنیوالے نالے کبھی کبھار یہاں آب پاشی کا نادر موقع فراہم کرتے ہیں اور کاشت کار ان کا ایک ایک قطرۂ آب بھی ضائع نہیں ہونے دیتے۔ مصنوعی بندات کے ایک پیچیدہ نظام کے ذریعے وہ اس خشک اور چٹیل مٹّی کو ایک سرسبز پٹّی میں بدل لیتے ہیں جسے مقامی طور پر پچھدؔ کہتے ہیں۔ جہاں زمینیں سندھ کے حلقۂ سیرابی میں آتی ہیں وہاں کا علاقہ مزروعہ اور سرسبز ہے، نہریں اور کنوئیں بکثرت ہیں، اشجار منظر کو زندہ و تابندہ بناتے ہیں اور دریا کی قربت کے مطابق دیہات کی تعداد بھی بڑھتی جاتی ہے۔ ضلع کے کاشتہ

رقبہ کا نصف سے زیادہ حصہ اور آبادی کا بیشتر حصہ بھی اسی خطۂ "سندھ" کے اندر ہے۔ سندھ اور "کچھڈ" کے درمیان ایک بے آب وگیاہ صحرا ہے جو لہردار ریگزاروں کا ایک سلسلہ ہے جس میں تبدیلیٔ منظر کے لئے کہیں کہیں پست پہاڑیاں ہیں گویا کسی بدرُوح نے ان میں ہر جسامت کی چٹانوں کو ترتیب وار جَڑ دیا ہو! پانی، سبزہ اور باشندوں سے قریباً عاری، یہ حصہ اتنا غیر دلکش ہے کہ حریص سے حریص سامراجی بھی اِس پر قبضہ نہ کرنا چاہے گا۔ نقشے کو دیکھیں اور کاغذات میں پہاڑی ندیوں کی تعداد پر نظر ڈالیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھڈ دودھ اور شہد کی سرزمین ہے کیونکہ صرف ضلع ڈیرہ غازی خاں میں ۲۰۰ سے زیادہ جوئبار ہیں لیکن غیر معمولی موسموں کے سوا ان کا ایک قطرۂ آب بھی سندھ میں نہیں پہنچتا۔ بعض میں صرف آبِ باراں آتا ہے اور بعض میں اکثر پانی کا نام ونشان بھی نہیں ہوتا۔ صرف دو نالے دائمی ہیں لیکن ان کا پانی بھی پشتوں کو توڑ کر ان کے اور دریا کے درمیان کی زمین کو شاذ و نادر ہی زیرِ آب لاتا ہے۔ ان کے سوا باقی سب موسمِ گرما میں خشک پڑے رہتے ہیں اور ان کے پاٹوں میں کھدے ہوئے کنوئیں بھی دیرپا نہیں ہوتے۔ عام کنوئیں اکثر ۳۰۰ فٹ گہرے ہوتے ہیں اور پھر بھی ان کا پانی غیر مسلسل اور کھاری ہوتا ہے۔ اس وقت علاقہ قابلِ رہائش نہیں رہتا اور قبائل اپنے جانوروں کو کنارِ سندھ اور پہاڑوں کے اندر دُور لے جاتے ہیں اور مئی، جون اور جولائی میں کچھڈ ویران وسنسان ہو جاتا ہے۔

پہاڑ تاریخی مغربی سرحد ہیں لیکن ان کی خصوصیات بھی ان کے پار جانے

کی حوصلہ افزائی نہیں کرتیں۔ بیرونی پہاڑیاں متعدد متوازی سلسلوں پر مشتمل ہیں اور ان میں سے بعض بڑی بڑی کافی اونچی بھی ہیں۔ ردجان کے بالمقابل گندھاری چوٹی ۱۴،۰۰۰ فٹ سے زیادہ بلند، ہرنڈ کے بالمقابل دراگن ۵،۰۰۰ فٹ سے زیادہ، سخی سرور کے سامنے اکائی ۷،۵۰۰ فٹ اور ڈیرہ اسمٰعیل خان کے قریباً مغرب میں تختِ سلیمان کی دو نوچوٹیاں گیارہ گیارہ ہزار فٹ سے بھی زیادہ بلند ہیں۔ مشرقی ڈھلانیں چٹانی اور ڈھلوان ہیں اور قریباً سبزہ سے عاری ہیں سوائے چند محروم نمو اور بے شجر زیتون کے۔ راستے تنگ گھاٹیاں ہیں جن میں پانی مفقود ہے اور یہ اسے مزید دل شکن بنادیتے ہیں۔ تاہم یہاں پوری سرحد میں درّوں اور ذیلی راستوں کا جال بچھا ہُوا ہے جسے قدرت نے اتنا باقاعدہ بنایا ہے کہ وہ متوازی خطوط اور راستوں کا سائنسی نظام معلوم ہوتا ہے۔ قدرتی خطِ دفاعی کے طور پر ماہرین نے اسے محض ایک ڈھکوسلا بتایا ہے۔ سروے کے میجر ہولڈچ کا کہنا ہے:

"یہاں عموماً دریاؤں کے مابین اونچی زمین کے دو سلسلے ہیں (جو پورے افغانستان کا عام جغرافیائی نشان ہے) جو قریباً متوازی اور ٹوٹی پھوٹی گھاٹیوں کی صورت میں ہیں اور شمالاً جنوباً تنگ ذیلی وادیوں کو جنم دیتے ہیں اور پھر خطِ سرحدی کے متوازی چلتے ہُوئے ایک ایسے نظام میں مجتمع ہو جاتے ہیں جسے بے شمار جگہوں پر ندیوں نالوں نے توڑ دیا ہے۔ پس سطحِ مرتفع کے راستے کھُلے ہیں اور کم و بیش گھاٹیوں اور اُونچائیوں کے مطابق متشکل ہیں جو پانی کے بہاؤ کی سمت نے تشکیل دی ہیں۔" ان کی تعداد کا اندازہ اس سے لگایا جا

سکتا ہے کہ ضلع ڈیرہ غازیخان سے جانے والے راستے نوّے سے زیادہ ہیں اور اِس سے ماورا سیوستان کے علاقہ کے سلسلہ میں ڈاکٹر ڈیوک نے کم از کم ترین راستوں کا حال بیان کیا ہے۔ یہ تمام بلوچوں کے قبضہ میں ہیں جو برائے نام آزادی کے ساتھ ہماری حکومت کے ماتحت ہیں اور اِن راستوں کی حفاظت، چوری شدہ مال کی بازیابی اور اپنے اپنے قبائلی علاقوں میں رکھوالی کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے بدلے کچھ الاؤنس لیتے ہیں۔

جنوب کی طرف سے شروع کریں تو مندرجہ ذیل درّے اہم ترین ہیں : (۱) سُوری درّہ مزاری علاقہ کے سرے سے شروع ہوتا ہے اور بگٹی مری علاقوں سے گذرتا ہے (۲) زنگی درّہ کوہ گندھاری سے گذر کر مری بگٹی علاقے میں جاتا ہے (۳) کچار اور کاہا درّے کھیترانوں اور لُونی پٹھانوں کے علاقوں میں جاتے ہیں - اوّل الذکر بہت اِستعمال ہوتا تھا اور اسی سے شہنشاہ جہانگیر ۱۶۰۱ء میں قندھار سے دہلی واپس آیا۔ (۴) راکھی نالہ کے پاس کا راستہ ڈیرہ غازیخان سے پشین تک نئی فوجی سڑک کے لئے چُنا گیا۔ یہ فورٹ منرو کے پاس خارمیدان کے اُوپر سے گذرتا ہے اور اب فوج کے ہر شعبہ کے لئے شاندار شاہراہ ہے۔ یہ راستہ اصل میں مشہور تر درّے کی شاخ ہے جو سخی سرور کی درگاہ کے پاس سے گذرتا ہے۔ بابر ۱۵۰۵ء میں اپنی ہندوستانی مہم کے بعد یہیں سے غزنی گیا تھا - بعد میں اسی راستے سے کابل کے حکمرانوں کے آم قندھار بھیجے جاتے تھے لیکن اِس کی شہرت زیادہ تر دامنِ کوہ میں واقع زیارت کی بدولت ہے۔ یہیں

۶۵۰ سال پہلے سیدی احمد نے خراسان سے دہلی جانیوالے اُونٹوں کی ٹانگیں درست کیں۔ ایک سوداگر کے اُونٹ کی ٹانگیں ٹوٹ گئی تھیں اور اُسے دہلی جاکر معلوم ہُوا کہ یہ ٹانگیں دو نوکی کیلوں سے ٹھیک کی گئی تھیں۔ بادشاہ وقت اِس کرامت سے اتنا متاثر ہُوا کہ اُس نے نقدی کے چار خچر بھر کر پُرکار سیدی کو بھیجے جن سے اُس نے زیارت تعمیر کروائی۔ اُس وقت سے لوگ اسے عطیات دیتے رہے ہیں۔ لاہور کے ہندو بنیوں نے سیڑھیاں بنوادیں۔ نادر شاہ اور درّانی شاہ زمان نے جواہرات نذر کئے اور کچھ سکھوں نے بابا نانک کی ایک مڑھی کا اضافہ کردیا۔ یہاں کے مجاور مشمولہ بہ مستورات و بچگان پُورے ۱،۶۵۰ ہیں اور زیارت کے خزانہ کی سالانہ آمدنی ان میں برابر برابر تقسیم کی جاتی ہے۔ ان لوگوں نے موجودہ وقتوں کے مطابق زر اندوزی کا ایک سہل طریقہ نکالا ہے۔ وہ اپنے موکلوں کے ذریعے امیر، با مروّت اور وضعدار معتقدین کے پاس ایسی ہُنڈیاں بھیج دیتے ہیں جو دیکھتے ہی واجب الادا ہوتی ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہندو اور مسلمان دونو اِس زیارت کے گرویدہ ہیں اور یہاں پہنچنے کے لئے بہت تگ و دَو کرنا پڑتی تھی۔ یہ ابھی دیکھنا باقی ہے کہ آیا نئی سڑک (جو سفر کو اتنا آسان بنا دے گی) اِس کی آمدنی میں اضافہ کرتی ہے یا نہیں (۶) اس سے اوپر ڈیرہ غازیخان کے مقابل درّہ وڈور ہے۔ یہ وادی دکھنی کے لئے بالکل سیدھا لیکن محروم آب رستہ ہے اور ابھائی کے پاس سے گذرتا ہے (۷) ساوری، شوری، مہوئی، سانگھڑ اور کاون درّے بُزدار، لونی پٹھان، موسیٰ خیل اور کاکڑ

علاقوں سے گذر کر وادیٔ ژوب میں جاتے ہیں۔ اِن میں سے اہم ترین سنگھڑ ہے، منگروٹھ کے بالمقابل اور جنرل چیمبرلین نے ۱۸۵۷ء میں بُزداروں کے خلاف مہم میں یہی راستہ استعمال کیا۔

پُرانے وقتوں سے اِنہی راستوں سے مردانِ کوہ اپنے باد رفتار گھوڑوں پر سوار یورش و یلغار کے لئے ایسے آتے تھے گویا (بزبانِ خود) "بھُوکے بھیڑیے بھیڑ خانہ یعنی میدان پر لپکتے ہوں"۔ گھنی اور لہراتی ہوئی داڑھیوں اور لمبے، گھونگھریالے بالوں کی سیاہ لٹوں (جو اُن کے کندھوں تک آتی تھیں اور جن کے اُوپر بھاری بھرکم پگڑیاں رسّے کی طرح لپیٹی ہوئی ہوتی تھیں) والے وحشت آثار لوگ! بڑے بڑے چغوں اور ڈھیلی ڈھالی شلواروں میں ملبوس جو اتنی میلی کچیلی ہوتیں کہ ان کا اصلی سفید رنگ غائب ہوتا! ان کی ڈھالیں اسی رنگ کے چار خانے سے کمر سے بندھی ہوئی ہوتیں اور ان کی پیٹیاں ایک پورے اسلحہ خانہ کا نمونہ پیش کرتیں! شاید وہ اصل میں اتنے خون آشام نہ ہوتے جتنے دیکھنے میں نظر آتے لیکن اِن میں سے ہر ایک میں غنیم کی اکڑ لازمی ہوتی! پوری جمعیت چھوٹی چھوٹی، دُبلی پتلی لیکن لچکدار اور کرڈیل گھوڑیوں پر سوار ہوتی! یہ آزمودہ کار گھوڑیاں ہوتی تھیں کیونکہ اُن کے مالک رات ہی رات کسی کھاتے پیتے گاؤں پر حملہ کرتے تھے اور صبح سے پہلے پہلے مویشی اور لوٹ کا مال لے کر گھروں کو واپس ہوتے تھے۔ یہ چاؤ ہمیشہ رومان سے مُعرّا نہیں ہوتے تھے کیونکہ سسّی اکیلی دوشیزہ نہ تھی جو سرحد پار محبت کی نشانیوں کا تبادلہ کرتی تھی اور جس کا تصوّر گھبرو بلوچ پر مرکوز ہوتا تھا اور نہ ہی پنہل خان

واحد شہرہ آفاق 'چور' تھا جس کا دِل حُور میدانی کے لئے دھڑکتا تھا یا جس کے
حملے کا مقصد محض اُونٹ، بکریاں اور دیہاتی ساز و سامان سے زیادہ نہروں کے
پاس کی جھونپڑیوں کی باسی حسین ترین دوشیزہ نہ ہوتا تھا۔ ایک دوشیزہ کے
اغوا کا قصّہ ایک عوامی داستان کا موضوع ہے جس میں اُسے ایک فاختہ،
چال میں مورنی اور لطافت میں دُھند کا بادل بتایا گیا ہے۔ اُس کی زلفیں
جیسے بیل کے جھنڈے لیکن جب فرار کا سوال آیا تو اُس پری پیکر کا عزم کوہ پیکر
ثابت ہُوا۔ اُس نے کہا۔ "مَیں اپنی ماں سے کیسے جُدا ہو سکتی ہوں، کیونکہ
میرا باپ تو لعن طعن سے اُسے مار دے گا؟" لیکن لیٹرے کے پاس
ٹھہرنے اور جواب دینے کا وقت کہاں؟

"پھر مَیں نے اُس کے کومل، لچکیلے جسم کو بازوؤں میں جکڑا
اور پگڑی کے سِرے سے اُس کا مُنہ بند کر دیا؛
وہ ایسے تڑپی جیسے ایک برہ شیر کے جبڑے میں
لیکن جلد ہی اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا؛"

اور پھر درّے کے سنگلاخ راستوں سے بحفاظت واپس پہنچ کر اور
لُوٹ کا مال تقسیم کر کے وہ اعلان کرتا ہے:

"میری دُلہن کو صرف مجھی سے چَین ملتا تھا
وہ اپنی ماں، ہمجولیوں اور سہیلیوں سب کو بھول گئی
کیونکہ اب وہ ایک دِلرُبا بچّے کو کُولھے پر اٹھائے ہُوئے چلتی ہے۔"

لیکن اکثر درّوں کی دشواریوں کا جب تجزیہ کیا جائے تو وہ کافی حد تک کافور

ہو جاتی ہیں جیسے مادی و اخلاقی مسائل (جو ہنوز حل طلب ہوں) تجزیئے کے تحت گرفت میں آجاتے ہیں۔ میدانوں کی طرف پانی کے نکاس کی تنگ گھاٹیاں اور ان کا سنگلاخ پن واقعی یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ ان سے پرے مشکلات عظیم تر ہوں گی اور وحشی قبائل کا مزاج واقعی خطرات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے۔ کسی عجیب و غریب اثر کے تحت بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ پہاڑ جتنے عریاں، چٹانی اور ناقابلِ عبور ہوں گے علاقہ اتنا ہی بدتر اور چٹیل ہوگا اور اس کے باشندے اتنے ہی کثیر التعداد اور مقاتلہ پسند ہوں گے۔ ان دونوں میں سے ایک ممکن ہے لیکن دونوں نہیں، لیکن تجربے نے ان دونوں میں مبالغہ کی رنگ آمیزی ثابت کی ہے۔ عموماً درّے اتنے ہی مشکل ہیں جتنے وہ نامعلوم ہیں۔ افسوس کہ ان کے بدترین خد و خال ہندوستان کی طرف نظر آتے ہیں۔ پہلا مشکل سلسلہ پار کر لیں تو نسبتاً زرخیز وادیاں (جنہیں مقامی طور پر شم کہتے ہیں) نمودار ہوتی ہیں اور آمد و رفت کے راستے بھی کشادہ ہو جاتے ہیں۔ سنگلاخ سلیمان کی ڈھلانیں بھی مغرب کی طرف ہلکی پڑ جاتی ہیں۔ مہیب ترین مشکلات پشین روڈ بناتے ہوئے وہاں پیش آئیں جہاں فورٹ منرو کے سینی ٹوریم تک رکھنی نالہ کی آمد آمد ہوتی ہے۔ مغرب کی طرف اترائی آسان ڈھلانوں کے ذریعہ گھاس آلود نشیبوں کے اوپر سے ہوتی ہے۔ چنانچہ وادی رکھنی میں اتنی عمدہ گھاس اور اتنا نفیس شکار ہوتا ہے جو شاید ہی ضلع ڈیرہ غازی خان میں کہیں اور ملے اور کافی فاصلے تک چھکڑے کے لئے اچھی سڑک آسانی سے بن گئی۔ بلوچستان و افغانستان کے بیشتر حصے

کی طرح پانی کی قلت ہے لیکن یہ بھی کافی حد تک ایک نظامِ آب اندوزی سے دور ہو جائے گی۔ آبپاشی کا انتظام ہو تو یہ علاقہ پُر بہار اور گل و گلزار بن سکتا ہے۔ اب بھی کئی چشمے بہت دلفریب ہیں اور کئی قطعے گھاس کے ہرے بھرے تختے ہیں۔ پوری وادی کھیتران اسپ پروری کے لئے مشہور ہے۔ وادی پنیالی بھی اِس کے امکانات سے مملو ہے۔ گمبذ کے پاس تین چار رسالہ پلٹنوں کے لئے لکڑی اور گھاس موجود ہے اور جنگی مشقوں کا شاندار میدان بھی۔ وادی سمالن خوبصورت اور پیداور ہے۔ کوئی ۵۰۰۰ فٹ بلند ہے اور پانی اور رسد وافر ہیں۔ وادی بوری میں لورالائی کی نئی چھاؤنی تجویز کی گئی ہے۔ اِس کے اور ژوب کے درمیان پہاڑیاں نفوذ پذیر ہیں اور موخر الذکر وادی کچھ فاصلے تک تو چودہ میل چوڑی ہے۔ اِن وادیوں کے شمال کی طرف چھان بین کی جائے تو علاقہ اور بھی سازگار نکلتا ہے۔ کوئٹہ اور اس کی ملحقہ وادیاں مدتوں سے مشہور ہیں اور ایسے ہی مستونگ کے تربوز اور انگور؛ بعض پہاڑی پہلوؤں کی خصوصیات جنوبی اطالیہ سے ملتی جلتی ہیں اور اگر انگور کی بیلیں ہوں تو اسی کی تشبیہ بن سکتی ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ انگور کی بیلیں نہ ہوں؟

چھٹا باب

بلوچ قبائل

خواہ بلوچ نسل بغداد و مکران کے راستے حلب سے آئی ہو، خواہ بقول بعض اس کا تعلق یہودیوں سے ہو، خواہ یہ ترکمان الاصل ہو (جن سے یہ کئی باتوں میں مشترک ہے) اور خواہ (اور زیادہ اغلباً) یہ ایک ملغوبہ ہو اصلی باشندوں اور نو وارد یہودی، عرب، ترکمان عناصر اور سکندر کے حملہ سے لے کر بعد کے حملہ آوروں کے باقیات کا۔ اس کے قبائلی حصے اتنے وسیع ہیں کہ ان سب پر حاوی ہو سکتے ہیں۔ وہ یہودیوں سے یوں مشابہ ہیں کہ تمام بنو اسرائیل صحرائے سینائی میں بکھرتے تو بھی ایسا پیچیدہ نسلی مسئلہ پیدا نہ ہوتا اور انہوں نے اپنی وراثت کو ایسی باریکی سے تقسیم کیا ہے کہ شاید وہ سرزمین کنعان کو ایسے تقسیم نہ کر سکے۔

قبائل کے باقاعدہ شمار کے لئے اوّل تو قبائے موسوی کی ضرورت ہوگی اور ثانیاً عام قارئین کو شاید ہی ان کے بے شمار ناموں کے سلسلے سمجھنے کا حوصلہ ہو جن کے مقابلے پر عہد نامۂ قدیم کے دو ابواب کی اوّلیں کتاب بھی ہیچ ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ کثیر التعداد قبائل یا تمن تو صرف نقطۂ آغاز ہیں! یہ تمن پاڑوں میں تقسیم ہیں، پاڑے پھلوں میں اور پھلیاں مزید اکائیوں میں اور ہر اکائی

ایک سربراہ کے ماتحت ہے جس کے پیرو اکثر و بیشتر مٹھی بھر ہوتے ہیں مثلاً گورچانیوں کے گیارہ پاڑے ہیں اور اکاسی پھلیاں، بگٹیوں کے چھ پاڑے اور چوالیس پھلیاں، مزاریوں کے چار پاڑے اور ستاون پھلیاں، حالانکہ ان میں سے کوئی بھی دو ڈھائی ہزار سے زیادہ جنگ آزما میدان میں نہیں لا سکتا اور وہ بھی اُس وقت جب چودہ سالہ نوجوانوں کو بھی بھرتی کر لیا جائے۔ اِس کے برعکس یہودیوں کے ہاں بیس سال کی عمر میں بھرتی ہوتی تھی۔ اِس کے علاوہ بلوچوں کی ایک راسخ عادت یہ ہے کہ وہ ایک ہی نام کو ادلتے بدلتے رہتے ہیں مثلاً ڈیرہ غازی خان کی بنیاد کوئی ۰۰۴ سال پہلے حاجی خان نے رکھی جس کے ہاں غازی خان پیدا ہوا اور اُس نے قصبہ اُسی کے نام سے موسوم کر دیا۔ غازی خان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا تو اُس نے اس کا نام حاجی خان رکھا اور یوں پندرہ نسلوں تک یہ دو نو جدی نام بالترتیب یکے بعد دیگرے جاری رہے حتیٰ کہ لوگوں نے تنگ آ کر اِس پورے علاقہ کو حاجی غازی پکارنا شروع کر دیا جو واقعی جامع نام تھا۔ قدیم دَور کی اسکاچستانی پہاڑیوں کی طرح یہاں بھی ہر وادی اور دامنِ کوہ اپنے قبیلہ پر فخر کرتا ہے جو ایک چھوٹے سے آزاد سردار کے تحت ہوتا ہے لیکن زیادہ طاقتور قبائلی سرداروں کی بالادستی تسلیم کرتا ہے۔ ہماری آمد سے پہلے ان مقامی قبائل اور اُن کے ملوک کا اہم پیشہ ہمسایوں سے جنگ و جدل اور اُن کے مویشیوں کی چوری تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک اوسط بلوچ کو بون گالٹیئر کے فرانسیسی منظوم قصہ کے مطالعہ سے بہت اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ صرف نام تھوڑے سے بدل دیے جائیں تو میکفرسن (جس کے

ساتھ چوبیس جنگجو اور پینتیس پا پیادہ ہوتے تھے) کے حملے کی کہانی میں مری بگٹی پہاڑیوں کی سیاست پر منطبق ہو جاتی ہے۔ اکثر چھاپوں میں تھوڑے سے لڑتے تھے اور زیادہ مویشی ہانکتے تھے اور چند اموات اُس وقت ہوتی تھیں جب مدافعین کا جتھا مقابلے پر نکل آتا تھا۔ ٹیک مری

'اپنے جتھوں کے ساتھ آتا ہوا

جن میں تہتر لڑاکے اور ساٹھ غلام (جاں نثار) ہوتے تھے"

جیکب آباد اور سبی ریلوے کے شمالی رُخ پر اہم تر قبائل (جو ہماری پُرانی بلوچ سرحد تھے کیونکہ پشین پر قبضہ کے بعد اب وہ ہمارے عقب میں رہ گئے ہیں) خالص برطانوی علاقوں میں بھی زمینوں کے مالک ہیں۔ ان میں مزاری دریشک، بگٹی، گورچانی، لغاری، کھوسے، لُنڈ، بُزدار اور قیصرانی شامل ہیں۔ ان سے پرے کی پہاڑیوں میں مری، کھیتران، کُونی پٹھان اور موسیٰ خیل ہیں۔ اس سے بھی آگے ہرنائی، تھل چوٹیالی اور پشین ہیں۔ ان اضلاع میں ترین دُمڑ اور کافی علاقے پر بکھرے ہوئے کاکڑ ہیں۔ چند مستثنیات کے سوا سب بلوچ ہیں یا (نسلی فرق کے باوجود) ان سے مربوط و منسلک ہیں۔ مزاری (جن کا نام ایک سیستانی ندی مزار یا لفظ مزار بمعنی شیر سے ماخوذ بتلایا جاتا ہے) سندھ کی سرحد سے مٹھن کوٹ تک حاوی اور اہم ترین ہیں اور اضافہ پذیر ہیں۔ یہ غالباً ...۲۰۰۰ جنگ آزما میدان میں لا سکتے ہیں اور زیادہ تر برطانوی علاقے میں رہتے ہیں جہاں ان کے بہت سے گاؤں ہیں۔ ابتدائی دنوں میں الفنسٹن کے مطابق یہ دریائے سندھ پر ڈاکے مارتے تھے اور

قزاقی میں مانے ہوئے تھے۔ وہ چوطرفہ اپنے ہمسایوں سے برسرِ پیکار رہتے تھے اور خطۂ سرحدی کے چالاک ترین مویشی چور سمجھے جاتے تھے۔ الحاق (۱۸۴۹) سے انہوں نے کوئی تکلیف نہیں دی۔ اب وہ اچھے کاشتکار نہیں ہیں اور گرمی میں دریا کے کناروں پر اور سردی میں پست پہاڑوں میں ریوڑ چرانا پسند کرتے ہیں لیکن اب وہ پُرامن اور باوفا رعایا بن گئے ہیں اور ان کا سردار کچھ عرصہ پہلے "ممتاز وفاداری اور خدماتِ جلیلہ" کے بدلے نواب بنا دیا گیا۔ ان کے ہمسائے اور پُرانے دشمن درکشک (جن کا نام غالباً انہی پہاڑیوں کی ایک ندی "درخین" سے ماخوذ ہے) اب یہاں کسی ملکیت کے مالک نہیں۔ گورچانی (یا بقول ان کے گورلیشانی) کسی حد تک دو نسلے بلوچ ہیں جو اپنا حسب و نسب سندھ کے ایک نومسلم ہندو راجہ سے ملاتے ہیں۔ ان کے پاس مری اور دراگل پہاڑیوں کا بیشتر حصہ ہے لیکن وہ ان پر قابض و قادر نہیں کہلا سکتے۔ مریوں کے ساتھ مستقل رزم و پیکار نے ان کی ماورائے سرحد زمینوں کو آبرستانی جاگیر سے بھی کم نفع بخش بنا دیا۔ ان کا ایک سردار ۱۵۵۶ء میں دہلی پر ہمایوں کے قبضہ میں بھی شریک تھا۔ دیگر سکھوں سے مسلسل لڑتے بھڑتے رہے، شرقی سندھ کے علاقوں کو لگاتار تاخت و تاراج کرتے رہے اور الحاقِ پنجاب کے وقت "بدترین بلوچ قبیلہ" سمجھے جاتے تھے۔ اب وہ غالباً صرف ہماری موجودگی کی وجہ سے متصلہ لغاریوں پر دست اندازی نہیں کرتے لیکن اب وہ پورے قابو میں ہیں اور ان کا رویہ عام طور پر اچھا ہے۔ لغاری، درّہ سخی سرور کے پاس ایک طاقت ور قبیلہ ہیں اور کھوسوں، لنڈ اور قیصرانیوں کی طرح تاربین اور چاکر کی

تجارت کرنے کی وجہ سے جفاکش ہیں۔ ان کے بہت سے مقدّم نہر سازی میں مصروف ہو گئے ہیں، بڑی بڑی زمینیں جائدادیں حاصل کر چکے ہیں، آنریری مجسٹریٹ بن گئے ہیں اور اب سماجی نظم و ضبط کے پختہ ترین حامی ہیں۔ راجن پور سرحد پر چٹانی اور بنجر علاقوں کے بگٹیوں اور منگھروٹھ کے مقابل پہاڑیوں کے بزداروں نے کبھی کبھی سر اُٹھایا ہے اور اوّل الذکر کا تو شاہکار ہے کہ ایک حملہ سندھ میں وہ ۱۵،... مویشی اُڑا لائے لیکن دونو کو خوب سبق سکھایا گیا اور دونو نے عبرت حاصل کر لی۔ مری بھی مسلسل اور بلا امتیاز چھاپے مارتے رہتے تھے اور وہ کئی لحاظ سے اہم ترین ہیں لیکن اب بھی وہ بگٹیوں اور بزداروں کی طرح ہمارے حلیف ہیں۔

کسی آدمی کا مری ہونا ہی اُس کے لئے کلنک کا ٹیکہ ہے خواہ وہ اچھا ہی کیوں نہ ہو۔ مری کو نہ صرف چوری اور ڈکیتی کا عادی مجرم سمجھا جاتا ہے بلکہ وہ ساتوں گناہ ہائے کبیرہ کی طرف بھی ہر وقت مائل رہتا ہے (یہ گُناہ تکبّر، نفسانیت، حسد، غصّہ، حرص، بسیار خوری اور کاہلی ہیں۔ مترجم) اُس کا کردار اُسی کی کہاوت سے عیاں ہو جاتا ہے جو ڈیوک نے قبیلہ کی دلچسپ تاریخ کا بیان کرتے ہوئے نقل کی ہے۔ مری کہتا ہے: "ہم اپنے ہمسایوں کے دشمن ہیں، ہم کسی سے اچھائی نہیں کرتے؟ کوئی ہمارا بھلا نہیں چاہتا لہٰذا ہمیں اردگرد کی افراتفری کو ہوا دینی چاہیئے۔ ہمیں ایسے ہمسائے کو راہ دینی چاہیئے جو کسی اور کو گزند پہنچانا چاہتا ہو۔ کوئی بھی زخمی ہو یا تباہ، ہمیں کیا سروکار۔ ہماری تو ہر صورت میں پانچوں گھی میں ہیں"۔ گو وہ اِس مقولے پر عمل کرتا ہے تاہم اُس میں کچھ خوبیاں بھی ہیں۔ وہ مسافر یا تاجر سے بے دھڑک پیسے بٹورتا ہے لیکن اپنے ضابطۂ اخلاق

پرسختی سے کاربند رہتا ہے۔ خفیہ رشوت کے لئے ایک انگوٹھی یا نشانی مزید حفاظت وسلامتی کی ضمانت سمجھی جاتی ہے اور اگر کوئی دوسرا اس قول و قرار کو توڑ دے تو وہ بھی بھر کر اس سے بدلہ لیتا ہے۔

اگرچہ عموماً یہ قبیلہ براہوئی بلوچ سمجھا جاتا ہے پھر بھی کبھی کبھار اُسے پٹھان بتایا جاتا ہے اور کچھ پاڑے مری بلوچی کی بجائے سامی پشتو زیادہ رواں بولتے ہیں۔ اصل میں یہ لوگ مختلف اقوام و ملل کے عناصر کا مجموعہ ہے جو بلوچ نسل سے پیوند کئے گئے ہیں۔ وہ برائے نام خان قلات کے وفادار ہیں لیکن اسے کوئی مالیہ نہیں دیتے، من مانیاں کرتے ہیں اور ہمارے علاقے کی طرح اس کا علاقہ بھی لوٹتے ہیں۔ تین بڑے حصوں میں کم از کم اٹھارہ پاڑے ہیں جن میں چار پانچ ہزار جنگ آزما ہیں جو ہمسایہ قبائل کو خوفزدہ رکھتے تھے۔ ڈیوک کے مطابق بندہ قلات کے مریوں کو منہا کر کے وہ ۲،۵۰۰ مردوں سے کچھ زیادہ ہیں۔ لوٹ مار کا پیشہ تو دلکش ہے لیکن نفع بخش اور محفوظ نہیں ہے۔ مریوں نے بہت سے دشمن بنائے ہیں، گردشِ ایام کا شکار ہیں اور تادیبی کارروائیوں نے انہیں اَدھ موا کر دیا ہے۔ مجموعی طور پر ان کے ہمارے ساتھ حالیہ تعلقات تسلی بخش رہے ہیں۔ لوٹ مار کے شوق نے پیچھا نہیں چھوڑا، اسی لئے میوند شکست کے بعد اُنہوں نے سبّی میں ہمارے کارندوں پر حملہ کر کے بعض کلرک اور قلی مار دیئے جس پر سر چارلس میک گریگر کے تحت مہم بھیجی گئی۔ لیکن ہمارے سیاسی عمال کی احتیاط، عزم بالجزم اور موقعہ شناسی نے ان کی بداعمالیوں کو اب ایک قصہ پارینہ بنا دیا ہے۔ فورٹ منرو کے عین نیچے کے کھیتران، اگلی وادی کے لونی اور

مزید آگے کے موسیٰ خیل سب پٹھان ہیں۔ اول الذکر کا معنی کاشت کار ہے اور وہ غالباً ایک جاٹ نسل پر پٹھان پیوند ہیں۔ وہ سندھی اور پنجابی کی درمیانی زبان (سرائیکی۔ مترجم) بولتے ہیں۔ ابھی تک کچھ ہندو رسومات کے قائل ہیں اور اچھے محنتی اور زراعت پسند ہیں۔ وہ پُرامن اور غیر جارحانہ ہیں اور چور نہیں لیکن مری ہمسایوں کی وجہ سے انہیں پناہ دینے کی وجہ سے بدنام ہیں۔ لُونی رکھنی سے بوری وادی تک پھیلے ہوئے ہیں لیکن مریوں کے ساتھ جنگ و جدل کی وجہ سے اتنے کمزور ہو گئے ہیں کہ ان کی پانچ عمدہ وادیاں (جن سے نئی پشین رود گزرتی ہے) اب بے آباد ہیں اور بُر (ویران) بن چکی ہیں اور اُن کے ریوڑ اصل علاقے کے صرف پانچویں حصے تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ چند سال پہلے تک وہ گرشُ غول میں تھے لیکن وہ اچھے انسان ہیں اور نمائشی زرہ بکتر اور مزین و مشین نیزوں کے کچھ شوقین ہیں اور بہترین سپاہی بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ موسیٰ خیل روایتاً کاکڑ ہیں جنہوں نے قندھار و ہرات کے درمیان کہیں واقع اپنا وطن چھوڑا اور موسیٰ کے تحت نئی چراگاہوں کی تلاش میں نکلے اور تخت کی ڈھلانوں پر آباد ہو گئے۔ یہاں سے کوئی اسی سال پہلے اُنہیں نکال دیا گیا اور وہ ژوب ندی کے وسیع علاقے پر منتقل ہو گئے ہیں۔ وہ بھی زیادہ تر چرواہے ہیں، ہمارے افسروں کے دوستدار ہیں بشرطیکہ فاصلہ اور حجاب قائم رہے۔

میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ میں اُن قبائل کے متعلق کچھ بتاؤں جو بلوچستان و افغانستان کے درمیان ہنوز تصفیہ طلب زمین کے باسی ہیں اور

جن سے نئی ریلوے لائن اور سڑک آئے دن ہمارا تعلق قریب کرتی جا رہی ہے۔ یہ تھل چوٹیالی کے حسین ترین، دُمڑ اور سنگن وادی کے پانی (جو بابر کے وقت مشہور قسمت آزما تھے) اور دیگر کئی پٹھان عناصر ہیں۔ تعداد، طاقت اور پھیلاؤ کے لحاظ سے اہم ترین کاکڑ ہیں جن کے بہت سے قبائل ہیں اور جو بسا اوقات صرف مشترک نام کی وجہ سے متحد ہیں۔ یہ ہرنائی سے وادی ژوب اور تخت سے ریگستان (پشین سے ماوراء) تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے تین مشہور ترین قبائل پانیزئی، سارنگ زئی اور حمزہ زئی ہیں لیکن ان کا کوئی جرگہ بھی نہیں لہٰذا ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ ان کے بعض سردار بے حد جنگجو تھے لہٰذا بلوچ مدتوں ان سے قومی جنگ لڑتے رہے۔ الفنسٹن نے ایک معرکے کا ذکر کیا ہے جس میں آٹھ نو سو براہوئی بلوچ خُلز گھاٹی میں پھنس گئے اور گاجر مولی کی طرح کاٹ دیئے گئے، قریباً وہیں جہاں سے جنوبی افغان مہم کے دوران کاکڑوں نے ہمارے فوجیوں پر پتھر لڑھکائے تھے۔ اسی قبیلے نے ۱۸۸۰ء میں کیپٹن شاورز کو آئند پسلی درے میں مار ڈالا اور اب بھی وادی ژوب کے بعض حصے ہمیں تنگ کرتے ہیں۔ کرنل (اب سر جیمز) براؤن کو لارڈ لٹن نے ۱۸۷۰ء میں ان پر خصوصی رپورٹ مرتب کرنے پر مامور کیا اور غالباً ان کے متعلق کافی دلچسپ معلومات شملہ کے محافظ خانہ میں مقفل ہیں۔ مریوں کے ساتھ جو کچھ کیا گیا ہے وہی کاکڑوں کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ علاقہ بے نقاب کیا جائے، مواصلات قائم ہوں اور پالیسی دوستانہ لیکن مصمم ہو۔ اگر ہماری فوجیں ڈیرہ اسمٰعیل خان سے پشین تک وادی ژوب اور

درہ گومل کے راستے آتی جاتی رہیں تو یہ بہترین ابتدا ہوگی۔ یہ تجویز عرصہ سے موضوعِ بحث بنی رہی ہے اور اب حکومت اِس کی قائل بلکہ اِس پر مُصِر ہے۔

ان علاقوں کو آزادانہ آمدورفت، اچھی سڑکوں اور موقعہ شناس اور اہل الرائے برطانوی افسروں کے ذریعے روشنی اور تہذیب کے دائرے میں لانے کے فوائد ہمارے زیرِ اثر بلوچوں اور آزاد قبائلیوں کے مقابلہ سے اظہر من الشمس ہو جاتے ہیں۔ یہ مقابلہ حیرت انگیز نتائج بتاتا ہے، ایک صاف طور پر خوش شکل اور شاداں و فرحاں نظر آتا ہے، عمدہ لباس پہنتا ہے۔ ایک اچھی گھوڑی (چاروں ٹانگوں کا بلا شرکت غیرے مالک) پر سوار ہوتا ہے، کھاتا پیتا ہے اور خوشحال معلوم ہوتا ہے۔ اِس کے دیہات ترقی پذیر اور گنجان آباد ہیں۔ دوسرا سوکھا سڑا، بھوکا، بمشکل گذارہ کرتا ہے، اُس کا لباس چند غلیظ چیتھڑوں یا بھیڑ کی پھٹی ہوئی کھال پر مشتمل ہے اور وہ ہمیشہ اپنے جان و مال کے خوف میں مبتلا رہتا ہے گویا اُس کا ان پر کوئی حق نہیں۔ اُس کا گھر اکثر کھیت میں ایک گول مینار ہے جس میں وہ ایک زینے سے چڑھتا ہے اور اسے اُوپر کھینچ لیتا ہے کبھی کبھار وہ اسے بھی چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے کیونکہ یہ گاؤں سے بہت دُور ہوتا ہے۔ اگر وہ خود چھاپہ نہ مار رہا ہو اور نہ اُس پر چھاپہ پڑ رہا ہو پھر وہ چھاپہ ماروں کے شبخون اور چپاؤ کے خوف سے ہر وقت چوکنا رہتا ہے کیونکہ یہ اسے جانوروں سے محروم کر دیتے ہیں اور کبھی تو گھر والوں کو بھی مار ڈالتے ہیں۔ چپاؤ ایک منظم چھاپہ کے لئے بلوچ اصطلاح ہے اور کسی وقت سردار کی آمدنی کا جزوِ اعظم یہی تھا کیونکہ کُل لُوٹ کا پانچواں حصہ اُسے ملتا تھا جو کافی گراں بہا

ہوتا تھا۔ ایک حصّہ پیادے کا، گھوڑ سوار کے لئے ایک مزید حصّہ (یا اس کی ملاکر ٹانگوں کے مطابق)، آدھا حصّہ بندوق کے لئے اور اگر وہ مارا جاتا تو اس کا حصّہ اس کے وابستگانِ دامن کو مل جاتا۔ قبائلی مقدم کو نسبتاً بہتر حصّہ ملتا۔ سارے لوٹے ہوئے مال کی نہایت احتیاط سے ایک باقاعدہ پیمانے کے مطابق قیمت لگائی جاتی جو عموماً بیلوں کی صورت میں ہوتی تھی۔ ایک گھوڑی چار گائے کے برابر، ایک بندوق ایک بیل کے مساوی اور ایک تلوار آدھے بیل کے برابر شمار ہوتی۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔

لیکن ایک کامیاب چھاپہ بھی بہت نفع آور سودا نہیں ہے۔ جارحین کے لئے بھی اتنی ہی مشکلات تھیں جتنی مدافعین کے لئے۔ آرام تو ان کی قسمت میں نہ تھا اور اگر کوئی اتفاقاً جھگڑ بیٹھتا یا پیچھے رہ جاتا تو وہ فوراً قتل کر دیا جاتا یا معذور بنا دیا جاتا۔ یہ بالکل وہی بات تھی کہ جو پیچھے رہ جائے وہ جہنم میں جائے۔ فرائر نے کیا خوب نقشہ کھینچا ہے: "چپاؤ کے افراد رات بھر طویل سفر کرتے ہیں اور دن کو چھپے رہتے ہیں۔ اُن کے پاس خوراک نہیں ہوتی بلکہ صرف آٹا ہوتا ہے لیکن وہ اسے پکانے کے لئے آگ جلانے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ اگر وہ خود ہی کسی کمین گاہ میں پھنس جاتے ہیں یا مدافعین کو اتنا چاق و چوبند پاتے ہیں کہ حملے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" اُس نے مرلیوں کے ایک گروہ کی مثال دی ہے جو اُسے لونی چھاؤنی پر حملہ کر کے واپس آتے ہوئے ملا۔ وہ نیم فاقہ زدہ تھے، تین ہفتوں کے رت جگے نے بُری طرح تھکے ہوئے تھے اور سالار کا حصّہ نکال کر انہیں لوٹ کا صرف اتنا حصّہ ملا جو فی کس ایک تہائی بیل کے برابر تھا لہٰذا لوٹ مار کی یہ آزادی بے معنی ہے!

ساتواں باب

کوہِ سلیمان اور سندھ کے صوفیائے کرام

ماورائے سندھ کی ایک مقبول کہاوت ہے: "خدا ہم پر سیدوں اور ملاؤں کو مسلط نہ کرے"۔ لیکن غرب دریا کے مسلمانوں میں شرق دریا کے ہندوؤں کی نسبت توہم پرستی کہیں زیادہ ہے۔ موخر الذکر اپنے مقدس برہمن کو دو کوڑی کا نہیں سمجھتا لیکن اوّل الذکر اپنے پیر و مرشد کی کفش برداری کرتا ہے۔ درجوں میں تفاوت ضرور ہے۔ آزاد بلوچی بے حد زود اعتماد ہونے کے باوجود پٹھان کے مقابلے پر قریباً لا اعتقاد ہے لیکن اس کے برعکس ریاکار بنوچی بزبان ایڈورڈز "پرلے درجے کی جعلسازی کو کرامت اور لنڈے منڈے فقیر کو ولی سمجھتا ہے"۔ لیکن سرحدی قبائل میں جتنا بھی جذبۂ احترام و عقیدت ہے وہ سارا اولیاً اور زیارتوں پر مرکوز ہے اور اس سلسلے میں اس کی زود اعتمادی اس بے پناہ حد تک ہے کہ وہ جعلی کرامات پر فوراً ایمان لے آتا ہے۔ کوہِ سلیمان کا سارا علاقہ ایسے ہی لوگوں کا مسکن و مامن ہے۔ شاید ہی کوئی درہ یا چوٹی یا ڈھیری ہو گی جس سے کوئی روایت یا مقبرہ یا زیارت منسوب نہ ہو خواہ بظاہر وہاں چند چیتھڑوں یا پتھروں کی ڈھیری کے سوا کچھ بھی نہ ہو۔ شاید (فرائر کے خیال میں) اس کی وجہ علاقے کی غیر دلکشی ہو جس میں بہت سی جگہیں ایسی

ہیں جو نفس کشوں اور تپسیا کاروں کے لئے موزوں ترین ہوں یا زیادہ اغلباً اس حقیقت کا نتیجہ ہو کہ کئی صدیوں تک سلسلۂ سلیمان مسلمان لشکروں، اولیأ اور سپاہیوں کے لئے یکساں طور پر قدرتی آرام گاہ بنا رہا۔ مذہبی سلسلوں کے بانی دہلی یا پٹنہ کی بجائے زیادہ تر بخارا یا بغداد سے برآمد ہوئے۔ اولیائے کرام، صوفیائے عظام اور اقطاب اسلام گکھڑوں یا سکھوں میں پھل پھول نہ سکتے تھے اور اوسط پنجابی جاٹ عادتاً مذہبی نصیحت و قیادت کو پسند نہیں کرتا۔

جیسے سرحد کی تاریخ دیو مالائی شجرات نسب سے بھری پڑی ہے، ایسے ہی ان کی روایات علمأ و سادات و اولیا کے اقوال و افعال سے مملو ہیں۔ وہ زندگی کے اکثر روابط میں بالادست اور لوگوں کی ضروریات کے سلسلے میں سر فہرست ہیں۔ اس بنجر اور سنگلاخ علاقے میں خورونوش کی مہیب ترین قلت ہے۔ نمونۂ زہد و اتقا اور کشادہ دست، شیخ اسماعیل سڑبنی (جن کا مزار کوہ سلیمان پر ہے) سخت پرہیزگاری کے باوجود ۴۰۰ بھیڑیں روزانہ مسافروں کے لئے ذبح کرتے تھے۔ شام کو ان کے سر، اعضأ اور کھالیں اکٹھی کر لی جاتی تھیں اور ہر صبح چرواہے کا ریوڑ زندہ ہوتا تھا اور وہ اسے چرنے کے لئے ہانک کر لے جاتا تھا۔ ایسے ہی پچاس فاقہ زدہ مسافر یک لخت 'مرجع انام و مرقع دانش' شیخ ملھی کتی کے پاس آتے ہیں۔ گھر میں کچھ نہیں لیکن وہ اللہ کا نام لے کر ایک برتن میں پانی بھرتے ہیں، اسے آگ پر رکھتے ہیں، کمہار سے مٹی کی پلیٹ منگواتے ہیں اور اپنے پاک ہاتھوں سے اپنے مہمانوں کو پیٹ بھر کر کھانا کھلاتے ہیں اور پھر بھی کھانا ختم نہیں ہوتا۔ وقائع نعمت اللہ رقمطراز ہے:

"اور وہ پلیٹ آج بھی اُن کے جانشینوں کے پاس محفوظ ہے۔" شرق تخت کے
قبائل کو قلّتِ آب کا سامنا رہتا ہے لیکن غرب تخت والوں کے پاس پانی
با افراط ہے لہٰذا ایک صاحب حقیقت و طریقت نے پہاڑیں سے سیدھا
راستہ پیدا کیا اور ان لوگوں کے لئے دراہن ندی بہنے لگی۔ ندی موجود ہے، گو
اس میں پانی پہلے کی نسبت کم ہے کیونکہ 'نیستانِ توحید کے ایک (دوسرے) شیر'
شیخ دانا نے اس کا کچھ پانی اپنے ایک منظورِ نظر قبیلے کی طرف منتقل کر دیا۔
ایک اور مشکل دریائے سندھ کو قابو میں رکھنا تھی' اور ہے۔ ایک دفعہ یہ
کناروں سے اُچھلا، گاؤں کا بہترین حصّہ بہا کر لے گیا اور بے پناہ نقصان کرتا لیکن
لوگ فوراً 'مُلّانِ ایمان و امام المتقین' یحیٰے بختیار کے پاس آئے اور اُنہوں نے
ایک واحد ٹائل سے ہی کامیاب پُشتہ کھڑا کر دیا جسے وہ دورانِ غسل اپنا مبارک
پاؤں کیچڑ سے محفوظ رکھنے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ دھارا رُک گیا اور اس
سے آگے گذرنے کی جُرأت نہ کر سکا۔ اس ولی پر انوارِ الٰہیہ بکثرت تھے۔ اس
نے کم سنی میں ماہِ رمضان کے روزے رکھے تھے، نمازِ جمعہ ہمیشہ مکّہ معظمہ میں
ادا کرتے تھے اور ایک دفعہ ایسا ذکر جلی کیا کہ دل مُنہ سے باہر نکل آیا اور مُریدانِ
باصفا نے اسے دستِ پاک میں سنبھال کر رکھا۔ جب کبھی اُنہیں اپنے مُریدوں
کو کھلانا پلانا ہوتا تو ایک ہرن خود بخود جلتی ہوئی آگ کے پاس آجاتا۔ ایسے ہی
ایک شیر آیا لیکن اُنہیں دیکھ کر مرعوب ہو گیا اور صرف ایک ہڈی لے کر چلتا بنا۔
دریا کے کشتی بانوں نے خواجہ سے کرایہ مانگا تو ایک مچھلی نے سر باہر نکالا اور
ادائیگی کر دی۔ جب وہ خود اور مرید ایک پہاڑ میں پیاسے ہوئے تو انہوں نے

اپنی مسواک موسیٰ کی طرح ایک خشک چٹان پر ماری اور تازہ پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا جو آج بھی جاری و ساری ہے۔ اور پھر جب تیمور اعظم ایک مہم پر ملتان آیا جہاں کئی افغان قبیلے پناہ گزین ہوئے تھے تو خواجہ اور مرید دامنِ کوہ میں رہے اور غنیم کے آتے ہی خواجہ نے کچھ قرآنی آیات پڑھ کر مٹھی بھر مٹی دشمنوں پر پھینک دی جو اُن کے اور فوج کے درمیان پردہ بن گئی اور مغل سپاہی اندھے ہو گئے اور ایک لشکرِ جرّارہ کا شور سُن کر دہشت سے بھاگ کھڑے ہوئے لیکن تیمور کہاں رُکنے والا تھا۔ اُس نے فوراً وجہ معلوم کر لی اور خواجہ کو گھوڑا اور خلعت دے کر خوش کرنا چاہا لیکن موخرالذکر نے اسے اہانت نہیں سمجھا اور کچھ پند و نصائح کر کے انہیں واپس بھیج دیا۔

جو شخص ملتان گیا ہو وہ جانتا ہے کہ اس کی بے پناہ گرمی شمس تبریز بغدادی "زبدۃ السالکین و اکمل الصالحین" کا اثر ہے جو روٹی مانگ کر گذارہ کرتے تھے اور جو لمبا اوقات قلیل ہوتی تھی۔ ایک دفعہ قلتِ خوراک سے مجبور ہو کر انہوں نے ایک مچھلی پکڑی اور سورج سے کہا کہ وہ نیچے اُتر کر اسے پکا دے۔ اس پر سورج نیچے ہو گیا اور ملتان اُس وقت سے زیرِ عذاب آ گیا۔ یہاں تک کہ جو بدقسمت ملتانی عالمِ برزخ میں بھی چلے گئے ہیں اُنہیں روایت کے مطابق ایک کمبل منگوانا پڑتا ہے۔ شمس سے اور بھی کئی کرامات منسوب ہیں، مثلاً مُردوں کو زندہ کرنا، لیکن شاید اس گرد آلود اور محروم باراں شہر کے باسیوں کی یہ جان کر بھی پوری تسکین نہ ہو کہ بالآخر انہیں زندہ جلا دیا گیا۔

لیکن ملتان کے دیگر اہلِ کشف و کرامات کے سامنے شمس بھی پانی

پھرتے تھے جیسے رکن الدین شاہ عالم اور ان کے جدِ امجد بہاؤ الحق۔ اوّل الذکر کا سلطان دہلی، غیاث الدین تغلق کے جان لیوا پھندے میں ہاتھ تھا۔ انہیں والدا کے ساتھ دفن کیا گیا لیکن وہ بعد میں اپنی مرضی سے بلا مدد اپنے موجودہ روضہ میں منتقل ہو گئے۔ شیخ الشیوخ بہاؤ الحق، پیغمبر اسلام کے پڑدادا ہاشم کی نسل میں سے تھے اور ملتان آنے سے پہلے نصف صدی تک اسلامی ایشیا میں گھومتے پھرتے رہے اور پھر ملتان میں آباد ہو کر ایک اور نصف صدی کے لئے چوٹی کی کرامات کے سرچشمے بنے۔ ایک کرامت یہ تھی کہ انہوں نے ایک غرق شدہ جہاز کو اپنے ہاتھوں سے اٹھالیا اور وہ آج تک سندھ کے کشتی بانوں کے مربی ہیں اور وہ آڑے وقت میں انہی سے رجوع کرتے ہیں۔

حضرت بہاؤ الحق کے صاحبزادے اور حضرت رکن الدین کے والدِ محترم، حضرت صدر الدین بھی روحانیات میں کچھ کم ممتاز نہ تھے۔ ان کی ٹھٹھہ کے ایک پیر سید مراد سے ٹھن گئی جو اپنے فن میں یکتا تھے۔ ملتانی شیخ نے انہیں دودھ کا ایک پیالہ بھیجا تا کہ یہ ظاہر کر سکیں کہ ان کا تقدس ملک کو ایسے ہی لبریز کئے ہوئے تھا جیسے دودھ پیالے کو۔ یہ دودھ تازہ بتازہ ٹھٹھہ پہنچا اور اس کا ایک قطرہ بھی گرنے نہ پایا۔ سید موصوف نے ایک گلدستہ اس میں رکھ کر بھیج دیا تا کہ یہ ظاہر کر سکیں کہ ابھی اس میں پیر مراد کی کرامات کے لئے کافی گنجائش تھی ملتان پہنچنے تک اس کا ایک پھول بھی نہ مرجھایا۔ لہٰذا شیخ نے ایسے حریف کو نیچا دکھانے کے لئے بنفسِ نفیس جانا ضروری سمجھا۔ فیصلہ ٹھٹھہ کی مسجد میں ہونا قرار پایا۔ وہاں جاتے ہوئے شیخ نے ایک مردہ بلی دیکھی تو "قُم باذن اللہ"

کھڑکرا ُسے زندہ کر دیا۔ پیر اس پر بالکل خفیف نہیں ہُوا بلکہ مسجد میں ایک بدنام ترین پُرانے برہمن بُت پرست کو بُلایا اور تلاوت کا حکم دیا۔ ہندو نے فوراً اپنا جنیئو توڑ دیا، فصیح و بلیغ عربی میں تقریر کی، مشرّف بہ اسلام ہُوا، اور لفظ 'بسم اللہ' کی چودہ مختلف طریقوں سے تشریح کی۔ اس پر ابن بہاؤ الحق نے سیّد موصوف کی سبقت تسلیم کر لی۔

ٹھٹھہ اولیاً و صوفیا کا گڑھ تھا۔ محمد اعظم نے کوئی ایک سو سال پہلے اس لامتناہی موضوع (جس پر بہت سی کتب لکھی گئی ہیں) پر ایک کتاب لکھی جس میں اس نے ایک سو بزرگانِ کرام کی فہرست دی جو اس شہر میں مدفون ہیں اور ملحقہ مکلی (یا مکہ جیسی) پہاڑیوں پر اعلیٰ پائے کے اسّی روضوں کا ذکر کیا۔ اصل میں وہ سارا چھوٹا سا سلسلہ انہی کے مزارات سے معمور ہے اور اگر انہیں ہزاروں بھی کہا جائے تو شاید ناکافی ہو! مذکورہ پیر مراد کے خلفا ہی بہت سے ہونگے کیونکہ چالیس سال کی عمر میں ہی اُسے اِس لئے نقاب اوڑھنا پڑا کہ جو کوئی اسکا نورانی چہرہ دیکھ لیتا فوراً سلوک کی منزلیں طے کر جاتا۔ مصنف کے مطابق کم از کم ...,۲ مریدین معرفت کے درجوں تک پہنچے۔

ان میں سے ایک 'نمونۃ الصالحین اور قائم اللیل'، میاں طوک شاہ تھا جو اتنا نفس کش تھا کہ ستّر سال کی زندگی میں اُس نے صرف ۱۱۲ پاؤنڈ آٹا استعمال کیا اور وہ اِسے صرف پانی سے بھگو کر کھا لیتا تھا۔ وہ رہٹ کی چرچراہٹ سے ہی وجد میں آجاتا تھا اور اس کا اِتنا رسیا تھا کہ بعض اوقات بیلوں کے بغیر ہی رہٹ چلواتا تھا۔ وہ ایک کاشت کار کے باغ میں ایک درخت کے سائے تلے بیٹھا رہتا

تھا اور یہ پسندیدہ موسیقی سنتا رہتا تھا حتیٰ کہ کاشت کار کی ساری جائیداد ایک صبح غرقِ آب ہو گئی۔ کاشت کار نے اسے نکال باہر کیا لیکن اس کا باغ، درخت، کنواں اور رہٹ بھی میاں موصوف کے ساتھ ہی چلے گئے۔

سہوان میں پیر کوہستان، عثمان مروندی کا روضہ ہے۔ وہ ایک عظیم نحوی، عالم، سیاح اور روحانی بزرگ تھے جو ۱۲۷۴ میں فوت ہوئے۔ ان کا مقبول لقب لال شہباز ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کو اُن کے والد نے آزمائشاً آگ کی بھٹی میں پھینک دیا جو فوراً پھولوں کی سیج بن گئی۔ اسی واقعہ کی تقلید میں شہباز پورا ایک سال ایک آہنی برتن میں بیٹھے رہے جو جلتی ہوئی آگ پر رکھا ہوا تھا۔ پیر سندھ پر صرف اس کا اتنا اثر ہوا کہ اُن کا رنگ صوفیانہ پہلے سے تیز سُرخ میں بدل گیا ایک اور موقعہ پر انہوں نے بُراق بن کر ایک مظلوم ہم مشرب کو کافر بادشاہ کے پنجوں سے چھڑا لیا۔ لہٰذا لال شہباز کا لقب نہایت موزوں ہے۔ شروع میں وہ ایک قابلِ احترام، بے ضرر معزز انسان تھے لیکن ان کے مزار کے موجودہ متولی اور مجاور موسومہ بہ جلالی فقیر ہرگز ایسے نہیں بلکہ ننگِ خلائق ہیں۔ مشہور ہے کہ ایک خاص ذات کی لڑکی ہر سال مزار سے بیاہی جاتی ہے اور یہ یقینی ہے کہ موٹے تازے، لنڈے مشنڈے فقیر (جو سر، داڑھی، ابرو اور مونچھیں منڈوا کر اپنی شکل مسخ کر لیتے ہیں) نہ صرف آزادانہ گناہ کی اجازت دیتے ہیں بلکہ خود بھی اس کے مرتکب ہوتے ہیں۔

یہ ایک عام عقیدہ ہے کہ اولیا اپنی مرضی سے زمین کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر سکتے ہیں۔ دو نیک بھائی محبوب وارین، سندھ کی ایک

سرحدی پہاڑی میں مدفون ہیں۔ یہ میاں مٹھو اور میاں راٹھو ہیں جو یومِ حشر نہ
صرف خود بہشت میں جائیں گے بلکہ پوری پہاڑی کو ساتھ لے جائیں گے۔ لہٰذا
لوگ اِس پہاڑی پر دفن ہونا سعادت سمجھتے ہیں۔

درّہ بولان کے اوپر ایستادہ بلند ترین بلوچ پہاڑ، چہل تن کی چوٹیاں
بھی ایسی ہی مبارک دفن گاہ سمجھی جاتی ہیں۔ براہوئی کہتے ہیں کہ خود آنحضرت محمدؐ
ایک رات فاختہ پر سوار ہو کر یہاں تشریف لائے اور ان کی رہنمائی کے لئے پیروں
کی ایک جماعت یہاں چھوڑ گئے۔ ان میں سے چالیس یہیں مدفون ہوئے اور اسی
لئے نام چہل تن رکھا گیا۔ لیکن میسن نے اِس کے ماخذ کی زیادہ دلچسپ روایت
بیان کی ہے۔ ایک سادہ لوح، بے اولاد جوڑی نے تیری کے ولی سے یہ نحوست
دور کرنے کی التجا کی۔ ولی تو نہ مانا لیکن اُس کے بیٹے نے عصائے پدری سے
عمل کیا اور عورت سے وعدہ کیا کہ وہ جتنے خزفریزے اپنی گود میں اٹھا لے
گی اُتنے ہی بیٹے اُسے مل جائیں گے۔ اُس نے چالیس خزفریزے اُٹھائے
اور کچھ وقت بعد اُس نے ایک ہی دفعہ چالیس بیٹوں کو جنم دیا۔ انہوں نے
انتالیس تو پہاڑ کی ڈھلانوں پر نذرِ تقدیر کر دیئے اور ایک کو لے کر بھاگ آئے۔
فوراً ہی پشیمان ہو کر وہ لوٹے اور اُنہیں ڈھلوانوں چٹانوں پر اُچھلتے کودتے
اور رقصاں و فرحاں دیکھا۔ اُنہیں بہلا پھسلا کر واپس لانے کے لئے ماں باپ
نے چالیسواں بیٹا اُنہیں دکھایا لیکن وہ بھی جاتا رہا اور دونو ایک دفعہ پھر محرومِ اولاد
ہو گئے۔ غم و اندوہ سے نڈھال ہو کر انہوں نے ایک روضہ تعمیر کیا جو آج تک
بے اولاد بیویوں کے لئے مینارِ اُمید ہے، جو یہاں آتی ہیں اور بچوں کے لئے

دُعائیں مانگتی ہیں ۔

سرحد کے اس حصّہ کے شاید مشہور ترین ولی سیدی احمد ہیں جن کا روضہ سخی سرور میں ہے ۔ وہ نہ صرف سرحد کی مقبول ترین روایات بلکہ نصف سے زیادہ پنجاب کی اساطیر کے بھی مرکزی کردار ہیں ۔ انہی کے دربار پر جاٹ خاتون ، وارد بارہ سال کی شادی شدہ لیکن بے اولاد زندگی کے بعد ایک بیٹے کے لئے دُعا مانگتی ہے اور اُس کی مُراد پوری ہوتی ہے اور پھر جب اُس کے شوہر کے غصّے کے باوجود (جو گرو نانک کا چیلا تھا) وہ شکریہ کے لئے واپس جاتی ہے اور اُس کا بچّہ اسی کی آغوش میں مر جاتا ہے کیونکہ وہ روضہ کو لوٹنے کی نیّت سے آئی تھی تو بھی رحمدل سیدی اُسے دوبارہ زندہ کر دیتے ہیں ۔ یہ سیدی ہی ہیں جو اپنے باپ کا ریوڑ چراتے ہوئے قرآن شریف پڑھتے ہیں تو ان پر ایک خوفناک شیر یکدم حملہ کر دیتا ہے اور وہ محض تنِ تنہا اپنے ڈنڈے سے اُس کا کام تمام کر دیتے ہیں ۔ ملتان کا پٹھان نواب جیون اُنہیں ایک گھوڑا اور لباسِ فاخرہ دیتا ہے تو وہ گھوڑے کو ذبح کر کے خرقہ پوشوں کو کھلا دیتے ہیں اور لباس پھاڑ کر انہی فقرا کو دے دیتے ہیں اور جب معترض خردہ گیری کرتے ہیں تو وہ اسی گھوڑے پر سوار اور انہی کپڑوں میں ملبوس ہو کر (جو بہشت سے اُن کے لئے آئے ہیں جہاں سے حُوریں اور پریاں بھی آتی ہیں) برتن اور مٹکے لئے ہوئے ملتان جیون کی بیٹی سے شادی رچانے کے لئے آتے ہیں ۔ اس بیگم سے اُنہیں بہت سی دولت اور تین خادم بھی ملتے ہیں اور اب اُن کی اولاد ١،٦٥٠ ہے جو روضہ کی متولّی ہے ۔ جیسے بنیا اور جیسے بیوپاری کے قصّے (جو کیپٹن ٹمپل نے

نے جمع کیے) امیر سوداگروں کے قصے ہیں جنہوں نے کاروبار کامیاب ہونے کی صورت میں بڑی بڑی منتیں مانیں لیکن کامیاب ہونے پر بھول گئے اور پھر مصائب کے بھنور میں پھنس گئے جو اسی وقت ختم ہو سکیں جب وہ بار بار حاضر ہوئے اور روضہ پر روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ دلی کی بلوچ گھوڑی لکی سرور "کشادہ پشت اور کلنگ کی طرح لمبی" بھی کچھ کم مشہور نہیں کیونکہ وہ قوت گفتار کی مالک ہے اور کئی کرامات اُس سے منسوب ہیں!

دریائے سندھ کے کنارے ان بزرگوں کی تفریح گاہیں تھیں۔ اس کا روح پرور پانی اور خوشگوار تازگی سلیمان کے خشک اور ننگے پتھروں کا حسین تضاد تھا۔ ایک مشہور ترین بزرگ زندہ پیر یا خواجہ خضر ہیں جن کا مزار بھکر میں ہے۔ وہ آقائے دریا ہیں اور زبردست دھارے کی تجسیم ہیں جن کے حضور بہت سے مقدس گیت اور عرضداشتیں پیش ہوتی ہیں۔ روضہ ایک مشہور پیر سے منسوب ہے جس نے ایک مسلمان دوشیزہ (جو نازم مکہ تھی) کی عصمت ایک شہوت پرست ہندو راجے سے دریا کی گذرگاہ تبدیل کر کے بچالی تھی!

دوسرے نمبر پر دریائی آقا شیخ طاہر ہیں جن کا روضہ ہالا سے کچھ نیچے ہے جو مسلمانوں کے قبضہ میں ہے لیکن ہندو انہیں اُدھیرو لال کہتے ہیں اور ایک سالانہ میلہ بھی لگاتے ہیں۔ اُن کی کئی کرامات دونوں مذہبوں کے تحفظ کے لئے مشہور ہیں۔ وہ ہندوؤں کے بقول ایک سفید اور مسلمانوں کے بقول ایک گہری نیلی چادر پہنتے تھے۔ انہوں نے ایک ہندو کو

بچالیا اور اُسے اسی طرح تیرنے کے لیے کہا۔ وہ ڈوبنے لگا تو اُنگلی کی پوروں سے چادر کا سِرا پکڑ کر بچ سکا جس سے مسلمانوں کے بقول چادر پر پانچ سفید داغ رہ گئے اور کچھ اہلِ دریا نیلی چادر اور اُس کے سفید داغوں کا تذکرہ آج بھی کرتے ہیں۔

سخی سرور کے ولی کی طرح یہ دونوں بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترک محبوب ہیں اور دونوں مذاہب کے لوگ زیارت پیر چل تن بھی آتے ہیں۔

ان کی عظیم خوبی ترکِ دنیا تھی۔ انہوں نے گھر بار اور اہل وعیال چھوڑے خواہ اُنہیں دوسروں کے ہاں پناہ لینا پڑتی۔ بظاہر اُنہوں نے اپنی زندگی روزہ داری اور شب بیداری میں بسر کی۔

وقائع نگار نے ایک پیر ایسے نفس کش پر لکھا ہے جو انتہائی تپسیا سے اتنا کمزور ہو گیا کہ اُس کی پسلیاں ایک زینہ بن گئیں۔ اُس کا نام شیخ بختیار ڈونگر تھا اور آج بھی جو اُس کا نام لے لے وہ چشمِ بد سے محفوظ رہتا ہے اور پٹھان گاؤں میں مکھیوں سے بچا رہتا ہے۔ پیر عادل کا مقبرہ ڈیرہ غازی خان سے چند میل دُور ہے اور وہ سخی سرور سے دُوسرے نمبر پر ہیں اور عدل کی وجہ سے یوں مشہور ہوئے۔ اُن کے بیٹے نے شکار کے دوران ایک بکری ماری اور اتفاقیہ نوجوان چرواہا بھی مارا گیا۔ مرحوم کی ماں نے فریاد کی تو پیر موصوف نے اپنا بیٹا مار دیا۔

تاہم ان دونوں میں سے کئی نے دین و دنیا کی نعمتیں حاصل کیں۔ کئی پیشے کی روایات پر کاربند ہے اور عورتوں میں بہت مقبول ہوئے۔ ایک

قلندر نے وجد میں آکر بازار میں ایک خوبصورت عورت کے گلے میں اپنے بازو ڈال دیئے۔ والیٔ قندھار نے اُسے تنور میں پھنکوا دیا لیکن وہ وہاں بیٹھا مزے سے بُھنا ہُوا گوشت کھاتا ملا۔ ایک مجذوب نے ایک حسین دھوبن کو بچا لیا۔ خواجہ یحییٰ کو ایک قلندر نے کپاس، آگ اور عورتوں سے اختلاط کے خطرات پر متنبّہ کیا لیکن خواجہ بھی زندہ دل تھے۔ انہوں نے کپاس اور آگ ایک ہی لفافہ میں بند کر کے روانہ کر دی اور کپاس کو کوئی گزند نہ پہنچا۔

کسی مجذوب کو ستانے یا میزبانی سے انکار کرنے کے خطرات بیشمار کہانیوں کا موضوع ہیں۔ کوہستان میں لوگوں نے ایک مجذوب کو ستایا تو اُس نے پھٹکار بھیجی اور اسی دن چالیس جنازے اُٹھے۔

سلطان اسلام شاہ نے ایک مجذوب کو عورتوں سے اختلاط پر موت کی دھمکی دی تو وہ اُسی لمحہ ناسور اور سوزشِ اعضا میں مُبتلا ہو گیا۔ ایسے پوتر انسانوں کی خاطر تواضع تاریخِ عالم کے مطابق فلاحِ دارین کا موجب ہے۔ نوجوان چرواہا اپنا پالتو لیلا قربان کر کے فقیروں کو کھلاتا ہے تو پتھروں سے اُس کے لئے ایک ریوڑ اُچھلتا ہے۔ جو اُن کے لئے گھر بناتا ہے اور جنگل اپنی عمارتی لکڑی پیش کر دیتا ہے۔

پٹھانوں کے لئے زمانۂ معجزات ابھی باقی ہے اور ایک موجودہ مثال کافی ہوگی: کوہاٹ اور سندھ کے درمیان ایک بڑا پتھر یا چٹان تھی، چند فٹ اونچی اور کئی فٹ چوڑی۔ چند سال پہلے ایک مشہور افسر نے اس پر ایک ملا کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ ایک نوکر نے دانت درد کا علاج پوچھا تو ملا نے اسی پتھر کا تھوڑا سا سفوف

دے دیا۔ ہر طرف شہرت پھیل گئی اور دانت درد کے مریضوں نے اسے گھرچ گھرچ کر گھسا دیا۔ دو سال بعد اسی افسر نے اسے کئی فٹ سطح سے نیچے تک کھُدا ہُوا پایا۔ جس نسل نے پارے کی گولیاں کھائی ہیں اور ہالادے کی مرہم سے اعضا سیدھے کئے ہیں اُس کے لئے یہ غیر معمولی نہیں لیکن ملّا کو تو اشتہار بازی کے مواقع میسّر نہ تھے پھر بھی اُس کا علاج چل نکلا۔ شاید جب میسرز گگ اِس علاقے کو کھنگالیں تو سرحد کے ساتھ ساتھ مزید امکانات اُبھریں۔ مثلاً اگر مسٹر پیٹرز چند ملّاؤں کو نہانے پر آمادہ کرلے تو صابن کا کاروبار حیرت انگیز طور پر چمک اُٹھے!

آٹھواں باب

پاوندے اور پٹ*

ہموار میدان کا ایک طویل اور بے کیف خاکہ، اتنا ہموار جتنا بلیرڈ کا میز یا خرمن کا فرش، اکثر ایسے درخت، جھاڑی یا پودے سے محروم جو شتر خار سے بڑا ہو یا چھوٹی چھوٹی محروم نمو سخت جڑی بوٹیاں جو اس مفید ترین لیکن بدمزہ جانور کو ہی بھاتی ہیں اور اتنا سبزہ بھی ہمیشہ نہیں ہوتا جو اس وسیع مٹیالے رقبے کے سپاٹ پن کو ڈھانپ سکے جسے مقامی طور پر "پٹ" کہا جاتا ہے مضبوط، نرم اور لچکدار، یہ خشک موسم میں جولانگاہ کا نعم البدل ہے لیکن جونہی چند انچ مسلسل بارش ہو جائے (جو خوش قسمتی سے یہاں اکثر اور مسلسل نہیں ہوتی) تو یہ ایسے پیچیدہ اور چکنے کیچڑ میں بدل جاتا ہے جس میں حرکت مشکل اور سڑکیں ناقابل عبور ہو جاتی ہیں۔ پانی سے قریباً غیر اثر پذیر، مٹی جتنی سخت ہوتی ہے کیچڑ اتنا ہی بدتر ہوتا ہے اور پانی جتنا کم جذب ہوتا ہے، اتنا ہی چھوٹی سے چھوٹی ندی اپنے لئے ایک گذرگاہ بنا لیتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ جب بارش ہوتی ہے تو پانی چھوٹی چھوٹی گھاٹیاں بنا لیتا ہے اور پہاڑی نالے گہری گذرگاہیں

---

* ۔ خلزئی قبائل اور ڈیرہ اسماعیل خان

تشکیل دے لیتے ہیں جن کے کنارے قریباً عمودی ہوتے ہیں اور وہ گہرے
شگافوں کے سلسلے پیدا کر دیتے ہیں جو میدان کو ہر طرف سے کاٹتے ہوئے
گذرتے ہیں گویا کہ قدیم چینی مٹی کا عجیب و غریب ٹکڑا ہوں۔ کہیں کہیں جہاں اُن
کے پاٹ اتنے چوڑے ہوں کہ کچھ روئیدگی جڑ پکڑ سکے وہاں شگاف کی تہہ پر
نرسل اُبھرتا ہے ورنہ عموماً کنارے بے شجر اور پانی سطح سے اتنا نیچے ہوتا
ہے کہ مصنوعی یا بیرونی مدد کے بغیر ہریالی رونما نہیں ہو سکتی۔ سال کا بیشتر حصہ
خشک رہنے کے بعد یہ گھاٹیاں کبھی کبھار شوریدہ سر اور مہیب نالے بن جاتی
ہیں کیونکہ ان کے منبع پست پہاڑیوں میں ہوتے ہیں یا دُور غزنی کی طرف ـــ
ڈیرہ غازیخان کے پچھڈ کی طرح پٹ (یا دامن) کہیں کہیں مصنوعی آب پاشی کے
محنت طلب اور دانشمندانہ نظام سے ہرا بھرا ہو جاتا ہے اور چھوٹے چھوٹے
نخلستان اُبھر آتے ہیں جو مقابلتاً شجر دار ہوتے ہیں۔ شمال مغربی کونے میں قصبہ
ٹانک اپنے بہترین پھلوں اور لدے پھندے باغوں کے لئے مشہور ہوتا تھا
پرانے وقتوں میں جب یہ قدیم نوابین کی حوروں کا مسکن ہوتا تھا جن کی تاریخ ایڈورڈز
نے لکھی ہے اور سرور خان کے حرم کی حیرت انگیز داستانیں تو اب بھی زبان زدِ
خاص و عام ہیں۔ لیکن دیہات کے حقیر مٹی سے مسقف مکان اور گرد کے علاقے
سے بھی نیچے ہیں اور بہت دُور ہیں اور شاید ہی یہ الگ تھلگ کشت زار،
جھونپڑیاں، باغیچے یا جھنڈ ایسے ہوں جو ہندوستان کے دیگر حصوں کی طرح
اِس منظر میں کوئی تنوع یا دلچسپی پیدا کر سکیں۔ درابند قصبہ کی شہرت اس کے صرف
ایک درخت پر منحصر ہے جس کا پھل اتنا لذیذ تھا کہ رنجیت سنگھ والئے لاہور

منگواتا تھا۔ کلاچی کے متعلق مشہور کہاوت ہے: "یہاں صرف بہادر سپاہی یا عمدہ تربوز حاصل کرنے کے لئے آؤ۔"

مغرب کی طرف مُریاں اور ڈھلوان کوہِ سلیمان ایستادہ ہے۔ ایک طویل خطِ مستقیم میں جس کے عین وسط میں تخت ہے۔ شمال کی طرف بھٹانی یا کشینغ بدین سلسلۂ کوہ کی طویل سنگلاخ شاخیں ہیں جو رتا کوہ اور نیلا کوہ کے مجمع الجبال سے مل کر ایک مکمل فصیل بن جاتی ہیں اور کنارِ سندھ تک پھیل جاتی ہیں اور اس میدان کو بنوں اور مروت سے جُدا کر دیتی ہیں۔ سارا علاقہ سندھ سے لے کر پتھریلی گھاٹیوں تک (جن سے پہاڑی نالے نکلتے ہیں اور جو وہ پُراسرار درّے ہیں جن کے بے شمار قصے مشہور ہیں) اور جنوب میں وہوآ سے شمال میں ٹانک تک یکساں اور سپاٹ ہے۔ جہاں کہیں نالے دائمی ہیں اور پانی وافر ہے وہاں یکسانیت ٹوٹتی ہے اور جب بعض اوقات غروبِ آفتاب کی شفق ان پہاڑوں کے سنگلاخ پہلوؤں پر عکس افگن ہوتی ہے تو منظر تصویر خیز ہو جاتا ہے۔ ایک تازہ صاف دن، ایک عمدہ گھوڑا اور رپٹ پر پڑیا شاید اس کی مزید منظر نمائیوں کو منظرِ عام پر لے آئے ہیں لیکن نوجوان اُونٹ کی بجائے بہار کا لیلا، خمیدہ پودے کی بجائے فصل کی کٹائی کرنے والا اور بے ہنگم خیمے کے گاؤں کی بجائے قدیم امن کے گہوارے اسے دلکش نہیں بناتے اور تصویر خیزی کا جادو زیادہ تر فاصلہ کا ہی مرہونِ منت معلوم ہوتا ہے۔ پہاڑیوں کے جتنا قریب جاتے ہیں وہ اتنی ہی کریہہ المنظر ہوتی جاتی ہیں اور مُریاں، چاتو نما سرے اور فقدانِ اشجار اور قلتِ آب اتنی ہی افسردہ کُن اور سوہانِ رُوح ہوتی جاتی ہے اور جب ان

کے اندر چلے جائیں تو بمصداق میک گر یگر پہاڑیوں کے اندر کسی وادیٔ مینو اساس میں پہنچ جانے کا احساس نہیں ہوتا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کسی گڑھے میں آ گئے ہیں جس کے چاروں طرف عمودی دیواروں کے عفریت کھڑے ہیں! علاقہ ڈیرہ اسمٰعیل خان کو بجا طور پر 'ڈیرہ ڈسمل' (انگریزی میں ڈیرہ ڈسمل بمعنی افسردہ کن) کہا گیا ہے۔

اس غیر دلکش لیکن انتہائی اہم افسردہ کن جگہ سے سدِّ مغربی کو عبور کرنے کے مشہور ترین درّے مندرجہ ذیل ہیں :۔ (۱) دہوا، گاؤں کے سامنے اور اپنی ہمنام فوجی چوکی کے پاس (۲) شیخ حیدر یا زاوٗ (یعنی غیر معمولی طور پر دشوار درّہ) جو کہیں کہیں تو صرف چند فٹ چوڑا شگاف ہے جس کے ارد گرد اور اوپر بہت اونچی اونچی ڈھلانیں ہیں گو آخری سروے پارٹی (تحنت کے سلسلہ میں) یہیں سے گذری۔ (۳) گومل (۴) ٹانک زَم یا دریا اور (۵) شوُزہ۔ ان کے علاوہ کوئی ستر اَور ہیں جو دیگر سلسلوں کو پار کرتے ہیں اور ان کے عقب کی طویل البلد وادیوں سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ سرحدی مُہمات کی وجہ سے جانے پہچانے جاتے ہیں اور کچھ انہی ندیوں کے ناموں پر مشہور ہیں جو ان سے نکلتی ہیں اور یہ نام بھی چند میل پر بدل جاتے ہیں۔ مثلاً گومل ہمارے نقشوں پر کوُنی بن جاتا ہے اور چوکیوں سے بھی پہچانے جاتے ہیں جو قبائل کی نگرانی کے لئے قائم کی گئی ہیں کیونکہ وہ سکھ دور میں یہاں سے مویشی لے جاتے تھے اور ایسے ہندو جو ان کی مٹھیاں گرم کر کے اپنی جان چھڑا سکتے تھے۔ ایڈورڈز نے ایک کہانی لکھی ہے کہ ایک برات، دُلہن، دُولہا، عزیز و اقارب اور شہنائی نواز سب

ڈیرہ نواب کے ایک سپاہی نے پکڑلئے جس کی تنخواہ لبقایا تھی اور ۴۰۰۰ روپے دے کر نجات ہوئی - اکثر درّوں میں ایک ندّی یا نومسلم دلی یا دونوں کی روایت مشہور ہے - درابند میں ایک شیخ کا مزار ہے جو سرحدی اولیا کی طرح بہت سے القابات سے نوازا گیا ہے جیسے قطب رشد و ہدایت، زبدۃ المومنین وغیرہ اور اس کے ساتھ ہی ندی میں ایک جگہ ہے (یا ہونا چاہیئے) جو ہر وقت پانی سے بھرا رہتا ہے - جب دو آدمیوں کا جھگڑا قسم سے طے ہونا ہو تو دونو اس میں سے ایک ایک گھونٹ پی لیتے ہیں جو صادق ہو وہ گزند سے بچ جاتا ہے لیکن جو کاذب ہو وہ مشک کی طرح پھول جاتا ہے اور پھر اس کا چھٹکارہ صرف سچ بول کر ہی ہو سکتا ہے!

شمالی سلسلہ میں دو درّے ہیں، بائن اور پیزو جو ضلع بنّوں کو جاتے ہیں - ایڈورڈز نے مشورہ دیا تھا کہ پیزو سے بلا محافظ نہیں گذرنا چاہئے لیکن اب ہماری اہم سرحدی سڑک اسی سے گذرتی ہے اور شاید ریجنٹ سٹریٹ سے بھی محفوظ تر ہے - مغربی درّوں میں گومل قدیم الایّام سے خراسان و ہندوستان کے درمیان بڑی تجارتی شاہراہ بنا رہا ہے اور تجارت پیشہ افغان کے لئے اس مرکزی یا وسطی شاہراہ کو جو حیثیت حاصل ہے وہ تو خیبر و کابل اور بولان و قندھار شاہراہوں کو بھی نصیب نہیں ہر سردی میں بخارا اور افغانستان کے سامان سے لدے ہوئے اونٹوں کے قافلے اس سے گذر کر ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل جاتے ہیں اور گرمی آنے پر تبادلے میں رقومات یا سامان لے کر وہ اپنی ٹھنڈی

سطوح مرتفع کو واپس ہوتے ہیں اور اس سامان اور نقدی کو ایرانی اور روسی سرحدات تک تقسیم کرتے ہیں۔

افغان سوداگر ہندوستان میں اپنے پھلوں سے زیادہ اپنی انوکھی شکل و شباہت، غیر معمولی قد و قامت، زور بازو اور تحکمانہ انداز سے پہچانا جاتا ہے۔ وہ دیکھتے ہی پہچانا جاتا ہے۔ وہ جہاں سے گذرتا ہے بدبو کا بھپکارا چھوڑتا چلا جاتا ہے۔ بزبان بیلیو اُس کا ڈھیلا ڈھالا غلیظ لباس دھوبی کے بس کا نہیں جس کے اُوپر وہ بھیڑ کی کھال کا جھبرا کوٹ پہنتا ہے جس پر سفر کے داغ اور پسینے کے نشانات اتنے نمایاں ہوتے ہیں کہ وہ اگر ہجوم میں نظر نہ آئے تو بھی لوگوں کے نتھنوں کو اپنا احساس دلا دیتے ہیں۔ اس کے اُلجھے ہوئے ژولیدہ بال دریدہ یا کم از کم انتہائی داغدار، کھردری سوتی پگڑی کے بے ترتیب پیچوں سے کسی حد تک قابو میں رکھے جاتے ہیں اور اُس کے اَن دُھلے، موسم زدہ خط و خال کی وحشت کو دوگونہ کرتے ہیں۔ کرخت آواز اور تحکمانہ اطوار اُس کی بربریت کو مکمل کر دیتے ہیں جس پر وہ اتنا اتراتا ہے۔ یہ ہے بازاروں میں نظر آنے والا عام پاوندہ "لفظ پوندہ غالباً فارسی لفظ پروندہ (= سامان کی گٹھڑی) سے ماخوذ ہے جو تمام سفری تجارت پیشہ پٹھانوں کے لئے مستعمل ہے۔ یہ لوگ وسط ایشیا، افغانستان اور ہندوستان کی تجارت کے اجارہ دار ہیں اور ان کے اکثر قبائل غلزئی ہیں جو درانیوں کے مقتدر ہونے سے پہلے مشہور ترین تھے۔ بہت سے فضلا غلزئی یا غلجی کو ترکی النسل مانتے ہیں جو اصل میں ترکی خلیجی (تلوار باز) ہیں لیکن ان کے ماخذ کی رومانوی کہانی زیادہ اغلب ہے

جس کے مطابق ایرانی شاہزادہ نے ایک افغان دوشیزہ کی عصمت دری کی (افغان اپنی بیٹیاں ایرانیوں کو نہیں دیتے) اور نتیجتہً پیدا ہونے والے بیٹے کا نام غَل زوئے (ابنِ دُزد) رکھا گیا۔ لیکن تلوار باز ہوں یا ابنائے دُزد وہ موجودہ دَور میں بلاشک وشبہ ایک عمدہ نسل ہیں اور قدوقامت، طاقت اور ہمت کے لحاظ سے کُل افاغنہ ہیں، تجارت کا ملکہ رکھتے ہیں اور اپنا سامان منافع پر بیچنے کے لئے (کافی حد تک انگریز کی طرح) جان کی بازی تک لگا دیتے ہیں۔ وہ ہر سال غزنی کے مشرق میں زرمُت یا کٹواز کے میدانوں میں اپنے خاندان، ریوڑ اور گلّے لے کر اکٹھے ہوتے ہیں اور پھر بڑے بڑے قافلوں کی صورت میں اپنے ہزاروں جنگجوؤں کی سرکردگی میں روانہ ہوتے ہیں تاکہ وہ وزیریوں اور کاکڑوں وغیرہ کا مقابلہ کر سکیں اور حقیقت یہ ہے کہ وہ لڑتے لڑتے ہی ان کے جنگل سے نکلتے ہیں۔ ان کی اکثریت درّہ گومل سے آتی ہے لیکن تھوڑے سے بھیڑوں والے زاوئے سے گذرتے ہیں۔

ڈیرہ اسمٰعیل خاں کا پَٹ اُن کی عظیم چراگاہ ہے اور وہ خود، اُن کے خیمے اور اُن کے شُتر گلّے پٹ کے سپاٹ منظر میں ایک نمایاں اضافہ کرتے ہیں۔ مزید برآں اُن کے کئی قبائل پارے صدیوں سے یہاں آباد ہوتے رہے ہیں۔ ان کی تعداد کا یہاں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ درّوں کے دہانوں پر ہماری ملیشیا (جو انہیں غیر مسلح کرنے اور راہداری اور چرائی ٹیکس لینے کے لئے متعین ہے) نے ۱۸۷۷ء کی سردی میں ۷۶,۰۰۰، ۱۸۷۸ء میں ۵۸,۰۰۰ اور ۱۸۸۰ء میں ۵۰,۰۰۰ شمار کئے جو یہاں داخل ہوئے۔

موخرالذکر میں سے ۳۴۳،۰۰۰ مرد تھے جن میں سے نصف سے زیادہ مسلّح جنگجو تھے۔ ۱۸۷۸ء میں ان کے پاس ۷۷،۰۰۰ اونٹ اور ۸۸،۰۰۰ ا بھیڑ بکریاں تھیں۔ باقاعدہ قافلوں میں آنے والے بہت سے ریلوے کے باوجود امرتسر دہلی، بنارس بلکہ پٹنہ تک پیدل اور سوار سفر کرتے ہیں لیکن ان کے علاوہ بے شمار ایسے بھی ہیں جو ضلع کی مستقل خیمہ گاہوں میں ٹھہرتے ہیں جنہیں "کرّی" کہتے ہیں۔ یہاں ان کی عورتیں، بچے، اسلحہ اور کچھ آدمی اور جانور سردی کے دوران ٹھہرائے جاتے ہیں اور باقی تجارت کے لئے آگے نکل جاتے ہیں۔ وہ ہر سال اپنی اپنی کرّی میں آتے ہیں اور اکثر دیہات کی حدود کا لحاظ کئے بغیر اپنے اونٹ چرنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ تیسرا (اور وہ بھی بیشمار) حصہ چھرٹوں کا ہے جن کے پاس ساز و سامان برائے نام ہوتا ہے اور وہ مزدوری کے لئے آتے ہیں اور گروہوں کی صورت میں دور دور تک گھومتے پھرتے ہیں (جیسے ہوم رول تحریک سے پہلے آئرستانی انگلستان میں فصل کاٹنے کے لئے آتے تھے) اور ہر قسم کا کام کرتے ہیں مثلاً پتھر توڑنا، سڑک بنانا یا دوسرے محنت طلب کام کرنا۔ وہ بہت سخت اور جفاکش زندگی گذارتے ہیں اور شام کو حتی الوسع مانگ تانگ کر گذارہ کر لیتے ہیں اور یوں اپنی بیشتر کمائی اپنے ساتھ افغانستان لے جاتے ہیں۔

کوہ سلیمان خواہ کتنا بھی درشت اور سنگلاخ ہو اور درّوں کی پہاڑیاں اور چٹانیں کتنی بھی فلک بوس ہوں، پھر بھی یہ سپاہیانہ سوداگری کی مشکلات کا عشر عشیر نہیں۔ بیشتر اس کے کہ وہ اپنے ہندوستانی گاہکوں کو بخارا کی

سلک اور افغانستان کے پھل مہیا کرے یا انگریزی کیلیکو اور ململ، ہرات کے نفاست پسند حرموں کے لئے لے جائے اُسے کئی معرکے سر کرنے پڑتے ہیں ان نصیبوں جلے لوگوں میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جس نے سرحدی قبائل سے معرکہ آزمائی نہ کی ہو۔ گومل کے جنوب میں اسے کاکڑ پٹھان کا سامنا درپیش ہوتا ہے جو گو کہ اسے تکلیف دِہ ہونے کے باوجود شمال کے وزیری کے مقابلے پر اپنے دہنے ہاتھ میں امن کا پرچم لئے ہوئے ہوتا ہے لیکن بے خبر مسافر پر ایسے ٹوٹتا ہے جیسے بارش آسمان سے۔ اس کے برعکس وزیری پشت ہا پشت سے پوندہ کاروانوں سے برسرِ پیکار رہا ہے۔ شاید ہی کوئی دن ایسا ہو جب اس کا ہراول یا عقب محفوظ رہا ہو۔ قافلے سے بچھڑنے والے نذرِ شمشیر ہو جاتے ہیں یا جانور چرا لئے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ ہنگامے گھمسان کی لڑائی کا رنگ اختیار کر جاتے ہیں اور پھر دونو طرف سے اشتعال انگیز کارروائیاں ہوتی رہتی ہیں اور متعدد بار تجویز کیا گیا ہے کہ سلامتی سے گذرنے کے لئے رشوت کی رقم مقرر کر دی جائے۔ لیکن وزیری کو اسے قزاقوں کی طرح لینے میں زیادہ لطف آتا ہے۔ لیکن وہاں درّہ پر اس کے دشمنوں کا حال بیان کرنے سے پہلے خود پوندہ پر مزید غور و خوض کر لینا چاہیئے۔

اکثر غلزئی جو پوندہ سمجھے جاتے ہیں کوائف میں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ پست قد لیکن مضبوط الجثّہ نامہر بے وطن لوگ ہیں اور ڈیرہ جات اور غلزئی علاقوں میں مال چرائی کے لئے ٹیکس دیتے ہیں اور اپنے

گلوں اور ریوڑوں پر گذارہ کرتے ہیں۔ عام طور پر وہ تین طبقوں میں تقسیم کئے جاتے ہیں ـــ اونٹ والے، بیل اور گدھے والے، بھیڑوں والے؛ اونٹ والوں کے پاس تیس چالیس ہزار کے درمیان اونٹ ہیں۔ وہ غریب ترین اور گنوار ترین ہیں لیکن ماورائے سندھ علاقوں میں تجارتی سامان اِدھر اُدھر لے جاتے ہیں۔ کوہاٹ کی کانوں کا نمک ہو یا مروت کا غلّہ وہ سرحدی سڑکوں پر واقع ہر قصبے میں نظر آتے ہیں۔ بیلوں گدھوں والے بھی ہر جگہ پائے جاتے ہیں اور مٹی یا اینٹیں ڈھوتے ہیں یا ایندھن کاٹتے اور بیچتے ہیں۔ بھیڑوں والوں کے پاس کوئی ایک لاکھ بھیڑیں ہیں۔ وہ دامنِ کوہ کے ساتھ ساتھ بھیڑیں چُراتے ہوئے اکتوبر میں آتے ہیں اور اپریل میں واپس ہوتے ہیں۔ منبع گومل کے قریب کی پہاڑیوں سے آنیوالے خروٹی بیحد غریب ہوتے ہیں اور عموماً مزدوری کرتے ہیں یا سامان ڈھوتے ہیں۔ ان کی اپنے زیادہ طاقتور ہمسایوں سلیمان خیل سے جنگ و پیکار نے انہیں تباہ کر دیا ہے۔ یہ جنگ صرف اُس وقت رُکتی ہے جب وہ برطانوی علاقے میں آجاتے ہیں لیکن پہاڑوں میں واپس جاتے ہی یہ نئے جوش و خروش سے دوبارہ شروع ہو جاتی ہے

سلیمان خیل کثیر التعداد، بے حد مضبوط اور بہترین جنگ آزما ہیں۔ ہندوستان کے اندر اُن کا رویّہ خوشگوار ہوتا ہے لیکن باہر وہ بہت درشت و کرخت ہیں۔ وہ اپنے موالی قبائل کے ساتھ پشین سے جلال آباد کی پہاڑیوں تک منتشر ہیں۔ برطانوی علاقے میں آنیوالے جو سلیمان خیل زیادہ سامان نہیں لاتے وہ دلالی اور سوداگری کرتے ہوئے کلکتہ تک چلے جاتے ہیں اور تھوک

مال خرید کر پوندوں کے ہی ہاتھ بیچ دیتے ہیں اور یوں اُن کا خاصا منافع ہضم کر جاتے ہیں۔ ۹، ۱۸اء میں ٹانک کی شورش میں وہ پیش پیش تھے لہٰذا اکّری کے سب آدمی شورش کو فرو کرتے ہوئے ہماری فوج نے ٹھکانے لگا دیئے۔ غالباً امیر ترین پوندے شرق غزنی کے قریب پناہ اور قراباغ کے رہنے والے (صرف گرمی میں) میاں خیل ہیں اور ہماری سرحد کے اندر درابن اور موسے زئی میں آباد اپنے ہی ہمنام قبیلہ کے رشتہ دار ہیں۔ مؤخر الذکر نے بھی ابھی پوندہ طرزِ حیات پوری طرح ترک نہیں کی اور کبھی کبھار کوئی خوشحال زمیندار کابل یا بخارا کا چکر لگاتا ہے جب کہ اس کا کوئی غزنوی عزیز اِدھر زمین لے لیتا ہے اور اس کے دیگر اعزہ اس کی غیر موجودگی میں اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ بخارا کی زیادہ تر تجارت (سلک، بھیڑ کی کھالیں، کوٹ اور جڑی بوٹیاں) انہی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ غلزئیوں کے لوہانی یا روانی (فارسی بمعنی مسافر، سفر پسند) حصہ سے تعلق رکھتے ہیں وہ خوش لباس، خوش منظر (سُرخ سفید چہروں کے مالک) اور اپنے اکثر اتحادیوں کے مقابلے پر بہتر بودوباش اور اطوار کے آئینہ دار ہیں۔ وہ بات بات پر لڑنے مرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتے۔ اُن میں جرأتِ رندانہ کی کمی نہیں لیکن وہ حرص انگیز زورِ خطابت اور سمگلروں کی فیاضانہ رشوت کے ذریعے فہمائش کرنا بہتر سمجھتے ہیں۔ جسے نقد ان کا ڈر نہ ہو وہ تو قلعے بھی لے سکتا ہے لیکن اگر قلعے میں شگاف ہو جائے اور جنگ کا خطرہ طرفین کے لئے ایک جیسا ہو تو بھی وہ فوج کی قیادت کی بجائے کاروان کی قیادت کو ترجیح دیتے ہیں۔ دوتانی ایک چھوٹا سا،

غیر اہم قبیلہ ہیں جن کے پاس گومل اور وزیریوں کے درمیان کا مختصر سا علاقہ ہے لیکن وہ واحد پوندے ہیں جو وزیریوں کے ساتھ دوستانہ مراسم رکھتے ہیں۔ ان کی وادی نسبتاً زرخیز ہے اور اس میں چاول اور غلہ پیدا ہوتے ہیں۔ وہ خوشحال ہیں اور بخارا کے ساتھ منفعت بخش تجارت بھی کرتے ہیں۔ نیازی محض خشک پھلوں اور مجیٹھ کی تجارت قندھار سے کرتے ہیں۔ توخی کسی وقت نمایاں ترین غلزئی قبیلہ تھے۔ وہ ارغنداب کے شمالی حصہ میں رہتے ہیں اور قلات غلزئی ان کا صدر مقام ہے۔ ترکئی قندھار کے رہنے والے ہیں اندار غزنی کے جنوبی ضلع شالگر کے باسی ہیں اور دولت زئی ٹانک کے اصلی باشندے تھے اور وہاں ایک حکمران خاندان کا سرچشمہ بنے — یہ سب اہل قافلہ ہیں اور اپنے اونٹوں اور جنگ بازوں کے ہمراہ آتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے لیکن غیر اہم قبائل بھی بے شمار ہیں۔

ڈیرہ اسمٰعیل خان کی سرحد کے اندر بہت سے پٹھان قبائل پاوندوں سے بہت گہرا رشتہ رکھتے ہیں۔ پچھلے وقتوں میں تاجر اور چرواہے پہاڑوں سے میدانوں میں آتے تھے تو کسی نہ کسی وجہ سے قبیلہ کا ایک حصہ مستقلاً یہیں آباد ہو جاتا جیسے مذکورہ میاں خیل۔ یہ عمل آبادکاری پورے خطِ سرحدی کے ساتھ ساتھ جاری رہا۔ اکبر کے وقت کئی لوہانی قبائل کو سلیمان خیل نے آگے دھکیل دیا۔ مروت ضلع بنوں کے ایک حصہ اور ڈیرہ اسماعیل کے شمالی کونے میں آباد ہوئے اور تاتار اور دولت خیل ٹانک میں۔ موخر الذکر نے گنڈاپوروں (قانون شکن اور وحشیانہ قسم کے پوندے) کو بلا لیا تاکہ مروت

کے خلاف مدد دے سکیں اور یوں وہ کلاچی تحصیل میں بس گئے۔ اسی طرح بابردں (جنہیں ایڈورڈز نے ماورائے سندھ کی افضل ترین نسل قرار دیا اور جن کی تہذیب و ذہانت پر ایک کہاوت دال ہے کہ "ایک احمق بابر دانشمند گنڈاپور کے برابر ہوتا ہے") کو اُن کے ہمسایوں اور رشتہ داروں، شیرانیوں نے نکال دیا تو وہ چند دن میں آباد ہوگئے اور دولت لیسند، امن پسند اور ایماندار تاجر ہیں۔

پوندہ تجارت کی وسعت کا اندازہ لگانے کے لئے معتبر اعداد و شمار کی باضابطہ رپورٹیں نہیں ہیں۔ سیکرٹری آف سٹیٹ کے نام پنجاب کی رپورٹ کا اندازہ ہے کہ ۱۸۶۱ء میں یہ تجارت ۳۲ لاکھ روپے کے برابر تھی اور ۱۸۷۰ء میں ۵۰ لاکھ (تقریباً ۵ لاکھ پاؤنڈ)۔ بندوبست افسر کے مطابق درآمدات کی اوسط بائیس لاکھ تھی جو زیادہ تر پھل، مجیٹھ، سلک، اُون اور جڑی بوٹیوں پر مشتمل تھیں اور برآمدات انیس لاکھ تھیں جو زیادہ تر نیل، سوتی پارچات اور چائے پر محیط تھیں۔ ہماری سرحد سے پرے اہم تجارتی مراکز بخارا، کابل، قندھار اور غزنی ہیں جبکہ اندرونِ سرحد ڈیرہ اسمٰعیل خان، ٹانک اور کلاچی (ماورائے سندھ) اور لیہ اور بھکر (ورائے سندھ) ہیں۔ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ بھکر تک ریلوے کی توسیع اس تجارت پر کہاں تک اثر انداز ہوگی لیکن یہ اغلب ہے کہ تجارت پہلے ہی اندازاً مالیت سے بڑھ گئی ہے اور اس میں بعید وسعت و اضافہ کی گنجائش ہے۔ یہ کہنا تحصیلِ حاصل ہے کہ پیش رسی کی حکمت عملی (جو کارواں کے لئے محفوظ راستوں کی ضامن ہوگی) اس تجارت کو چار چاند لگا دے گی:۔

نواں باب

تختِ سلیمانؑ اور گومل

اِس جگہ کے متعلق ایک مسلمان روایت کے مطابق حضرت سلیمانؑ یروشلم کی بیٹیوں سے غیر مطمئن ہو کر ایک دفعہ ہندوستان آئے تاکہ ملکۂ حُسن، بلقیس سے شادی رچا سکیں۔ جب یہ متوالا جوڑا ماہِ عروسی منانے کے لئے تخت (تلمیذ النجوم سلیمانؑ کا تختِ پرّاں) پر بیٹھا ہوا جا رہا تھا (جسے جن اڑائے لئے جا رہے تھے) تو عروس نے ٹھہرنے کی التجا کی تاکہ وہ اپنے محبوب وطن پر آخری نظر ڈال لے۔ عین اُس وقت وہ تخت پر پہنچے تھے اور ضرب الامثال کے اِس عمانہ خالق نے اپنی رفیقہ کی دلجوئی کے لئے جنّوں کو حکم دیا کہ وہ اِس کی چوٹی کو کھوکھلا کر کے تخت اُس میں رکھ دیں۔ ایسا ہی کیا گیا اور نازنین نے اپنی دلجمعی کے لئے اِس میدان کا منظر دیکھ لیا جسے "ڈیرہ لسل" کہا گیا ہے۔ اب یہ جگہ متبرّک ہے اور زائرین کا پسندیدہ مقام ہے۔ گو روضہ تخت کے شمال میں کچھ فاصلے پر ہے جو حضرت سلیمانؑ کا نہیں بلکہ حسبِ معمول کسی قطبِ رُشد و ہدایت، زبدۃ الدّین اور شناورِ بحرِ توحید کا ہے۔

پہاڑ کی چوٹی کا نقشہ حال ہی میں ہمارے سرویئروں نے کھینچا ہے اور یہ شیرانی علاقہ کے وسط میں ہے۔ یہ قبیلہ اپنے مشرلہ پاڑوں کے ہمراہ ہماری

سرحد سے مغرب میں دریائے ژوب اور شمال میں گومل تک بلکہ 'خونیں سرحد' کی لاوارث زمین تک پھیلا ہوا ہے جو اُنہیں محسود وزیریوں سے جُدا کرتی ہے۔ ان کی اہم بستیاں مشرق کی پست پہاڑیوں میں ہیں اور ہمارے اور ان کے درمیان خشک ترین اور بنجر ترین طویل اور تنگ وادیاں حائل ہیں جو جنوب میں قیصرانی علاقے تک جاتی ہیں اور ان میں متعدد اور تنگ شگاف ہیں جیسے گومل، زاؤ، درابند اور داہری جو میدان میں جانے کے راستے ہیں۔ تخت کا اُبھار اور بالائی وادیاں پُر اشجار ہیں لیکن بیشتر شیرانی علاقے بے شجر اور عام طور پر بنجر ہیں۔ ان میں سے خانہ گزیں قبیلے جو اپنے گلے اُونچی ڈھلانوں پر چراتے ہیں ہمارے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھتے ہیں لیکن جو قریب ترین (لیکن تھوڑے سے) ہیں وہ ہم سے گریزاں ہیں اور ان کے ایک دو حصّے تو قانون شکن اور لوٹ مار وغیرہ کے بھی عادی ہیں۔ سکھ دور میں اُنہوں نے درابند کو لوٹا اور اُن کے ڈر سے کافی زمین محروم کاشت ہوگئی۔ دیگر لحاظ سے وہ غیر اہم ہیں۔ ۱۸۵۳ء میں ان کے خلاف ۲۵۰۰ پیادوں (فرنٹیئر فورسس اور ملٹری پولیس) کی ایک مہم بھیجی گئی جو وسط علاقہ سے گذری۔ ان کے دفاع کو تہس نہس کر آئی اور اپنی ایک جان کا بھی نقصان کئے بغیر درابند واپس آ گئی۔ سب قبائل کی متحارب نفری ۲،۵۰۰ سے زیادہ نہیں اور اکثریت ہمارے ساتھ خوشگوار تعلقات کے حق میں ہے۔ سبق سیکھنے کے بعد وہ بہتر رویّہ کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن وہ پٹھانوں سے بھی زیادہ پٹھان یعنی جمہوری ہیں اور سرداروں کو خاطر میں نہیں لاتے بلکہ ان کے بعض اڑیل افراد تو جرگہ تک کو نہیں مانتے۔ برطانوی

علاقے میں چھوٹی موٹی چوریوں (جو ان کے معتبرین تسلیم کرنے کے باوجود روکنے سے قاصر رہے) کی وجہ سے ۱۸۸۳ء میں ان کی ناکہ بندی کر دی گئی اور انہوں نے کاملاً ہتھیار ڈال دیئے اور پھر ہم نے انہی کی مدد سے ۱۸۸۴ء میں تخت کا سروے کیا جو سروے دشمن پٹھان علاقے میں ہماری سرحدی پالیسی کی ایک عظیم فتح تھی۔

عموماً درمیانے قدوقامت، شوخ خط و خال اور اُبھرواں رخساروں والے شیرانی چست، جفاکش، وحشی اور جیدار ہیں لیکن قوّت وغا میں وزیریوں سے واضح طور پر کمتر درجے کے ہیں۔ غریب تر قبائلیوں کا لباس شاذ و نادر ہی کمر کے گرد ایک کمبل اور کندھوں پر ایک دوسرے کمبل سے زیادہ ہوتا ہے۔ البتہ سردار ایک غلیظ قمیص، ڈھیلی ڈھالی شلوار اور چکنی پگڑی کا اضافہ کر لیتا ہے اور اپنے ژولیدہ سیاہ بالوں کو ایک میلی کچیلی زرد وز ٹوپی سے قابو میں رکھتا ہے۔ اُس کے بڑے بڑے ڈونگا نما جوتے کسی وقت سُرخ اور زرّیں ہوتے تھے اور اگر کبھی وہ اپنی عیب پوش بھیڑ کی پوستین کے نیچے ملتانی ریشم کی قمیص پہن لے تو وہ اعلیٰ ترین قسم کا بانکا بن جاتا ہے۔ ایک خمدار تلوار، ایک پُرانا انگریزی دو نالی پستول اور ایک بارودی سینگ۔ ایک شیرانی جنگجو کا نقشہ ہے جو اگر پہاڑیا ہو تو برگس اور اگر وادی کا ہو تو لرگس کہلاتا ہے۔ من حیث القبیلہ وہ غریب لوگ ہیں اور عموماً ہمارے علاقے کے باہر اور میاں خیلوں کے ہاں نوکر ہیں۔ وہ دیر سے شادی کرتے ہیں اور دیگر پٹھانوں کے برعکس دُلہن کا باپ دلور کی بجائے خود جہیز دیتا ہے۔ وہ قدیم ترین خاندان کے مسلّمہ سربراہ کو اپنا

قائد یعنی نیکہ (دادا) مانتے ہیں اور اسے جنس میں لگان ادا کرتے ہیں۔ روپیہ یہاں کمیاب ہے جس کی ایک وجہ اُن کا نظام تبادلہ ہے۔ ان کا اہم پیشہ زراعت ہے جو آبپاشی کے بغیر ناممکن ہے۔ ان کے پاس اُونٹ سرے سے نہیں، تھوڑے سے گدھے ہیں اور دیگر جانور بھی کم ہیں۔ تخت سے ایندھن بکثرت ملتا ہے اور اسی سے وہ سردی دور کرتے ہیں۔ اونچائیوں پر وہ مکان پہاڑ کے اندر کھدائی کر کے بنا لیتے ہیں اور رات کو دروازہ خاردار درخت کی شاخ سے بند کر لیتے ہیں۔ ان کی تجارت برطانوی علاقے تک محدود ہے جہاں ان کے بہت سے لوگ ہر سال آتے ہیں اور اکثر ضروریات زندگی کے لئے اُن کا دارومدار ہمارے اُوپر ہے۔

وہ یقیناً خوشحال ہو سکتے ہیں بشرطیکہ وہ ہمارے ضبط میں آ جائیں، میدانوں میں زیادہ تعداد میں بسائے جائیں، آبپاشی میں ان کی مدد کی جائے اور تجارت کے لئے سرمایہ فراہم کیا جائے۔ تخت اتنا بلند ہے کہ اس کی حربیاتی اہمیت و افادیت نہیں ہو سکتی تاہم یہ ایک سینی ٹوریم ضرور بن سکتا ہے۔ اس کی جاں پرور آب و ہوا، صنوبر کے شاندار درخت اور حسین مناظر اسے ڈیرہ اسمٰعیل خان کی چھاؤنی سے بدرجہا بہتر گرمائی مقام بنا سکتے ہیں اس پر پہنچنا کسی حد تک مشکل ہے، سال کا کچھ حصہ پانی کمیاب ہوتا ہے (کم از کم ہمارے فوجیوں کو یہ محسوس ہوا) لیکن یہ کمی حوض آب سے پوری ہو سکتی ہے۔ بہرحال اس پر قبضہ سے ہمیں وادیٔ گومل و ژوب کے لئے ایک بہت اچھا تجارتی راستہ حاصل ہو سکتا ہے!

شیرانی علاقہ کے جنوب میں بڑے بین الدریائی فراز میں مختلف النوع وحشی قبائل آباد ہیں جن میں اُسترانا قبیلہ بڑا ہے جس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ایک نیک سیّد نے شیرانیوں کے ہاں شادی کر لی تھی۔ ان کی زیادہ تر زمینیں سرحد پار ہیں یعنی پست بیرونی پہاڑیوں کے درّوں سے ماورا دیہات میں گو انکی کافی تعداد اُس کے میدانوں میں آباد ہو چکی ہے۔ کوئی ایک صدی پہلے تک وہ سراسر شبانی یا پوندہ لوگ تھے۔ پھر موسیٰ خیلوں سے ایک لڑائی کے بعد وہ زراعت پر مجبور ہوئے۔ ان کا علاقہ بنجر اور ریتلا ہے جہاں صرف بارانی پانی ہی سرمایۂ حیات ہے لیکن وہ اچھے خوش طبع، امن پسند اور منضبط لوگ ہیں اور بہت سے ہماری فوج اور پولیس میں بھرتی ہوتے ہیں۔ دوسرے قبائل خطر پسند تاجر ہیں اور زیادہ تر مویشیوں کی تجارت کرتے ہیں اور اس ضمن میں بنگال سے قندھار تک سفر کرتے ہیں۔ ان کے دو بڑے طبقے یا حصے ہیں۔ وہ جو بلوچوں کی طرح لمبے بال رکھتے ہیں اور دوسرے جو چھوٹے بال رکھتے ہیں اور یہ دونو ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں جیسے سترھویں صدی کے انگلستان میں کیولیئر اور راؤنڈ ہیڈ تھے۔

ان دونو کے مشرق میں اور ان کے اور دریائے ژوب کے درمیان الیسوٹ اور زمرے ہیں جو کاکڑ ماخذ کے خانہ بدوش قبائل ہیں۔ دونو غیر اہم امن پسند اور غیر جارح ہیں، تجارت کا خاص ملکہ نہیں رکھتے اور تھوڑی بہت تجارت ہمارے ساتھ ہی تعلقات پر منحصر ہے۔ تخت کے مغربی طرف مٹھی بھر فقیر موسومہ بہ ہری پال کاملاً شیرانیوں پر دارومدار رکھتے

ہیں اور ان کی ایک اور بستی (شیخ حیدر کی اولاد) زرکنی میں ہے جو درّے کے مشرقی دروازے پر ایک گاؤں ہے جو پوندوں کا قبرستان ہے۔ ژوب سے پرے اور دریا اور غلزئی علاقہ کے درمیان مندوخیل ہیں جو کاکڑ کی ایک اور شاخ ہے۔ یہ بھی امن پسند اور زراعت کار لوگ ہیں اور شاذ و نادر ہی بیوپار کے لئے ہمارے علاقہ میں آتے ہیں۔ یہ قریباً سب کے سب برطانوی مفادات کے طرفدار ہیں اور ہمارے زیر اثر ہیں۔ درّہ گومل (جسے کھولنے کے لئے سر رابرٹ سنڈیمن کے تحت مذاکرات کی رفتار تسلّی بخش ہے) کا نام ٹانک سرحد کی وادی اور گاؤں کے نام پر ہے گو دریائے گومل اپنے طول میں مختلف نام اختیار کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ ڈیرہ اسماعیل خان میں لونی بن جاتا ہے۔ اسے عام طور پر پوندہ تاجروں سے منسوب کیا جاتا ہے اور صرف غزنی کا دروازہ خیال کیا جاتا ہے لیکن اصل میں یہ انتہائی جنگی اور تجارتی اہمیت کی شاہراہ ہے کیونکہ سلیمان سلسلہ سے بل کھا کر کھجوری کچھ (کھجوروں کا میدان، حالانکہ یہاں نہ کھجور کے درخت ہیں اور نہ میدان سوائے پتھریلے دریائی پاٹ کے) پہنچنے یا گومل اور ژوب کے ندیوں کے سنگم کے بعد، سڑک دو حصّوں میں بٹ جاتی ہے۔ ایک ژوب کے ساتھ ساتھ دو راستوں سے مغرب اور جنوب مغرب میں پشین اور قندھار کو چلی جاتی ہے اور دوسری شمال مغرب میں گومل کے ساتھ ساتھ غزنی پہنچ جاتی ہے۔ سنگم تک اس کی چھان بین کر لی گئی ہے، ریلوے سروے شروع ہونیوالا ہے اور وادئ ژوب سے پشین کا راستہ بھی جانا پہچانا ہے۔ اس میں شیخ حیدر، دُراپند اور

ڈھنا درے بھی آتے ہیں جو ایک دوسرے سے لنگلی وادیوں سے ملے ہوئے ہیں جو بقول میجر ہولڈچ نہ صرف تخت بلکہ پورے سلسلہ کا طغرائے امتیاز ہیں درابند گومل سے بھی سیدھا راستہ ہے لیکن بعض جگہوں پر چونے کے پتھر کی گھاٹیاں یا ان کے تنگ راستے ناقابلِ عبور ہیں۔ ڈھنا اب پہلے سے بہتر ہے اور یہ تینوں گاہے ماہے (درابند، ڈھنا اور شیخ حیدر یا زادم) راہِ قائم کا کام بھی دیتے ہیں۔

مغربی راستے کا بالائی حصہ غیر مانوس ہے۔ کچھ فاصلہ طے کر کے وادئ ژوب کے بعد یہ کنڈل میں داخل ہوتا ہے اور اس کے سرے تک جاتا ہے اور پھر گومل اور رملند کے بین الدریائی فراز کو پار کر کے ایک اہم جگہ معروف کو جاتا ہے جو قلاتِ غلزئی سے چالیس میل ہے۔

شمال مغربی شاخ محسود وزیری علاقہ کے بعد سرونڈی کوتل کے راستے کوہتک سلسلہ سے گذرتی ہے جو سلیمان خیل غلزیوں کا علاقہ ہے یہ ۵۰۰،۷ فٹ اونچا ہے اور پھر کٹواز اور شلگر علاقے سے ہوتی ہوئی غزنی تک پہنچتی ہے۔ اس آخری راستے کی پوندہ تجارت زیادہ تر سلیمان خیل، خروٹی اور ناصر قبائل کے ہاتھ میں ہے جو آب ایستادہ کے جنوب اور مشرق اور مذکورہ سلسلہ کے ہندوستانی رُخ کے میدانوں میں آباد ہیں۔ یہ سامانِ تجارت شاید ہی اس سلسلہ سے بہت دور افتادہ علاقوں سے آتا ہوگا۔ لیکن اگر یہ آتا بھی ہے تو اسے یہی جیالے قبائل لاتے ہیں جن کے کردار پر پہلے لکھا جا چکا ہے۔

جونہی ضروری قبائلی انتظامات مکمل ہو جائیں گے تو گومل کی فوری حفاظت

کے لئے ایک بہت اچھی، ہمہ موسمی فوجی سڑک ضروری ہے جو وادیٔ ژوب سے ہوکر پشین تک جائے اور ہر پیشہ فون کے لئے موزوں ہو۔ یہ سڑک قندھار کے نقطۂ نظر سے اُس سڑک سے بھی زیادہ مفید ہے جو فورٹ منرو کے ذریعے ڈیرہ غازی خان سے نکالی گئی ہے۔ معروف اور قلات غلزئی کو ایک ضمنی راستہ اس کے بعد ہی نکلے گا۔ تیسری ضرورت علاقہ سلیمان کے ذریعے غزنی تک ایک اچھا تجارتی راستہ ہوگی جو داور وادی کے راستے غزنی تک ریلوے کی توسیع (یا براستہ خیبر براہ راست کابل تک) کے بعد بھی پہلو کی حفاظت کے طور پر بیش بہا ہوگی لیکن ریلوے لائن کے بعد یہ ثانوی اہمیت کی ہو جائے گی۔

درّہ گومل کی سرحد پر لاوارث زمین کے شمال میں ہمیں ایک زبردست قبیلہ سے سابقہ پڑتا ہے اور وزیری سرحد کے فتنہ انگیز ترین لوگوں میں سے ہیں۔ اِن میں سے اہم ترین محسود وزیری ہیں جن کا علاقہ وادیٔ گومل کے انتہائی سرے پر اُرمان درّہ کے ذریعے ہمارے علاقے سے ملتا ہے گو اس علاقے تک شاہراہ جنڈولہ کے قریب درّہ ٹانک سے گذرتی ہے اور باقی علاقہ بھٹانیوں سے محصور و مسدود ہے لہٰذا موخرالذکر پر پہلے توجہ دیتے ہیں اور وزیریوں اور وزیرستان پر بعد میں۔

بھٹانی (یا بھٹان کی اولاد جو قیس یا کیش کا تیسرا بیٹا تھا، قیس ہی وہ نامی گرامی پٹھان ہے جو مدینہ گیا اور واپسی پر اسلام ساتھ لایا اور تمام موجودہ افغان قبائل کا بانی مبانی بنا) چالیس میل یا وادیٔ گومل سے کوہ گبر تک (ضلع بنوں) ہمارے ہمسائے ہیں۔ کوئی پچاس برس پہلے تک وہ صرف پہاڑیوں میں رہتے

تھے لیکن اب ٹانک میدان میں بھی کافی آباد ہیں اور تین اہم قبائل میں سے ایک کی تو یہاں کافی زمینیں ہیں۔ ٹانک کو مروت سے جدا کرتا ہوا حصّہ کوہ شیخ بدین کے سینی ٹوریم تک بھی بھٹان کہلاتا ہے۔ ان کے مغربی حواشی وزیریوں کے پاس ہیں جنہیں ہماری سرحد تک آنے کے لئے اُن کے علاقے سے گذرنا ہوتا ہے۔

دونوں کم و بیش متخالف ہیں گو ماضی قریب تک بھٹانی ہمارے علاقہ پر یلغار میں وزیری کی معاونت کرتا تھا۔ اپنے اونچے نسب کے باوجود وہ ابھی بربریت سے نکل رہے ہیں۔ ان کے مقبوضات پتھریلے اور غیر مزروعہ ہیں۔ گاؤں چھوٹے چھوٹے اور نشیبوں میں چھپے ہوئے ہیں اور ان کے گھر محض گھاس پھوس اور مٹی کے چھپّر ہیں۔ مضبوط اور چُست ہونے کے ساتھ ساتھ وہ سادہ لوح اور فضول خرچ ہیں۔ "ایک سو بھٹانی ایک سو بھیڑ کھائے گا" ایک مشہور دیہاتی مذاق ہے۔ موقعہ ملنے پر پکّے چور ہیں لیکن زیادہ تر مخبر اور رہنما بن کر اپنے زیادہ تر طاقتور ہمسایوں، وزیریوں کے معاون رہے ہیں اور "وزیریوں کے شغال" کہلاتے ہیں۔ ان کی مجموعی جنگی افرادی قوّت ۳۰۰۰ سے زیادہ نہیں اور ان کے گاؤں ہمارے رحم و کرم پر ہیں۔ کافی دیر تک وہ کم و بیش بداندیش رہے لیکن ۱۸۷۵ء میں درّے کی ذمّہ داری قبول کرکے وہ راہِ راست پر آگئے ہیں اور چند سال سے وزیری شیر اپنے جنگلے میں بند ہے اور بھٹانی شغال نے شکایت کا کوئی موقعہ نہیں دیا۔

دسواں باب

افغان روایات

اکثر مشرقی مورخین کے مطابق افغان اپنے آپ کو یہودی النسل سمجھتے ہیں گو وہ گمشدہ قبائل میں سے نہ ہوں۔ وہ اکھٹے ہرات میں لے گئے۔ اُن کے دُکھ سُکھ میں شریک رہے لیکن بعد میں بچ نکلے اور ارسارتھ میں پناہ گزیں ہوئے جسے بعض موجودہ ہزارہ بتاتے ہیں۔ ان کی اپنی روایات شام کو اصلی وطن قرار دیتی ہیں جہاں سے بخت نصر اُنہیں لے گیا اور فارس اور میڈیا میں بکھیر دیا جہاں سے وہ مشرق میں کوہِ غور میں آ گئے۔ شرق ہرات میں، آنحضورؐ کی ساتویں صدی میں بعثت کے وقت مگر غور کے بعد وہ کابل و قندھار میں بھی پھیل گئے تھے۔ ایک مستند ترین فارسی تاریخ بلا شبہ بنو اسرائیل نامی لوگوں کا ذکر کرتی ہے جو تیرھویں صدی میں چنگیز خان کی فتح ایران کے وقت یہاں آباد تھے۔ استناد کا زور ان کے سامی ماخذ کے حق میں ہے۔ افغان اور یہودی خط و خال میں گہری مشابہت ہے اور اکثر حالات میں تو تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے لیکن یہ بات تو کشمیری اور افغان پر بھی صادق آ سکتی ہے حالانکہ دونوں غیر متعلق ہیں۔ یہودی نام اتنے عام ہیں کہ ان کے بعض شجراتِ نسب توریت شریف کے ابواب معلوم ہوتے ہیں لیکن قدیم قبائلی نام مختلف ہیں۔ نجیب الطرفین قبائل کی مخصوص رسوم

میں قدیم لادیانہ قوانین کی جھلک ہے۔ جانور قربان کرنے کی عید فصح جیسی رسم، بلا سے محفوظ رہنے کے لئے دروازے پر خون کے دھبے ڈالنا، قربانیوں کا نذرانہ، کفر گو کو سنگسار کرنا، قرعہ سے زمین کی میعادی تقسیم اور ختنہ و طہارت (جو مسلمانوں اور یہودیوں کی مشترک رسمیں ہیں) وغیرہ ان رسومات میں شامل ہیں۔

ان کے برعکس ان کی زبان (خواہ وہ سخت شمالی پختو ہو یا نرم جنوبی پشتو) تمام مکاتیب فکر کے لحاظ سے عبرانی یا کلدانی سے کوئی تعلق نہیں رکھتی بلکہ آریہ السنہ کے فارسی زمرہ کی ایک شاخ ہے۔ آرأ مختلف ہیں، علمیت نظریئے کے خلاف ہے بالخصوص اُن علماء کی جو اِن لوگوں سے واقف نہیں اور جو انہیں خوب جانتے ہیں وہ دل ہی دل میں احساس رکھتے ہیں کہ افغان ماہر انساب اور مورخ کے مفروضات (اپنی بیہودگی کے باوجود) اپنے اندر ایسا مواد رکھتے ہیں جس کا بغور مطالعہ ایک صحیح نتیجہ اخذ کرنے میں مددگار ہو سکتا ہے۔ ان کی زبانی اور تحریری روایات انہیں شاہ اسرائیل یا طالوت سے ماخوذ قرار دیتی ہیں جو علم و دانش اور حرب و ضرب پر یکساں قادر تھا، ایک ایسا ملک جو ذہن و تصور کے لحاظ سے اپنے لوگوں کا سرتاج تھا۔ یہ کہانی انہی کے انداز میں زیب دیتی ہے۔

مولوی نعمت اللہ کہتے ہیں کہ ہر صاحب دانش و بینش اور عالم متبحر جانتا ہے کہ افغان قوم، اس کے قبائل اور ان کے قبولِ اسلام کے اہم واقعات اور اچھوتے حقائق وقائع نگاروں نے کیوں ٹھیک طرح پیش یا رقم نہیں کئے۔ اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ جب سے حضرت موسٰیؑ نے فرعون کو مغلوب کیا اور جب

سے بخت نصر (ساحرِ عظیم) نے قبطیوں کو ملک بدر اور زیست و نابود کیا اور اسے شام (فلسطین) زیر کرنے، یروشلم کو مسمار کرنے اور بنی اسرائیل کو تباہ کرنے کا موقعہ ملا، یہ لوگ مسلسل کوہ و صحرا میں مقید رہے اور اسلامیت اور اس کے ارکانِ خمسہ کے سوا کوئی علم ان میں جڑ نہ پکڑ سکا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ملک سارل یا طالوت (سلطان سربلند، ان کا مورثِ اعلیٰ جس کے قبیلہ ابن یامین کے ذریعے ان کا شجرۂ نسب یعقوبؑ، اسحاقؑ، ابراہیمؑ اور نوحؑ سے ہوتا ہوا حضرت آدمؑ تک پہنچتا ہے) کے وقت سے لے کر تختِ ہند پر سلطان بہلول لودھی کی جلوہ افروزی تک ان میں کوئی آدمی مسندِ بادشاہت تک نہ پہنچ سکا اور گلستانِ علمیت اور گوہرہائے دانش عظیم و جلیل بادشاہوں کی زیرِ سرپرستی ہی پروان چڑھتے ہیں۔

لیکن جن لوگوں نے روایات محفوظ رکھی ہیں اور قدیم ادوار کے واقعات حفظ یاد کئے ہیں اُن کے مطابق بنیامین بن یعقوبؑ کی اولاد میں ایک قیس یا کیش تھا جس کو اپنے والد اور چچا سے ورثے میں صرف چار بھیڑیں ملیں۔ قیس کا ایک بیٹا تھا، عالم میں انتخاب، نام تھا سارل لیکن بوجہ طویل القامتی سب اسے طوالوت یعنی طالوت کہتے تھے۔ وہ چاروں بھیڑوں کی دیکھ بھال کرتا تھا اور اپنے گدھے پر نیل سے پانی بھی لاتا تھا۔ ایک دفعہ دو بھیڑیں کھو گئیں اور طالوت انہیں ڈھونڈ رہا تھا تو لوی قبیلہ کے نوجوان اسماعیل سے ملاقات ہوئی جس نے طالوت کے سر پر ایک سینگ کے تیل سے مالش کی جو فوراً ہی تاج میں بدل گیا اور اس نے طالوت کو بحیثیت ملک اور شاہ بنی اسرائیل سلام کیا۔ سارل نے

لوی قبیلے کی دو خواتین سے شادیاں کیں۔ اِن میں سے ایک سے ایک بیٹی پیدا ہُوئی جس نے اُسے بارہ بیٹوں کے خاندان میں صغیر ترین، داؤدؑ سے بیاہ دیا جس نے عمالقہ قبیلے سے جنگوں میں ایسے ایسے کارہائے نمایاں کئے تھے کہ اُسے ریاست کا مدار المہام بنا دیا گیا اور وہی سارل کا جانشین ہُوا۔ سارل کی موت کے فوراً بعد انہی دو بیویوں سے ایک ہی وقت دو بیٹے، برقیہ اور ادمیہ پیدا ہُوئے۔ داؤدؑ نے دونو بیواؤں سے بہت مہربانی کا سلوک کیا اور ان دونوں میں سے ہر بیٹے کو ایک ایک قبیلہ کی حکومت سپرد کی۔ فضلِ ربی سے ان کا اقتدار بڑھتا گیا، ان کی شجاعت و شہامت کے ڈھنڈورے پٹتے گئے اور ہر دشمن کے خلاف وہ فتح و نصرت کے جھنڈے اُڑاتے رہے۔ اِس پر داؤدؑ نے انہیں مزید ترقیاں دیں۔ برقیہ وزیر اعظم بنا اور رارمیہ سپہ سالار۔ ان کے نظم و نسق سے لوگ آنند کے تار بجانے لگے اور کاشت کاری اور آبادی دس گُنا بڑھ گئی۔ ان دونو کے ہاں ایک ایک باکمال لڑکا پیدا ہُوا، برقیہ کے ہاں آصف اور رارمیہ کے ہاں افغانہ۔ اپنے اپنے والدین کی وفات کے بعد یہ دونو سلیمانؑ بن داؤدؑ کے دَور میں انہی مناصب جلیلہ پر فائز ہوئے۔ افغانہ نے بیت المقدس (یروشلم) کی تعمیر (جو داؤدؑ نے شروع کی تھی) بھی مکمّل کروائی۔

ان کی اولاد بڑھتی رہی۔ آصف کے یہاں اٹھارہ اور افغانہ کے چالیس لڑکے پیدا ہُوئے۔ پھر عزرائیل خدائے غفور الرحیم کی طرف سے سلیمانؑ کی رُوح قبض کر کے لے گیا اور وہ بلقیس سے بھی الوداعی ملاقات نہ کر سکے۔ کوئی قبیلۂ بنی اسرائیل ان کا ہم پلہ نہ تھا۔

وقت گذرتا گیا اور پھر مشیتِ الٰہی کے تحت بخت النصر نے شام فتح کیا اور بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ وہ اسے معبود و مسجود بنائیں لیکن افغانہ کا قبیلہ آبائی مذہب پر ڈٹا رہا جس کی وجہ سے وہ زیرِ عتاب و عذاب رہا اور پھر یہ دونوں قبیلے کوہستان غور (بنو آصف) اور کوہستانِ فیروزہ (بنو افغانہ) میں پناہ گزین ہوئے۔ یہاں وہ پھلتے پھولتے رہے اور گرد و پیش کے کفار کو للکارتے اور موت کے گھاٹ اتارتے رہے اور کوہستان کابل، قندھار اور غزنی تک پہنچ گئے۔ اسی وقت ان کا ایک حصّہ عرب چلا گیا کہ داؤدؑ و سلیمانؑ کا معبد کھو کر انہیں خانہ کعبہ پر متمکز و معتکف رہنا چاہیئے۔ یوں وہ مکّہ کے قرب و جوار میں بس گئے اور خدائے رحیم و کریم کی حمد و ثنا پڑھتے رہے۔

سلیمانی دَور کے پندرہ سو سال بعد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا نیرِ نبوّت طلوع ہُوا اور تمام عرب شرفِ مشرّف بہ اسلام ہو گئے اور صرف مٹھی بھر مُہر زدہ لوگ اِس نعمت و سعادت سے محروم رہے۔ نو سال بعدِ نبوّت ایک اسرائیلی خالد بن ولید سیف اللہ (جو حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے تھے اور جن کی اولاد اب بھی خالدی افغان کہلاتی ہے اور ہماری سرحد پر بنگش قبیلہ انہی کا مظہر ہے) نے کوہستانِ غور کے افغانوں کو بذریعہ مُراسلہ ختم المرسلینؐ کے ظہور کی خبر دی۔

اِس خط کے بعد غور کے کئی سردار مدینہ کو روانہ ہو گئے۔ اِنہی میں اور سب سے طاقتور، افغان سردار قیس تھا جس کا شجرۂ نسب ۳۷ ویں درجے پر سارل، ۴۵ ویں پر ابراہیمؑ اور چھ سو تیسرے درجے پر حضرت آدمؑ سے ملتا ہے۔ ان کے پہنچنے کے فوراً ہی بعد یہ حضرت خالد (خلیل) کے توسط سے

دربارِ رسالتؐ میں پیش ہوئے اور آنحضورؐ پر ایمان لے آئے جنہوں نے اُنہیں بے شمار دعائیں دیں، ان کے عبرانی نام عربی ناموں سے بدلے۔ قیس عبدالرشید بن گئے اور موروثی لقب اُنہیں مستقلاً تفویض کر دیا۔ رخصت ہوتے وقت آپؐ نے قیس کو پٹھان کا لقب بھی عطا فرمایا جس کا سریانی میں مطلب ہے 'پتوار'۔ گویا ایک تشبیہ (بموجب وحی جبرائیلؑ) دی کہ قیس دین میں اپنے ہموطنوں کے رہنما ہوں گے اور جہازِ خلائق کے پتوار ہوں گے۔ عبدالرشید پٹھان نے نُورِ اسلام اِس انہماک سے پھیلایا کہ تھوڑے سے عرصے میں بیشتر آبادی اِس سے منوّر ہو گئی (گویا راہِ جہنم اختیار کر لی[۱]) اور ان میں بے شمار فقراء و صوفیا و اولیاء پیدا ہوئے جو قول و فعل میں ممتاز اور گفتار و کردار کے غازی تھے ان کی آبادی بھی خوب بڑھی اور قیس کی منکوحہ، بنتِ خالد سے علی الترتیب تین بیٹے پیدا ہوئے۔ سڑبن، بیطان یا بٹھان اور غورغشت اور تینوں سے بے شمار بیٹوں اور قبائل نے جنم لیا۔ خواجہ مزید رقمطراز ہیں کہ اللہ سائیں نے سڑبن بن پٹھان کو دو بیٹے عنایت فرمائے۔ شرخبونؔ اور خرشبونؔ۔۔۔ لیکن اب ہم نعمت اللہ اور ان کے رفقا سے رخصت ہوتے ہیں

---

[۱] بدیں عقل و دانش بباید گریست! افسوس کہ مصنف نے اپنا حقِ قلم آزمائی 'قلم در کفِ دشمن است' کے مصداق اِستعمال کیا اور یہاں آ کر بے نقاب ہو گیا۔ وہ مصنف و مؤرخ نہ رہا بلکہ صلیبی سورما بن گیا اور یہ اکثر یورپی علماء و فضلاء کا خاصہ ہے! (مترجم)

جنہوں نے اس کی حمایت کی اور پراگندہ و پیچیدہ شجرات نسب کو جمع کر کے ترتیب دیا اور مستند تواریخ کے منصوبے بنائے جو بے نظیر اہمیت کے ساتھ ساتھ بے نظیر طوالت کے بھی حامل ہیں۔

قیس کے انہی بیٹوں سے سب افغان قبائل برآمد ہوئے، کوئی ۴۰۰ زئی اور خیل؛ پشاور تا قندھار کے افغان سرٹبن کے دو بیٹوں سے ہیں پہلے کے پانچ بیٹوں سے ابدالی (یا درانی) ترین، شیرانی اور کھیتران چلے اور دوسرے سے یوسف زئی، محمد زئی، مہمند، داؤد زئی وغیرہ (جو میدان پشاور کے ارد گرد ہیں اور شاید قدیم گندھاریوں سے پیوست ہوئے ہیں) بیطان کی بیٹی اور اس کے ایرانی فداکار سے غلزئی، لودھی اور سوری (ہندوستان کے دو حکمران خاندانوں کے بانی) برآمد ہوئے۔ غورغشت کے تین بیٹوں سے (غالباً کافی ترک اور سیتھی آمیزش اور جاٹ اور راجپوت کے اختلاط سے) خالص پٹھان ابھرے یعنی کاکڑ، وزیری، شیتک، توری، خٹک، آفریدی وغیرہ۔

آخری قبائل میں سے بعض کی اپنی مخصوص روایات ہیں اور گو یہ خود کو افغانوں میں شامل نہیں کئے جاتے یا موالی سمجھے جاتے ہیں تاہم وہ غالباً اسی نسل سے تھے لیکن کسی نہ کسی وجہ سے کافی دیر تک اسلام پذیر نہ ہو سکے۔ ان میں تعداد و طاقت کے لحاظ سے اہم ترین کرّائی یا کرلانی کہلاتے ہیں۔ ان کے بھی کئی خیل اور زئی ہیں اور اپنی وجہ تسمیہ کی کئی روایات کے مالک ہیں جو مشکوک ہونے کی بنا پر افغان کہاوت " واللہ اعلم " کے تحت ہی آسکتی ہیں۔

لیکن "افغان" اور "پٹھان" کی اصطلاحات گمراہ کن ہیں۔ اہل ہند سب پشتو

بولنہاروں کو پٹھان اور کبھی کبھار اہلِ کوہ (= روہ) کو روہیلہ کہتے ہیں - ان کا ملک بھی ابھی حال ہی میں افغانستان کہلانے لگا ہے ورنہ یہ خراسان کا حصہ تھا اور لوگ قبائل سے پہچانے جاتے تھے جیسے درّانی، غلزئی لیکن سب اپنے کو پختون (پختان) کہہ کر فخر محسوس کرتے تھے اور اسی سے ہندوستانی لفظ 'پٹھان' بنا۔ افغانستان کے تمام پٹھان افغان نہیں جیسے آئرستانی انگریز یا سکاچ آئرستانی نہیں لیکن وہ سمجھے یہی جاتے ہیں اور جیسے سکاچ، آئرش اور ویلزی جو انگریزی بولتے ہیں انگریز کہلاتے ہیں، ایسے ہی پشتو بولنے والے پختون یا پٹھان کہلاتے ہیں۔

ہندوستان میں دو نسلے بھی پٹھان کہلاتے ہیں جیسے یوریشین یوروپی کہلاتے ہیں لیکن سرحد میں پشتو بولنے والا ہی پٹھان کہلاتا ہے اور اگر وہ امیر کابل کے علاقہ میں ہو تو افغان، خواہ افاغنہ سے اس کا دور کا تعلق بھی نہ ہو۔

گیارھواں باب

سرحد کا سوئٹزرلینڈ

تختِ سلیمان کے دامن میں خونیں سرحد اور سفید کوہ کی برف پوش چوٹیوں کے درمیان وزیرستان کا وسیع علاقہ ہے جو شمال مغربی سرحد کا سوئٹزرلینڈ ہے۔ دشوار اور بلند پہاڑیوں، گہری اور سنگلاخ گھاٹیوں کی یہ سرزمین بہادر اور سخت جان لوگوں کا گہوارہ ہے جو ٹل کے ہموطنوں کی طرح آزادی پسند، محب الوطن اور مشترکہ دشمن کے خلاف متحد ہیں۔ جغرافیائی اور سیاسی لحاظ سے دونوں کئی باتوں میں مشترک ہیں اور گومل اور لوچی یا داوی وادی (جس کے وسط میں طاقتور ترین وزیری قبیلہ کا صدر مقام کنی گورم ہے) کے درمیانی مجمع الجبال پر یہ بات اور بھی زیادہ منطبق ہوتی ہے، مشرقی رُخ بھٹانیوں کی عُریاں پہاڑیوں سے محفوظ ہے جن کے ماوراء دو طرفہ ڈھلوان چٹانوں کے درمیان گھاٹیاں ہیں جو کہیں کہیں ایک سو سے ایک ہزار گز چوڑی زرخیز وادیوں کو جنم دے کر پھر تنگ ہو جاتی ہیں۔ اکثر ان کا دہانہ ایک تنگی[۱] ہوتا ہے جہاں سے پانی بہتا ہے اور جو اسے زاویہ قائمہ پر کاٹتے ہوئے سلسلے سے نکلتا ہے اور یوں ایک

---

[۱] تنگی۔ لفظی معنی کمر

زبردست قدرتی محافظ کا کام کرتا ہے۔ اِن وادیوں اور دوسرے مختصر زرخیز قطعوں میں (جو پہاڑوں کے دامن میں اُبھرتے ہیں اور کاچے کہلاتے ہیں اور لوئے سلسلے کا طغرائے امتیاز ہیں) اچھی خاصی کاشت ہوتی ہے جسے نہایت احتیاط سے مختلف السطح کھیتوں میں بدلتے ہیں اور پہاڑیاں کاٹ کاٹ کر سیراب کرتے ہیں۔ کھیتوں میں پانی دینے کے لئے فنی مہارت اور اُپج قابلِ داد ہیں۔ کھیتوں کے کناروں پر بید اور شہتوت کے درخت لگائے جاتے ہیں اور مالکوں کے مکان اوپر منظر خیز ڈھلانوں پر ایستادہ ہوتے ہیں جہاں وادی پتھروں اور چٹانوں سے مملو ہو کر تنگی بن جاتی ہے (عام طور پر دشوار گذار لیکن برسات میں مستانہ وار نالے کی گذرگاہ) وہاں قدرت نے وزیری کو نہایت ساز گار قدرتی دفاعی مورچہ دے دیا ہے جس کے عقب کی وادیاں خیمہ گاہیں اور رسد گاہیں بن جاتی ہیں۔ وادیٔ داور تنگ اِس میں سیدھے درّے نہیں ہیں گو ڈیرہ اسماعیل خان سے آنیوالا ٹانک زم اور بنّوں سے آنے والے شکتو اور قیصر دریا اِس کے وسط تک جا پہنچتے ہیں۔ مغرب کی طرف یہ اور بھی ناقابل رسائی ہے اور یہ عملاً کابل سے آزاد رہا ہے۔ پہاڑی قلعوں کی ایک طویل قطار میں محفوظ اور کافی قدرتی وسائل سے مالا مال اور مضبوط جسم و جان کی وجہ سے وزیری نہ بھوکے مرتے ہیں نہ امیر کابل کی کسی فوج سے مغلوب ہو سکتے ہیں۔ خود ہم ۱۸۶۰ء میں کنی گورم پہنچنے کے لئے ۷،۰۰۰ آدمی لے کر چلے اور ۳۵۰ کھیت رہے حالانکہ ہم زیادہ آسانی سے بوقتِ ضرورت اِس پر غلبہ پا سکتے ہیں۔

یہ اہلِ کوہ بنیادی طور پر خود حاکم و خود محکوم ہیں۔ یہ بہادر جنگجو ہیں لیکن اس سے بھی زیادہ یہ قزاق ہیں۔ بنّوں کے نسبتاً مہذب درویش سے لے کر (جسے ٹوٹا نہ ملے تو بائیسکل ہی اُڑا لے گا) درشت محسود تک (جسے قدیم ترین، راسخ ترین اور عادی ترین ڈاکو کہا گیا ہے) یہ میلان بہت نمایاں ہے اور وہ اس پر نازاں ہے ہر ایسا بھیس وزیری کو زیب دیتا ہے۔ پوندہ اس کی کستورا مچھلی ہے اور وہ ہر وقت شمشیر بدست اس کی گٹھڑیاں کھولنے، اس کا گلا کاٹنے اور اس کا سامان واپس دروں میں پہنچانے کے لئے اُدھار کھائے بیٹھا رہتا ہے۔ وہ تعداد میں بہت اور باہمی چپقلشوں کے باوجود ہماری شمال مغربی سرحد کے غالباً متحد ترین لوگ ہیں۔ خاندانی اور خونی جھگڑے بے شمار ہیں (یہ ہر قبیلے کا ناگزیر سامانِ تفریح ہے!) لیکن ان کے جمہوری ادارے (جیسے تقسیم زمینات) اور اس علاقے میں ان کے پھیلاؤ کا انداز باہمی آویزش کو غیر معمولی نہیں ہونے دیتے اور (قدرتی محفوظ حیثیت سے مل کر) وزیرستان انہی وجوہ پر آزاد رہا ہے۔ وزیریوں کی مجموعی جنگی افرادی قوت ۴۰،... سے زیادہ ہوگی اور محاسن کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہمارے وسائل میں ایک بیش بہا اضافہ ہو سکتا ہے اور سرحدبندی مکتبِ خیال کے لئے یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے!

قبائلی لحاظ سے وزیری بھی بے شمار اہم اجزاء میں منقسم ہے جن کو گنوانا صرف طوالت مہمل ہوگا۔ اور نہ ہی وزیر بن سلیمان کا شجرۂ نسب مختلف موساؤں، محمودوں اور محسودوں (جو اَب بھی پسندیدہ قبائلی نام ہیں) پر ہوتے ہوئے سارل یا قیس سے ہی جوڑنا فائدہ مند ہوگا۔ اہم ترین پاڑے درویش خیل

اور محسود ہیں۔ چند قبائل پارے جیسے لالائی سفید کوہ (یاسپین جاہ جسے وزیری اپنا اصلی وطن بتاتے ہیں) کی ڈھلانوں اور کچھ گربازخوست کی سرحد پر رہتے ہیں لیکن کرّم کے شمال میں ان کی تعداد قلیل ہی ہے۔ درویش خیل کے دو بڑے حصے ہیں اتمان زئی اور احمد زئی جو نزولی ترتیب میں درجہ بدرجہ تقسیم ہیں۔ پہلے حصے کرّم کے دائیں طرف ہیں۔ خوست اور داور وادیوں کے درمیان کی پہاڑیوں پر مقیم۔ کچھ ہماری سرحد کے اندر زمینیں کاشت کرتے ہیں یا بیوپار کے لئے آتے ہیں۔ ایک اور حصہ کابل خیل انتہائی وحشی، قانون شکن اور شرارت و شیطنت میں شرکت کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے اور بہت مشکلات کا باعث بنتا ہے۔ ایک سال میں انہوں نے بیس چھاپے مارے اور ایک سفاکانہ حملے میں تو انہوں نے چودہ بنوّچی گاؤں لوٹے اور جلا دیئے۔ اِسں پر نکلسن (جسے اب وہ دیوتا سمجھتے ہیں) ۱۵۰۰ آدمی لے کر ان کے علاقے کے وسط تک گھس گیا اور اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ ۱۸۵۹ء میں وہ دوسری مہم لائے لیکن چیمبرلین نے ناک چنے چبوا دیئے اور بہادر خیل اور نمک کی کانوں پر حملہ کا بدلہ اُتار لیا۔ احمد زئی کرّم کے بائیں کنارے پر ہیں، بنّوں کے شمال میں گو اب ان کا قریباً نصف حصہ ہماری سرحد کے اندر بس گیا ہے۔ کرّم اور گمبیلا کے کناروں پر دو تو زرخیز زمینوں پر کاشت کرتے ہیں اور رہی بھری پہاڑی ڈھلانوں پر جانور چَراتے ہیں۔ اُن کی اصل بستیاں اونچائی پر ہیں لیکن مستقل گاؤں خال خال ہی ہیں۔ وہ عموماً گِری یا پڑاؤ میں رہتے ہیں جن کے گرد پتھروں کی دیواریں بنا لیتے ہیں۔ یہ خیمے ہوتے ہیں جو خمدار چھڑیوں پر مضبوط اُونی کمبل ڈال کر بنائے جاتے ہیں، بالکل اَفغانستانی

کوٹھڑیوں کی طرح، جن کے اندر ہی اندر اُن کے جانور اور اُونٹ ہوتے ہیں اور عظیم الجثہ، خونخوار نسل کے خاندانی کتے ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ ان کی مستقل ملکیت دامانِ کوہ میں بکھرے ہوئے قبائلی قبرستان ہیں جن کی وہ بیحد عزت اور تکریم کرتے ہیں۔ ان کا بدنام ترین چور بھی مزارات کی کسی چیز کو ہاتھ لگانا گناہ سمجھتا ہے۔ درویش خیل کے دونو حصوں کی زمینیں ٹوچی یا داور وادی کے گرداگرد ہیں گو اندرونِ وادی ان کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ یہاں ایک علیحدہ نسل آباد ہے۔ پست قد، پست اخلاق اور پست ہمت، لیکن حیران کُن بات یہ ہے کہ وزیریوں نے ان سے نفرت وحقارت کے باوجود ان داوڑیوں کو اپنے علاقے کی اتنی اہم شاہراہ پر کیسے برداشت کیا ہے حالانکہ وہ غیر ہیں اور وزیری اپنے ہمسایوں پر دست اندازی کو اپنا حق سمجھتے ہیں؟

داوڑیوں اور ٹوچی کا ذکر آئندہ آئے گا کیونکہ یہ ہمارے لئے اہم ترین راستوں میں سے ہے۔ فی الحال محسود وزیریوں کا ذکر ضروری ہے جن کا علاقہ کنی گورم کے ارد گرد ہے۔ ان کے تین بڑے حصے ہیں۔ بہلول زئی، علی زئی اور شمن خیل — اوّلین قزاقی میں میرِ کارواں ہیں اور چونکہ ڈکیتی حکومتِ برطانیہ کی پالیسی کے خلاف ہے لہٰذا وہ ہمارے بدترین دشمن ہیں۔ اس ضمن میں وزیرستان اور سوئس ایلپس کے باسیوں کے درمیان مقابلہ غیر ضروری ہے۔ وزیرستانیوں کا یہ دعوٰی کہ سلاطین اور خاندان آئے اور گزر گئے لیکن وہ واحد افغان قبیلہ ہیں جو آزاد رہا اور شاہی لشکر کبھی ان کے قلعوں کو سر نہ کر سکے ان کے لئے کچھ ہمدردی تو پیدا کر سکتا ہے لیکن وہ ایک لحاظ سے سب سے زیادہ قابلِ نفرت لوگ ہیں کیونکہ وہ پہلے

درجے کے نراجی ہیں، صرف من مانی کرتے ہیں اور نسلاً بعد نسلاً میدان ان کی تاخت و تاراج کی آماجگاہ بنے رہے ہیں۔ زندہ دِل سوس زیادہ مہذّب ہے اور صرف ہوٹل میں ٹھہرنے والوں سے پیسے زیادہ لے کر مطمئن ہو جاتا ہے۔

بہلول زئیوں کو بھی اپنے اس دعوے میں ترمیم کرنا پڑی۔ یکے بعد دیگرے حملوں نے انگریزی حکومت کا پیمانۂ صبر لبریز کر دیا تو ۱۸۶۰ء میں جنرل چیمبرلین ملک کے وسط میں کنی گورم اور ماکین تک جا گھسا اور ماکین کو تو اُس نے جلا کر راکھ کر دیا۔ ایک دو اور مواقع پر محسودوں کی ناکہ بندی کر دی گئی اور اُنہیں نقد جرمانہ ادا کرنے کے علاوہ یرغمالی بھی دینے پڑے۔ بھٹانی درّوں میں چوکیاں قائم کر دی گئیں اور مدّتوں تک ان کے جرائم بند ہو گئے۔ ۱۸۷۹ء میں کابلی ایلچیوں کے زیر اثر یا وادیٔ کابل میں ہماری کارروائیوں سے مشتعل ہو کر وہ پھر حرکت میں آ گئے اور قبائلی لشکر میں شامل ہو کر حملہ آور ہوئے اور ٹانک کا قصبہ جلا دیا۔ اِس پر ۱۸۸۱ء میں جنرل کینیڈی ان کے خلاف حرکت میں آیا اور اُنہیں ایک دفعہ پھر احساس ہوا کہ ان کی دور افتادہ ترین گھاٹیاں اور نامحرم ترین پہاڑیاں بھی اُنہیں سزا سے نہ بچا سکتی تھیں اور بالآخر انہوں نے پٹھان قبائلی تاریخ کی سب سے زیادہ توہین آمیز سزائیں قبول کر لیں اور اپنے نصف درجن سرغنے ہمارے حوالے کر دیئے اور اتنے ہی یرغمال ڈیرہ اسمٰعیل خان بھیج دیئے۔ ایک سرغنہ لاہور میں مارا گیا اور باقیوں کو گوگل کے سروے میں فرضِ محافظت ادا کرنے اور اچھے رویّہ کی بنا پر ۱۸۸۴ء میں رہا کر دیا گیا۔

جسمانی لحاظ سے وہ ایک عمدہ نسل ہیں، طویل القامت، مضبوط الاعضاء، جیالے اور جیدار اور کئی باتوں میں پُرشکوہ وحشی؛ مار دھاڑ میں بے حد سفّاک،

مرد دشمن کو کبھی زندہ نہ چھوڑنے والے (خواہ یہ ایک علزئی لڑکا ہو اور نہ ہی علزئی کسی وزیری کو قابو آنے پر چھوڑتا ہے) لیکن دوسری طرف یہی وزیری اتنے جوانمرد ہیں کہ کبھی عورتوں کو مارنا تو ایک طرف، لوٹتے بھی نہیں۔ وہ اس احترام نسوانیت پر بجا طور پر فخر کرتا ہے۔ دوسرے پٹھانوں کی طرح یہ بھی مہمان نواز ہیں اور مہمانوں کو گاؤں میں موجود مرد عورتیں ہر کلہ راشے کہہ کر خوش آمدید کہتے ہیں اور درجے کے مطابق خاطر مدارات کرتے ہیں۔ وہ عموماً جاہل، ناخواندہ اور توہم پرست ہوتے ہیں۔ ان کا علم خطرناک حد تک محدود ہوتا ہے اور وہ ملّا، اخوند اور ہمہ نوعی فقراء کی بہت تعظیم کرتے ہیں اور اُن سے تعویذ لکھواتے ہیں، گنڈے بنواتے ہیں، نذر نیاز کرتے ہیں، زیارتوں پر جاتے ہیں اور بیماریوں میں انہی سے رجوع کرتے ہیں اور یوں ان کے گھر بھرتے ہیں۔ اکثر بیماریوں کا علاج یکساں اور آسان ہے اور اس کے تحت مریض کو ایک تازہ مذبوحہ بھیڑ کی کھال میں بند کر دیتے ہیں حتیٰ کہ وہ پسینہ پسینہ ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسے جلاب دیا جاتا ہے اور خشک روٹی، اچھی آب و ہوا اور مضبوط جسمانی ساخت اور قوتِ مدافعت، یہ سب مل کر اُسے دوبارہ چاق و چوبند بنا دیتے ہیں۔

لیکن دیگر پٹھانوں کے برعکس انہیں عزت و ناموس کا پاس ہے اور ان میں حق گوئی کا جوہر بھی ہے۔ بہت سی وزیری رسمیں خود ان کے لئے بھی عجیب و غریب ہیں۔ بدکاری پر وہ عورت کو مار دیتے ہیں لیکن آدمی کی ناک کاٹ ڈالتے ہیں گو بعض اوقات عورت بھی کم سزا پر بچ نکلتی ہے۔ ان کی عورتیں پردہ نہیں کرتیں بلکہ آزادی سے مردوں کے ساتھ رہتی ہیں۔

دُولہا دُلہن کو اپنے سسر سے خریدتا ہے۔ ایک نوجوان قابلِ شادی لڑکی ۶۰ سے ۱۵۰ روپے تک ملتی ہے لیکن وہ اپنے ساتھ پچاس ساٹھ لونڈیاں لاتی ہے اور ان سے دوگنے جوان اور پھر وہ دھما چوکڑی مچتی ہے کہ خدا کی پناہ! اس میں ڈھول کی تھاپ کے ساتھ رقص بھی شامل ہوتا ہے۔ خون کا بدلہ خون ہے لیکن قدیم ایام کے وزیری سفید ریشوں نے یہ قاعدہ نافذ کیا کہ صرف اصلی قاتل ہی نشانۂ انتقام بنے تاکہ ایک خون کے بدلے متعدد خون نہ ہوں، اس کا دائرہ نہ پھیلے اور یہ موروثی نہ بنے۔ خون بہا کی رقم بھی وزیریوں نے بہت رکھی ہے جو ۱،۳۰۰ روپے ہے جس میں سے آدھی نقد اور آدھی جنس میں دینی پڑتی ہے جس میں دو لڑکیاں بھی شامل ہوتی ہیں جو سَو سَو روپے کے برابر سمجھی جاتی ہیں۔ مقتولہ کا خون بہا آدھا یعنی ۶۵۰ روپے اور ۵۰ روپے کی لنگی ہے۔ آنکھ اور کسی عضو کی معذوری ۵۰۰، تلوار کا پہلا نصف انچ زخم ۱۲۰۵۰، ناک کے لئے ۲۵۰ اور کان کے لئے ۱۰۰ روپے کا خون بہا عائد کرتی ہے۔

لیکن وزیریوں کے متعلق اہم بات ان کی نسلی خصوصیات سے زیادہ اتنے بڑے جنگجو اور آزاد قبیلے کی ہماری سرحد پر موجودگی ہے جسے عسکری مفادات کے تقاضوں کے تحت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ابھی دو تین سال پہلے ہی امیر کے کارندے محسودوں کو اپنے دام میں لا کر چوکیاں بنانا اور اُن سے برائے نام محصول بھی لینا چاہتے تھے، لیکن وہ ناکام رہے۔

گویا برطانوی اثر کے پھیلنے کا دروازہ کھلا ہے اور امیر سے

تعلقات کی کشیدگی کا بھی کوئی خطرہ نہیں - یہ موقع جاتا رہے گا اگر کسی وقت کابل فوج نے اِس علاقے میں قدم جما لئے اور اگر ہم نے سرگرم مداخلت نہ کی تو حکومتِ کابل کا ایسا اقدام دائرہ امکان کے میں اندر رہے ؛

بارھواں باب

خُون بہا

آیا بنی افغان اور بنی اسرائیل ایک ہیں اور آیا اَرسارتھ (جہاں دس قیدی قبائل نے بالآخر پناہ لی) موجودہ علاقہ ہزارہ ہے یا نہیں؟ اِس میں کوئی شک نہیں کہ پوری افغان یا پٹھان نسل بہت سی یہودی رسومات، رِیتوں، روایات اور قوانین کے علاوہ قدیم لادیانہ نظریئے پر بھی کاربند تھی یعنی "جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت، ہاتھ کے بدلے ہاتھ اور پاؤں کے بدلے پاؤں" ـــ اِس انتقامی انصاف کی بھونڈی سی شکل بنی یوسف یعنی یوسف زئیوں میں موجود ہے اور اِس کا اطلاق ہر جُرم پر ہوتا ہے۔ اگر الف 'ب' کی کوئی چیز چُرالے تو 'ب' کو بھی الف کے کسی بھی ہم قبیلہ کی ویسی چیز چُرانے کا حق ہے اور الف کے ہم قبیلہ کو اس کی بدعنوانی کے لئے تاوان دینا ہی پڑتا ہے۔ اگر الف گرفت سے بچ نکلے اور 'ب' کا مقروض ہو جائے تو موخرالذکر بھی اسی آسان طریقے سے الف کے کسی ہم قبیلہ سے وہ رقم وصول کرسکتا ہے۔ اگر الف 'ب' کا بیل مار دے اور جرگہ تصفیہ نہ کرا سکے تو 'ب' الف کے لوگوں کا کوئی بیل مار دے گا۔ اگر الف 'ب' کو مار ڈالے تو جرگہ اوّل الذکر کو مقتول کے ورثا اور مختاروں کے سُپرد کر دے گا تاکہ جو

سلوک چاہیں کریں۔ اگر وہ حوالے نہ کیا جائے تو پھر موروثی خونی دشمنی چلے گی اور کوئی سمجھوتہ کارگر نہ ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ 'ب' کا کوئی عزیز باہر ہو، شاید کسی برطانوی رجمنٹ میں تو وہ اُس کے کمانڈنگ افسر کے پاس آئے گا اور اشد ضروری نجی کام کے لئے چھٹی لے گا، گھر جائے گا اور الف یا اُس کے کسی ہم قبیلہ کو مارے گا اور یُوں بدلہ چکا کر اور عزت بحال کر کے وہ واپس آ جائے گا اور اپنا فرض ادا کرنے پر خوب فخر محسوس کرے گا۔ یوسف زئی اِس قانون پر حرف بحرف عمل کرنے کی وجہ سے بدنام ہیں اور سمجھوتہ نہیں کرتے۔ ان کی اکثریت کسی نہ کسی ایسے معاملے میں ملوّث رہی ہے۔

سوات میں ان طریقوں کی کئی قسمیں رائج ہیں۔ اگر 'ب' کی جائداد چوری ہو جائے تو وہ الف یا کسی سے بھی (جس پر اُسے شک ہو) سیّد (یعنی معزز و معتبر انسان) بطور شاہد کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ اور اگر وہ اس کی بے گناہی کی قسم کھالے تو 'ب' کو طوعاً و کرہاً اُسے بے گناہ سمجھنا پڑتا ہے۔ اگر ایسا سیّد نہ مل سکے تو الف مجرم ہے اور 'ب' اس کے مطابق اُس کے ساتھ سلوک روا رکھ سکتا ہے۔ ایک اور سادہ سا طریقہ ہے جو متنازعین کو امن برقرار رکھنے پر مجبور کر سکتا ہے کیونکہ اُس کے تحت فریقین کو گاؤں بدر کر دیا جاتا ہے اور ان کے شہری حقوق، بیوی، بچے، گھر اور جائداد چھین لئے جاتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو ضبط کر لئے جاتے ہیں اور اُنہیں دوسرے دیہات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جاتا ہے حتےٰ کہ وہ تو تنگ آ کر ایک دوسرے سے صلح صفائی کر لیتے ہیں۔

اِس قاعدے کا اطلاق خاص طور پر معتبروں پر ہوتا ہے لیکن یہی لوگ

ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے ہیں۔

بیکن کے مطابق انتقام ایک قسم کا وحشیانہ انصاف ہے اور گو اسے حضرت موسیٰؑ نے نافذ کیا تاہم یہ خاص فائدہ مند نہیں ہے۔ اگر ایک آدمی اپنے ہمسائے پر کوئی زیادتی کرے تو شاید جوابی زیادتی جائز ہے لیکن آنکھ کے بدلے آنکھ یا دانت کے بدلے دانت نکال دینا نہ صرف نفع بخش نہیں بلکہ انتہائی تکلیف دہ بھی ہو سکتا ہے اور اگر یہ ابتدائی اسرائیل کو ایسا محسوس نہیں ہوا تو کم از کم معاملہ فہم پٹھان نے نقصانات کی ایک قیمت مقرر کر لی اور قتل سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے جرم تک قیمت کی درجہ بندی کر دی۔ خون بہا کا نظریہ افغانستان میں ہر جگہ لاگو اور چالو ہے اور کسی نہ کسی شکل میں سرحدی پٹھانوں میں بھی موجود ہے۔ الفنسٹن کے مطابق مغربی افاغنہ کے ہاں ایک قتل کا ازالہ بارہ عورتوں سے ہو سکتا ہے جن میں سے چھ جہیز دار اور چھ بے جہیز ہونی چاہئیں۔ عام طور پر جہیز ساٹھ روپے فی عورت ہوتا ہے جو جزوی طور پر جنس میں ادا کیا جاتا ہے ایک ہاتھ یا کان یا ناک کے بدلے چھ عورتیں، ایک دانت توڑنے کے لئے تین عورتیں (جو یقیناً زیادہ ہیں، ایک ماہر دندان کے خلاف بھی) اور پیشانی سے اوپر کے زخم کے لئے ایک عورت دینا پڑتی ہے لیکن پیشانی سے نیچے کے زخم کے لئے معافی ہی کافی ہے بشرطیکہ یہ سال کے اندر اندر مندمل ہو جائے۔ ہماری سرحد کے قریب لوگ نوجوان عورتوں کی بجائے روپیہ کو ترجیح دیتے ہیں اور اگر مظلوم خود یا اُس کے رشتہ دار شادی شدہ ہوں یا وہ پسند کرے تو وہ نرا روپیہ ہی مانگ سکتا ہے۔

برزئی ہمندوں میں خون بہا ۱,۲۰۰ روپے ہے اور یہی اغوا کے لئے ہے جس کا دو تہائی شوہر یا مقتول کے ورثا کو ملتا ہے اور ایک تہائی جرگہ کو۔ اگر یہ ادا نہ کیا جائے تو مجرم کو جلاوطن کر دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے رشتہ داروں کو اپنی برتیت میں اور جرگہ کی ضیافت کے لئے ۱۰۰ روپیہ بھی دینا پڑتا ہے۔ اغوائے بیوہ کی قیمت نصف ہے۔ بندوق کے زخم کے لئے ۶۰۰ روپے دینے پڑتے ہیں لیکن بندوق خوشحال لوگوں کی عیاشی ہوتی ہے۔ تلوار رکھنا پرانے دستور کے مطابق ٹم ٹم رکھنے کی طرح معززانہ سمجھا جاتا ہے اور تلوار کے زخم کی قیمت ہمندوں کے ہاں ۱۰۰ روپے، خنجر کے زخم کی ۵۰ روپے اور پتھر کی عامیانہ چوٹ کی صرف ۲۵ روپے ہے۔

محمود وزیریوں نے ایک دفعہ ہمارے ساتھ امن قائم رکھنے کے لیے معذرت کی کہ وہ کبھی کبھار کی چوریوں اور حملوں کی بندش کے ضامن نہ ہو سکتے تھے جو بسا اوقات بعض افراد کو نقصان پہنچا دیتے تھے لہٰذا انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ ہماری حکومت اس کے بدلے ان کے کاروانوں کو باقاعدہ لوٹ کر نقصان پورا کر لیا کرے۔ ان کا پیمانہ ۶۰۰ روپیہ خون بہا، ۲۰۰ روپیہ بازوؤں یا ٹانگوں یا اعضائے کے کاٹنے کا اور چھوٹے چھوٹے نقصانات کا علیحدہ پیمانہ تھا۔ اس کے علاوہ وہ ہمیں یرغمال دینے کے لئے تیار تھے۔ کوکی خیلوں نے ایک برطانوی افسر کا قاتل تو نہ دیا لیکن ۳,۰۰۰ روپیہ خون بہا دے دیا اور جب اتمان خیلوں نے سوات نہر کے ہمارے قلیوں کو مار ڈالا (ابازئی پر) اور کاوگزی اور بٹنی نے ان کے دیہات پر شبخون مار کر انہیں مجبور کر دیا تو انہوں نے جرمانے کے علاوہ ۲۰۰ روپیہ فی مقتول قلی اور ۱۰۰ روپیہ فی مجروح قلی دینا منظور کیا۔ آٹھ مقتول

قتیلوں کے لئے ۲۰۰ روپے فی قتل اور مجروح قتیلوں کے لئے ۱۰۰ روپے فی قتل انہوں نے ادائیگی بھی کر دی۔

لیکن ان معاملات میں قرینہ کے لحاظ سے کوئی قبیلہ وزیریوں کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ اس نے یا اس کے آباؤ اجداد نے مدتوں پہلے اس رسم و رواج کو قانون کی شکل دی اور اس کے فوجداری قوانین بھی تین سو سال پرانے ہیں۔ ان کے قابلِ غور حصے تین ہیں (۱) وہ جرائم جو کسی شخص (جان) کے خلاف ہیں (۲) جو جائیداد سے متعلق ہیں (۳) جو عورتوں سے متعلق ہیں۔ اس میں حلف برداری، فیصلہ بذریعہ آزمائش اور ان کو بروئے کار لانے کے اقدامات بھی شامل ہیں۔ قتل کی درجہ بندی آلات یا ذرائع مستعملہ سے کی جاتی ہے۔ گولی، چاقو، خنجر، رسّی سے گلا گھونٹ کر مارنا یا گلا کاٹنا سب برابر کے جرائم ہیں۔ تلوار کی کاٹ سے موت زیادہ تکلیف دہ سمجھی جاتی ہے لہٰذا اس پر جرمانہ زیادہ ہوتا ہے۔ اگر مقتول کے وارث آتشِ انتقام میں جلتے ہوں تو وہ قاتل کو مار سکتے ہیں اور اس کا گھر لوٹ سکتے ہیں لیکن اگر پہلا قتل گولی سے ہو اور دوسرا تلوار سے تو اسے طریقۂ قتل کی تبدیلی کے بدلے ۱۰۰ روپے بطور معاوضہ دشمن کے ورثاء کو دینا پڑتے ہیں۔ اگر پہلا نشانہ عورت ہو تو قاتل کا دایاں پاؤں یا اس کا ناک کاٹ دیا جاتا ہے۔ ان جرائم کا مالی مبادلہ علی الترتیب ۱۲۰۰ اور ۶۰۰ روپے ہے۔ اسے اکثر و بیشتر پیداوار یا دیگر اشیاء کی صورت میں دیا جاتا ہے جن میں عورتیں بھی شامل ہوتی ہیں (۱۰۰ روپیہ فی عورت کے حساب سے جو من مانی قیمت سمجھی جاتی ہے اور عملاً اس سے کم شمار اور ادا کی جاتی ہے)۔

۱۸۶۰ء میں کابل خیل وزیریوں کے خلاف مہم کے بعد ان کے اور تحصیل کے برطانوی دیہاتیوں کے درمیان ایک امتیازی معاہدہ ہوا۔ مذاکرات تین دن تک جاری رہے اور طرفین نے قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کر ان کی تصدیق کی۔ پہلی شرط یہ تھی کہ طرفین پرانے تنازعات کو ختم کر دیں گے، دوسری یہ کہ جنگ وجدل بند کر دی جائے گی اور تیسری یہ کہ کوئی فریق قانون کو اپنے ہاتھ میں نہ لے گا بلکہ تمام تنازعات ایک برطانوی افسر کے سپرد کر دیئے جائیں گے۔ چوتھی شرط کے مطابق خون بہا مندرجہ ذیل رکھا گیا: پٹھان کو مارنے پر ۱۲۰۰ روپے اور ہنچ آدمی کو مارنے پر ۳۶۰ روپے، پٹھان کو ہاتھ یا پاؤں سے معذور کرنے پر ۵۰۰ روپے (جس میں ایک بیٹی: ۸۰ روپے دینا بھی شامل تھی) اور ایک ہنچ آدمی کو معذور کرنے پر ایک بیٹی دینا اور اس کے دروازہ پر ریاضت کفارہ کرنا شامل تھا۔ پٹھان کے انگوٹھے یا انگشتِ شہادت کے بدلے ۶۰ روپے اور تین دوسری انگلیوں کے لئے بھی ۶۰ روپے اور ہنچ آدمی کی انگلی کے لئے ایک بکری یا ایک بھیڑ بموجب فیصلہ جرگہ۔ ڈکیتی کا کفارہ حلفیہ ثبوت کے ذریعے دیا جا سکتا تھا۔

قتل کے مشکوک معاملات کا طریقہ بے حد سادہ ہے۔ مشتبہ شخص اپنے قبیلے کے سو آدمی معتبرین کے سامنے حاضر کرتا ہے جو اس کی بے گناہی کی قسم قرآن حکیم پر اٹھاتے ہیں لیکن اگر آدمی تھوڑے ہوں تو وہ اتنی ہی زیادہ قسمیں اٹھاتے ہیں یا وہ خود بھی اتنی ہی قسمیں اٹھا سکتا ہے (جو عورت کی صورت میں پچاس رہ جاتی ہیں) اگر اس کے بعد مظلوم فریق اُسے مار دے تو وہ خود مجرم بن جاتا ہے۔ جسمانی ضرب کے لئے وزیری قانون معذوری یا نیم قتل کے بدلے ۶۰۰ روپے

لیتا ہے اور رکمر اور پاؤں کے درمیان معمولی ضرب کے لئے ۲۰ روپے ۔ اس سے بھی چھوٹے جرم کے لئے مظلوم اپنے رفقا کی مدد سے جارج کو زمین پر گرا دیتا ہے، اُسے جان سے مارنے کی دھمکیاں دیتا ہے اور کورے وہ ئوں کے سامنے اس کی بے عزتی کرتا ہے یا پھر صرف ۳ روپے لے کر مطمئن ہو سکتا ہے جیساکہ عام طور پر رواج ہے۔

یہ اس قانون کے چند نمونے ہیں جو تشدّد اور چوری (نسوانی عزت اور سامان) کا مداوا کرتا ہے۔ اس کی اصولی اہمیت کچھ بھی ہو بہر حال یہ پُرانے نظریہ کے مطابق ہے کہ بے قانونی سے بُرے قوانین ہی بہتر ہیں اور اس کی وجہ سے وزیریوں میں بہت سے فتنے اور کشت وخون رُکے ہیں!

تیرھواں باب

وادئ داور یا ٹوچی

قلب افغانستان میں جانیوالی ایک اہم شاہراہ کے طور پر وادئ داور کا پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے۔ یہ کافی چھوٹی ہے اور بعض باتوں میں گومل کی نسبت زیادہ سہولت بخش ہے۔ اگرچہ تجارتی لحاظ سے یہ کبھی زیادہ اہم نہیں ہو سکتی تاہم عسکری نقطۂ نظر سے اس کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہے کیونکہ یہ غزنی سے براہ راست رابطہ پیدا کرتی ہے اور کابل پر لغلی نقل و حرکت میں کارآمد ہے۔ یونانی قبضہ اور ابتدائی ہندو اقتدار کے دور میں یہ یقیناً مغربی افغانستان اور ہندوستان کے درمیان مسلسل اور بلاواسطہ رابطہ کا ذریعہ رہی ہوگی۔ درّوں کے دہانوں پر بڑی بڑی ڈھیریاں اور وادی کے طول و عرض میں بکھرے ہوئے کھنڈرات پرانے زمانے کے عظیم اور ترقی یافتہ شہروں کا پتہ دیتے ہیں اور محمود غزنوی کے ہندوستان پر بیشتر حملے بھی اسی راستے سے ہوئے ہوں گے جن میں اس کا نشانہ براہ راست پشاور نہ ہوتا تھا اور اکرہ کے کھنڈرات میں بدھ زیورات اور ہندو مورتیوں کے ٹکڑوں اور ٹوٹی ہوئی اینٹوں اور ظروف کے درمیان سینکڑوں غزنوی سکے از ابتدا تا انتہائے خاندان ملتے ہیں جنہیں موسلا دھار بارشیں منظر عام پر لے آتی ہیں اور یوں یہاں کی مستقل قیام گاہوں کی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

دیگر دروں کی طرح تنگ دہانے صرف ہندوستان کی طرف ہیں اور شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ پورا راستہ بتوں کی نسبت غزنی کی طرف سے کافی مشہور و مستعمل رہا ہے حالانکہ یہ دہانے ہماری چوکیوں سے صرف چند میل دور ہیں اور گھوڑسوار صرف ایک سفر صبح میں ہماری چھاؤنیوں سے ان تک پہنچ سکتا ہے۔

دیگر مشہور منصوبہ ہائے عمل کی طرح سرحد سے بھی تین راستے کھلے ہیں جو سب قابلِ عبور ہیں اور زیادہ لمبے بھی نہیں، راستے جنھیں عزم نہایت سہل بنا سکتا ہے لیکن برطانوی حکومت ان کے سلسلہ میں کچھ ایسے خوف پاکیزہ میں مبتلا ہو جاتی ہے گویا ان کے عقب میں مقام کفارہ (ڈانٹے کی آسمانی طربیہ کے مطابق) ہو۔ اپنی ہمنام بیرونی چوکی کے عین مقابل ٹوچی کا راستہ ہے جو محض ایک پگڈنڈی ہے، سخت، پتھریلی لیکن عام طور پر ہموار اور زیادہ سے زیادہ نو میل لمبی ہے۔ شمال کی طرف باران ہے جو زیادہ چٹانی اور چکر دار ہے اور جس میں کوئی بیس میل کا چکر ہے۔ یہ گاؤں الیوری کے پاس وادی میں داخل ہوتا ہے۔ تیسرا راستہ خسورہ درے کا ہے جو ٹوچی کے کوئی چھ میل جنوب میں ہے جو ۱۸۶۰ء میں محسود مہم کی واپسی پر استعمال کیا گیا۔ یہ تینوں میں سے آسان ترین اور بہترین راستہ ہے گو طویل ترین ہے اور وادی میں پہنچنے سے پہلے پچیس میل کا سفر طے کرنا پڑتا ہے۔

ایک دفعہ ان قریباً ویران پہاڑیوں کے حقیر سے سلسلہ کو پار کر جائیں تو وادی، بلکہ وادیاں (کیونکہ یہ دو ہیں، بالائی اور زیریں داور جو ایک تنگی کے ذریعہ جدا ہوتی ہیں) ایسے میدانوں میں پھیلی باقی ہیں جو زرخیز، پیداوار اور مزدعہ

ہیں اور دریائے ٹوچی (برطانوی علاقہ میں موسومہ بہ گمبیلا) انہیں سیراب کرتا ہے اس کے کناروں پر خوب خوشحال دیہات آباد ہیں؛ دیوار بند اور لگلی میناروں سے محفوظ اور یہ سب جدران کی پہاڑیوں میں مشرقی ڈھلان میں واقع شیرانیہ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ پہاڑیاں بالائی وادی کا سرا ہیں اور اس راستے سے ہندوستان کے ساتھ ہونیوالی تجارت کی وسعت انہی سے متعین ہوتی ہے۔ شیرانیہ سے آگے بھی کئی راستے ہیں جو اتنے میدانی، مشہور یا کشادہ نہیں ہیں لیکن تازہ ترین معلومات کے مطابق کوئی خاص مشکل بھی نہیں ہیں۔ سلسلہ کو پار کر کے (جو دریائے سندھ اور ہلمند میں گرنے والی ندیوں کے درمیان حدِّ فاصل بھی ہے) آسان ترین اور سیدھا راستہ ارغون (وزیریوں کا ورغن) اور درّہ کوٹانی کے پاس سے کوہ جدران کے مغربی دامن میں واقع سرافزا کو جاتا ہے اور وہاں سے شیل گڑھ کے ذریعے غزنی پہنچتا ہے جو ہمارے مقامی متجسّین کے مطابق فوجی نقل وحرکت کے لئے زیادہ دشوار نہیں۔ مفصّل معلومات ہنوز دستیاب نہیں۔ آخری متجسّین میں سے ایک (جو ایک سیّد تھا) کو مشکوک سمجھا گیا اور غزنی میں نظر بند کر دیا گیا اور پھر اسے کابل لے گئے جہاں اس کے جائزہ نامے چھین لئے گئے گو اُسے بالآخر ہندوستان آنے کے لئے رہا کر دیا گیا۔ ان معلومات اندوختہ اور مختلف مہمات کے دوران کھینچے ہوئے خاکوں سے علاقے کے عام خد و خال کافی حد تک واضح ہو گئے ہیں۔

زیریں وادی دلدلی زمین کی بناء پر کسی حد تک بخار آلود ہے گو بتوں کی

حد تک نہیں لیکن بالائی وادی ہر لحاظ سے ساز گار ہے اور اِس کے ہرے بھرے ہموار اور وسعت افزا سطوح مرتفع ہیں جو خاصی زرخیز ہیں اور درجۂ افزودآب ہوا کی مالک ہیں۔ وہاں ایسا مورچہ بنایا جا سکتا ہے جو افغان سرحد کے بعض بہترین حصوں پر قادر ہو سکتا ہے اور بعض بہترین اور قوی ترین آزاد قبائل پر گرفت قائم کر سکتا ہے۔ جنوب کی طرف برمل کے فراز ہیں جن کا حال ہی میں جائزہ لیا گیا ہے جہاں سے ٹوچی کا بڑا دھارا نکلتا ہے اور چالیس پچاس میل اسی میں شمال کی طرف بہہ کر ایک اچانک اور تیز موڑ کے ذریعے بالائی داور میں داخل ہوتا ہے اور پھر سندھ کی طرف بہتا ہے۔ میجر ہولڈچ کے مطابق دریا کی گذرگاہ برمل کی لمبائی میں ایک اچھی سڑک کی نشان دہی کرتی ہے اور پھر ایک آسان درّے کے راستے ایک حدِ فاصل کے پار جنوب میں گومل کے دریائی نظام سے مل جاتی ہے۔ پرانی کوھنک پہاڑیوں (جو سلسلۂ جدران کی جنوبی تسلسل ہیں) کی مشرقی ڈھلان سے گومل کا ایک اہم معاون دُوا گومل نکلتا ہے جس کا ہنوز جائزہ نہیں لیا گیا لیکن جو کشادہ وادیوں کے راستے بہتا ہُوا وزیرستان کے جنوب مغرب میں گومل سے جا ملتا ہے۔ یہ رسل و رسائل کا دوسرا راستہ بن سکتا ہے۔ ٹوچی کا پانی خنک، شیریں اور باافراط ہے۔ بیشتر گذرگاہ میں اِس کی تہہ سخت اور پتھریلی ہے اور گاہے ماہے اِس میں طغیانی آتی ہے تاہم یہ صرف چند گھنٹوں کے لئے ہی پیادوں کے لئے ناقابلِ عبور ہوتا ہے۔ داور وادی شاذ و نادر ہی ایک میل سے زیادہ تنگ ہے اور اکثر جگہوں پر دو تین میل چوڑی ہے۔ اِس کا بیشتر حصّہ مزروعہ ہے اور کافی غلّہ پیدا ہوتا ہے اور گاؤں مرفہ الحال ہیں،

ہیں اور بہت سے ریوڑوں کے مالک ہیں۔ بہر حال کسی حد تک متنازعہ فیہ علاقہ ہے اور یہاں گرمی میں پوندے اپنے جانور چراتے ہیں لیکن سردی میں وزیری براجمان رہتے ہیں۔ اوّل الذکر غلیظ، وحشی اور ناتراشیدہ تو ضرور ہیں لیکن وہ کسی بُری آب و ہوا یا غریبانہ مُلک کے پروردہ معلوم نہیں ہوتے۔

قبائل میں عدم مداخلت کی پالیسی پر اصرار کے سوا اور کوئی وجہ نہیں کہ ایک فوج ٹوچی جائے، وزیرستان کے گرد گھومے اور گومل سے باہر نکل آئے حالانکہ اُسے کوئی کٹھنائی پیش نہ آئیگی کیونکہ محسود علاقے کو ایک آسان ترین رستہ وادئ داور سے ہی رزمک سَر کے اُوپر سے جاتا ہے۔ کوہ جدران کے مغرب اور جنوب میں ایک بسیط، لہردار علاقہ ہے جو بتدریج طویل و عریض اور ہموار میدانوں میں پھیلتا جاتا ہے۔ اِس میں کہیں کہیں الگ تھلگ پہاڑیاں ہیں اور قندھار، قلات غلزئی اور غزنی جانے کے لئے کئی آسان راستے ہیں غزنی سے کابل جانیوالا راستہ تو خاصا مشہور و مانوس ہے۔

اِس شاہراہ کے باشندوں کے سلسلہ میں لفظ داوری ایک کلمۂ تحقیر ہے۔ ایڈورڈز کے مطابق بنوچی ایک اسفل و احقر نمونہ ہے جس میں پٹھان کی تمام برائیاں فراواں فراواں موجود ہیں اور اُس کی خوبیاں معدوم ہیں لیکن داوری اُس سے بھی زیادہ بدطینت اور اسفل سمجھا جاتا ہے۔ اُس کے جنگجو وزیری ہمسائے اسے بنظرِ حقارت دیکھتے ہیں تو بنوچی اسے بدکردار سمجھتے ہیں۔ وہ دنیا بھر کی برائیوں کا ملغوبہ ہے۔ اُسے غلیظ کہنا بھی اُس کی تعریف ہوگی کیونکہ وہ اپنے سیاہ سوتی لباس کو اُس وقت تک پہنے رکھتا ہے کہ غلزئی بھی اسے متعفّن کہنے پر مجبور

ہو جاتا ہے۔ اِس سلسلے میں لسانداو ر مرد اید پہ وہ فخر کرتا ہے کیونکہ وہ نہ صرف خوراک میں گھی کا شوقین ہے بلکہ وہ اپنا سر، چہرہ اور لباس اس میں بھگوئے رکھتا ہے۔

حیات خان کہتا ہے کہ وہ گھی میں بھگویا ہوا پارۂ نان اپنی جیب یا کپڑے میں رکھتا ہے گویا یہ شیریں ترین خوشبو کی پڑیا ہو! اُس کی جلد قدرتی طور پر زرد ہے۔ جوانی میں وہ ایک آنکھ کو سیاہ اور دوسری کو سُرخ رکھتا ہے، اپنا چہرہ ہموار رکھنے کے لئے وہ بانکوں کی طرح اپنی داڑھی کے بال نوچتا رہتا ہے اور اپنی پگڑی میں پھول سجاتا ہے۔ بوڑھے جنگجو کی حیثیت سے وہ اپنے چہرے کا صرف ایک رُخ مُنڈواتا ہے، اپنے ابروؤں اور پلکوں کو سُرخ اور نیلا بناتا ہے اور خوفناک شکل سے اپنے دشمنوں کو ڈرانا چاہتا ہے۔ بڑھاپے میں پنج وقتہ نماز کا سختی سے پابند ہے لیکن شاید ہی کوئی منشی چیز ہو جس کا وہ عادی نہ ہو۔ وہ بنیادی طور پر ایک غیر جنگجو اور بے اُمنگ اِنسان ہے جو ہر وقت ڈکیتی کے لیے تیار رہتا ہے اور ہر قسم کی شیطنت کی پُشت پناہی کرتا ہے لیکن وہ اپنی وادی سے باہر نکل کر اُس کی ہمت و جرأت نہیں رکھتا اور تاجر کی حیثیت سے بنوں کے تیس میل فاصلے کو کالے کوسوں دُور سمجھتا ہے۔ وہ چند ہندو آباد کاروں پر بہت ظلم و ستم روا رکھتا ہے، اُس کی خوش وضع بیوی ہتیا لیتا ہے، بیٹے پر ٹیکس ادا کرتا ہے اور بیٹی کی شادی پر فدیہ او رگو وہ گانٹھ کا پُورا ہوتا ہے تاہم وہ دزیری ڈاکو کو پیسہ دے کر خرید لیتا ہے جو کبھی کبھار اُس پر حملہ کرتا ہے اور اُسی کی ایک کہاوت ہے کہ ایک

ڈنڈا پکڑے ہوئے وزیری سو داوڑیوں کے برابر ہے۔ اس کی غیر فطری شہوت
پرستی اسے سدوم میں بھی نمایاں کر دیتی اور اس وادی میں شاید ہی اتنے
نیک انسان ہوں گے جو داوڑ دیہات کو اس عذاب سے بچا سکیں جو
سدوم کے میدانوں پر نازل ہوا تھا۔

کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس اژدہے جانگڑوے برآمد ہوا۔ اس
کی تاریخ قدیم اور نامعلوم ہے لیکن وہ یہاں سخت جان ہمسایوں کے درمیان
صدیوں سے مقید ہے اور غالباً صدیوں سے ہی ایسا بدخو رہا ہے اور جبھی
اسے انہوں نے تنہا چھوڑ رکھا ہے تاکہ وہ صدیوں تک اپنی اس بدخوئی میں
مست رہے۔ وادی کے حواشی پر رہنے والے جنگجو قبائل اسے بار بار الحاق
سے بچاتے رہے ہیں۔ یہ دور اورنگزیب میں سلطنت مغلیہ کا حصہ تھی
اور بہادر شاہ نے بنفس نفیس یہاں آکر دولت مند باشندوں سے خراج
کے تقاضاجات وصول کئے۔ درانی عمال بھی گاہے گاہے خوست سے
اپنا مالیہ لینے کے لئے آتے رہے اور کچھ موہوم سے سکھ اقتدار کے
قصے بھی مشہور رہیں لیکن یہ اقتدار یورشوں تک ہی محدود تھا۔ اگرچہ وادئ داوڑ
برائے نام مختلف اوقات میں کابل کے ماتحت رہی تاہم یہ عملاً آزاد رہی
اور ہے۔ ۱۸۵۵ء میں حکومت ہند نے حسب معمول سرحد سے اجتناب
کی پالیسی کے تحت اپنے حقوق امیر دوست محمد کے سپرد کر دیئے لیکن نہ
وہ خود اور نہ ہی اس کے جانشین اس پر قبضہ کرنے کے اہل ہو سکے اور
کابل کے حاکمانہ حقوق پہلے کی طرح ہی محض فرضی رہے۔ لوگوں نے کئی دفعہ

برطانوی حکومت کے تحت آنے کی خواہش ظاہر کی تاکہ وہ کسی دوسری طاقت کے
فتراک میں نہ چلے جائیں بلکہ انہوں نے استدعا کی کہ اگر انہوں نے رعایا بنایا ہے
تو وہ ملکہ کی رعایا بننا پسند کریں گے ۔ اگرچہ حکومت نے اسے شرف قبولیت نہیں
بخشا تاہم حکومت ہند نے ان سے براہ راست رابطہ رکھا ہے اور بوقت ضرورت
اپنی ہی مرضی سے مہم کشی اور ناکہ بندی بھی کی ہے۔ ان کے مواقع خود داوڑیوں نے
دیئے جب وہ قتل و غارت پر اتر آئے یا دیگر دست درازوں کے ممد و معاون
ہوئے اور ابھی چند سال پہلے تک وادی بغاوت اور جنون کا مرکز بنی ہوئی تھی
لیکن داوڑی اپنے حق میں یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ وزیریوں کے خلاف ہماری مدد نہ
ملنے کے بعد ہی انہوں نے دیو باطل سے دوستی کی اور وہ باغیوں کے محافظ بنے۔
یہ سوچنا بے فائدہ ہے کہ یہ داوڑی اچھی رعایا بنیں گے یا نہیں بہرکیف وہ اچھے
سپاہی نہیں ہیں گو ان کے دو طرفہ ہمسائے بہترین سپاہی بن سکتے ہیں ۔ ان
سے پرے جدرانی ہیں جو قدیم مہمان نواز لوگ ہیں، بہترین کاریگر ہیں، لیکن
موروثی بھک منگے ہیں۔ وہ سردی میں بنوں میں مزدوری کے لئے آتے
ہیں اور یہاں "پہاڑی بھیڑیئے" مشہور ہیں کیونکہ وہ یہاں سے بہت کچھ
کما دھما اور مانگ تانگ کر لے جاتے ہیں۔ ان کی بدمزاجی ضرب المثل ہے
لیکن اپنی کم تعداد کی وجہ سے وہ غیر اہم ہوتے ہیں ۔

ٹوچی کے منابع کے نزدیک سیراب و شاداب سطوح مرتفع کے
اوپر کسی مناسب چوکی کا قیام اور شیرانیہ، ارغون اور سرافزا جیسے مقامات
پر قبضہ ہمیں غزنی بنوں شاہراہ پر بالادست بنا سکتا ہے اور اس کی

اہمیت سے انکار ناممکن ہے۔ اگر بنوں میں ہماری بجائے روسی ہوتے تو وہ یہاں ریلوے لائن بنا رہے ہوتے۔ جب یہ لائن بنوں تک مکمل ہو جائے (اور غالباً سرحدی دفاع کے پیش نظر اسے زیادہ دیر تک التوا میں نہیں رکھا جا سکتا) تو پھر کوہ جدران کی مشرقی ڈھلان تک اس کی توسیع نہایت آسان ہوگی۔ اور نہ ہی بظاہر کوئی ایسی وجہ نظر آتی ہے جو اس سلسلہ کو گومل کی طرف سے عبور کرنے کی بجائے ادھر سے عبور کرنے میں حائل ہو اور ایک دفعہ یہ عبور ہو جائے تو پھر مقامی سرویروں کے مطابق غزنی تک سیدھا راستہ ہے۔ غزنی سے بنوں تک یہ راستہ مختصر ترین ہے اور اس کے عدم استعمال کے سلسلہ میں بڑی وجہ صرف یہ بتائی جاتی ہے کہ تاجر اسے اختیار نہیں کرتے لیکن اس کی وجوہات کافی حد تک غیر طبعی ہو سکتی ہیں۔ یہ کابل قندھار شوارع آمد و رفت سے خاصا دور رہے اور پوندوں جیسے باعزم سرحدی تاجروں کے لئے بھی ایک طرف ہٹا ہوا ہے۔ اس کے باشندے پیمانہ کی دوسری انتہا پر ہیں یعنی نہ صرف اسفل ہیں بلکہ پرلے درجے کے ڈوم سمجھتے ہیں۔

اس پر قبضے کے راستے میں طبعی مشکلات یقیناً خوفناک نہیں ہیں محض رسالے کی ایک قراولی نے پوری وادی کو ہراساں کر دیا۔ ۱۸۷۲ء میں داوڑیوں کے خلاف جو واحد مہم بھیجی گئی وہ چوبیس گھنٹوں میں ہی کامران و کامگار لوٹی۔ ایک صبح فرنٹیئر فورس کے ۱،۵۰۰ جوان صف آرا ہوئے، درہ توچی کی چوٹیوں پر قبضہ کیا، ناشتہ کے وقت تک سڑک کو صاف اور توپوں کے گذرنے کے لائق بنایا۔ آگے گذر کر تین چار دیہات پر قبضہ کیا۔ ظہرانے

تک لنڈی مینار جلا دیئے، داوریوں کی اطاعت قبول کی اور اگر شام کی چائے تک نہیں تو توچی سے سب کے سب نا وقت عشائیہ کے لئے ضرور باہر نکل آئے۔

شاید فی الوقت داور وادی کا الحاق غیر ضروری ہو گا لیکن ہمارے سرویئروں، انجنیئروں اور سپاہیوں کو لازماً آزادی سے آمد و رفت رکھنی چاہیئے۔ اتنی اہم شارع رسل و رسائل کو سربمہر رکھنا جس میں تھوڑے ہی فاصلے پر چند میل لمبے درّے ہیں جن کے عقب میں ایک بڑی زرخیز وادی ہے اور جو ہمیں وسطِ افغانستان تک آزادانہ رسائی مہیا کرتی ہے ــــ اسے اپنے اوپر ایسے بند کر لینا جیسے بابِ عدن پری کے لئے بند تھا سراسر حماقت و جہالت ہے اور ہماری چوکیوں کے عین رُوبرو ایک پردہ قائم رکھنا جس کے پیچھے ایک برطانوی افسر بھی نہیں جھانک سکتا اور اس علاقے، اس کی صلاحیتوں، اس کے اہم مقامات اور اس کے قبائل کے بارے میں بھیس بدلے ہوئے مقامی متجسسین کی فراہم کردہ معلومات پر قناعت کرنا (جو دبے پاؤں اپنے خاکے کھینچتے ہیں اور فاصلوں کا تخمینہ لگاتے ہیں جن کی قطعی معلومات ہمارے لئے کسی وقت بھی اشد ضروری ہو سکتی ہیں اور جن کے خاکے نامے کسی وقت بھی ضبط ہو سکتے ہیں اور وہ خود بھی ہمارے اتحادیوں کی حوالات میں جا سکتے ہیں) مورکھ پن نہیں تو کیا ہے۔ کم از کم داور وادی اور سلسلۂ جدران میں ہمیں ایسی آزادئ نقل و حرکت تو حاصل ہونی چاہیئے جیسی کشمیر میں ہے اور ہمیں محمود کی شاہراہِ غزنی کو آڑے وقت کے لئے قابلِ عبور تو رکھنا چاہیئے جو بلا تنبیہ کسی لمحہ بھی ہم پر نازل ہو سکتا ہے!

چودھواں باب

بنوں اور بنوچی

گو ذرائع آمد و رفت کے لحاظ سے بنوں عدم التفات کا شکار ہے تاہم کئی اعتبار سے یہ اہم ترین، حسین ترین اور دلچسپ ترین سرحدی مقامات میں سے ایک ہے۔ اس کے محلِ وقوع، تاریخ، مناظر اور زرخیزی نے اسے ایک سنگلاخ علاقے میں ایک زمرد کی طرح جڑ دیا ہے اور ایڈورڈز سے لے کر یہ تمام سرحد نگاروں کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ ماہرینِ ارضیات کے مطابق یہ علاقہ آریوں کے اپنے گہوارے سے نکلنے سے پیشتر ایک عظیم جھیل تھا۔ ابتدائی واردوں کے لئے یہ "ڈنڈ" یا دلدل تھا۔ بنوزئیوں نے اس میں نالیاں کھودیں اور اناج بویا اور اسے اپنی والدہ بانو یا بنوں (شیتک کی رفیقۂ حیات) کا نام دیا کیونکہ یہ علاقہ بھی اسی کی طرح بارآور تھا اور ایڈورڈز نے (جس کی کتاب "سرحد کا ایک سال" اُسے شہرتِ دوام دینے کے لئے کافی تھی اور جس کا نام موجودہ چھاؤنی میں اب بھی موجود ہے) اس کی متعدد تصاویر کھینچی ہیں جو دلکشی اور محاکات کا شاہکار ہیں۔ وہ ایک تصویر میں کہتا ہے:

"موسم بہار میں یہ سبز بیلوں کا ایک زبرجد ہے اور سردیوں میں اس کی گوتلوں فصلیں ایسی لگتی ہیں گویا سیریز (رومی صنمیات میں فلاحت کی دیوی۔ مترجم)

نے عظیم کوہستانِ نمک سے ٹکرا کر اپنا آدھا قرن خوشحال اس مبارک وادی میں بکھیر دیا۔ ارضی منظر کے حسنِ تکمیل کے لئے شیشم کی مختلف پُربہار قسمیں (جن کی شاخیں بید کی طرح جھکی ہوئی ہوتی ہیں) یہاں اور صرف یہاں پائی جاتی ہیں جو نہروں کے ساتھ ساتھ اور دیہات کے اردگرد شہتوت کے موٹے درخت (جن سے جنگلی انگور کی بیلیں لپٹی ہوئی ہوتی ہیں) زمین پر خوشبودار سایہ پھینکتے ہیں جن کے نیچے لحیم و شحیم سیّد خوشی کے مجسّموں کی مانند تسبیح خوانی کرتے ہوئے اونگھتے ہیں۔ گلاب کے پھول بھی اختتام بہار پر بالائی حصّوں میں بکثرت ہوتے ہیں اور انگریزوں نے بھی مشرق سے سیکھ لیا ہے کہ دلربا سے دلربا منظر بھی ان پھولوں کے بغیر مکمّل نہیں ہو پاتا۔ کابل کے اکثر پھل یہاں خود رَو شکل میں موجود ہیں اور محنت انہیں درجۂ اتمام تک پہنچا سکتی ہے پھر بھی لیموں، شہتوت اور تربوز نہایت لذیذ ہیں۔ مجموعی طور پر مادرِ فطرت بنّوں پر اتنی مہربان ہے کہ اجنبی اُسے فردوس سمجھتا ہے لیکن جب وہ لوگوں کو دیکھتا ہے تو حیران رہ جاتا ہے کہ ایسی بدروحیں یہاں کیسے داخل ہو گئیں؟" افسرانِ بندوبست بھی اس کی دلکشی کے گُن گانے لگتے ہیں اور تھاربرن نے نہ صرف اپنی ایک نہایت دلچسپ رپورٹ کو زرد اناج، سبز اشجار، گنگناتے ہوئے چشموں، کٹائی کرنے والوں اور پالتو لیلوں (جو اپنی جھنجھناتی ہوئی گھنٹیوں کے ساتھ ہر کھیت میں اُچھلتے، کودتے پھرتے ہیں)، امن و سکون کے مرغزاروں، اور ہلکے بھورے رنگ کی پہاڑیوں، پُراسرار چٹانوں، اُداس گھاٹیوں اور سورج کے نور و نار میں چمکتی ہوئی برفپوش چوٹیوں کے پس منظر کی جاندار تصویروں سے دلآویز بنا دیا بلکہ اُس نے ایک

تصویر خیز کتاب ہی لکھ ڈالی جو اِس ضلع اور اس کے لوگوں، ان کی کہانیوں، گیتوں اور ضرب الامثال پر حاوی ہے:

"تاریخی لحاظ سے یہ یکے بعد دیگرے تغیرات کا مورد رہا ہے جو ایک پُرتغیر سرحد کے لئے بھی غیر معمولی ہیں۔ عکرہ کی تباہ شدہ ڈھیریاں ایک ایسے ترقی یافتہ شہر کا پتہ دیتی ہیں جو غالباً قدیم یونان کے برسرِاقتدار آنے سے پہلے موجود تھا۔ سکندر راب بھی ایک مقبول مقامی ہیرو ہے اور لوگ اُسے 'سکندر بادشاہ' کے طور پر جانتے ہیں۔ اس کے متعدد ذی جانشینوں نے اپنے واضح نقوش چھوڑے ہیں جو یُونانی فن کے بھی نمونے ہیں اور یونانی قبضہ کی دیرپائی کے بھی۔ ایسے ہی یونانی باختری، انڈو سیتھی اور بدھ آثار ہیں۔ ہندوؤں نے اسے دوبارہ آباد کیا اور ست رام کے شہر کی روایات سے وقفہ کو پُر کرتے ہیں۔ نویں صدی میں شمالی ہندوستان کے برہمن مہاراجے یہاں طاقتور رہے اور سبکتگین نے بھرے ہوئے شیر کے مار کے انہی سے اختیار کئے۔ محمود اور غزنویوں کی دو صدیاں آئیں اور گئیں اور وہ کرّم اور گمبیلا کے کناروں پر ایستادہ خیمہ گاہوں سے ہندوستان پر حملے کرتے رہے حتیٰ کہ غوریوں نے لاہور میں بارھویں صدی میں ان کا قصرِ اقتدار مسمار کر دیا۔ اس وادی سے چودھویں صدی کے اواخر میں تیموری قشون قاہرہ گذرے اور سولھویں صدی کے اوائل میں بابر نے اسے نشانہ بنایا۔ تیمور سے پہلے افغانوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں یہاں آباد ہو گئی تھیں۔ بابر نے یہاں بنّود زئیوں کو دیکھا جو منگل اور حنّی قبائل کو یہاں سے نکال چکے تھے اور پیشتر اس کے کہ نیازیوں نے انہیں یہاں سے نکال باہر کیا وہ

کافی عرصہ یہاں رہ چکے تھے۔ موخرالذکر کے پیچھے ہی اُن کے متعلقین، مروت چلے آئے جو منچلے انسانوں کا ایک عظیم گروہ تھا۔ انہوں نے نیازیوں کو مشرق کی طرف دھکیل دیا، یہاں آباد ہوگئے اور اپنے مورث کے نام پر اس سرزمین کو مروت پکارا۔ انہی کی اَولاد اب بھی یہاں متمکن ہے اور یہ لوگ بہت عمدہ کاشتکار ہیں۔ آبادکاروں کی آخری کھیپ وزیریوں پر مشتمل تھی۔ کچھ عرصہ کے لئے تو وہ اپنی بے آب وگیاہ پہاڑیوں سے اپنے ریوڑ یہاں لاتے تھے سردی میں پُربہار وادی میں اپنے سیاہ کمبلوں کے خیمے لگاتے تھے اور بہار کی آمد پر پھر اپنی سطوح مرتفع کو واپس چلے جاتے تھے لیکن جُوں جُوں ان کے ریوڑ بڑھتے رہے اور وہ کھیتوں اور فصلوں کو دیکھتے رہے وُوں وُوں وہ بقول ایڈورڈز جوع الارض سے مسحور ہوتے گئے اور پھر فوراً ہی اس پر قبضہ کرنے کے لیے آگے بڑھے۔ محسودوں نے پوندوں سے محصول وصول کرنا شروع کیا اور درویش نے بتدریج بنوچی سے زرخیز زمین حاصل کرنا شروع کی۔ بنوچی کے پاس جو کچھ بچا وہ غالباً برطانوی قانون اور محافظت کا کرشمہ ہے۔

دیگر عوامل کے علاوہ یہ تمام تغیرات بھی دو غلے بنوچی کی تشکیل میں کارفرما رہے ہیں۔ بنوچی کی اصطلاح ان تمام کے لئے مستعمل ہے جو نہ صرف شیتک اور اس کی بیوی مسماۃ بانو کی اولاد ہیں بلکہ تمام مسلمانوں اور ہندوؤں پر بھی محیط ہے جو مدتوں سے ان کے ساتھ سکونت پذیر ہیں۔ تمام قسمت آزماؤں کا جُوٹھا، یا باقی ماندہ جو مختلف وجوہات کی بنا پر یہاں کے سیراب

علاقوں میں آباد ہو گیا۔ ایڈورڈز کے الفاظ میں "انہوں نے باہمی رشتے ناطے، غلاموں کی تجارت اور بدی کے ذریعے بنوچیوں کے مخلوط کردار کو مکمل کیا ہے۔ قد و قامت میں کمزور ہندوستانی سے طویل دُرّانی تک، رنگ میں بنگال کے آبنوس سے کابل کے گلابی رخساروں تک، لباس میں جنوب کے ریشمی پارچات سے ابدی برفزاروں کی بھاری بھرکم بکری کی کھالوں تک ــ یہ سب کچھ اِن میں خلط ملط نظر آتا ہے جسے ہر طرف نمایاں غلاظت کا غیر جانبدارانہ رنگ ہم آہنگ کر دیتا ہے۔" پست قد، سانولے، ہڈیوں کا ڈھانچہ اور شکل و شباہت میں سُوکھا سڑا۔ "گنجان دیہات کی گرمی، کثافت، رذالت اور جمود و خمود میں مقیّد، دیہات جو جانسوز اور مخرب اخلاق برائیوں کے سرچشمے ہیں۔" بے حد متعصّب، ہر چونتیس گھروں کے لئے ڈیڑھ اینٹ کی ایک مسجد، ہر وقت اور ہر جگہ نمازیں ادا کرتا ہُوا، حقیر ترین ملّاؤں کا اندھا دُھند پیرو، (ملّا جو بدترین ریاکار ہیں اور حیاتِ اجتماعیہ میں صرف اِشتعال انگیز مشورے دے سکتے ہیں اور بوقتِ جنگ صرف خونیں اور جنونی نعرے بلند کر سکتے ہیں اور وہ بھی صرف عقب سے ہی) ' ہر لحاظ سے بدطینت' مقدّمہ باز' سچائی کو بار بار مسلنے والا، دشمن پر گھٹیا سے گھٹیا وار کرنے والا، دشمن کو حقیر سمجھنے والا، ہر وقت 'عزّت' کا نعرہ بلند کرتا ہُوا لیکن ہر لحاظ سے بے عزّت۔"

وہ واقعی بقول ایڈورڈز، رینل ٹیلر، تھاربرن وغیرہم (جن کا ان سے واسطہ پڑا) اسفل ہیں۔ اس کے بعد یہ کہنے سے کہ وہ "بہترین مالیہ دہندگان، امن پسند اور غیر جارح" ہیں اُن کے گناہ نہیں دُھل جاتے اور نہ ہی اُن کی آب و ہوا اور

بجہ خیزی اُن کی برائیوں کا جواز بن سکتی ہے۔

آب و ہوا اور نہری آبپاشی نے اِس سلسلہ میں اپنے اثرات مُرتسم کئے ہیں جیسا کہ بعض نظریہ پسندوں کا خیال ہے۔ ملحقہ علاقوں میں رہنے والے مروت ریتلی زمین اور خشک ہوا کے لوگ ہیں اور وہ اپنے ان ہمسایوں سے بالکل مختلف ہیں۔ خوشنما، طویل، قوی الاعضاء، شائستہ اور سُرخ سفید پٹھان۔ حسین و جمیل عورتیں، قدرے شریر چہروں اور سڈول ٹخنوں کی مالک۔ بے تکلف، کشادہ جبیں اور راست گو لوگ، زیادہ تر زراعت کار اور بتوچی سے سخت متنفر۔ وزیری کا بیان پہلے ہو چکا ہے۔ جہاں کہیں وہ ہماری سرحد کے اندر بسا ہے وہ اِس آب و ہوا کے باوجود بگڑا نہیں بلکہ سنورا ہے۔ اس نے اپنی مخصوص خوبیاں کھوئی نہیں لیکن لُوٹ مار کا جذبہ کچھ کم ہُوا ہے اور وہ تیزی سے تہذیب کی ابجد سیکھ رہا ہے۔

بنّوں کی آب و ہوائی، تاریخی اور نسلیاتی دلچسپی اپنی جگہ پر ہے لیکن سرحد پر اِس کا مخصوص محلّ وقوع اِسے دلچسپ تر بنا دیتا ہے اور غیر معمولی طور پر اہم بھی۔ یہ باخبر اور معتبر عسکری ذرائع کی متفقہ رائے ہے۔ خواہ ہم کابل قندھار شاہراہ تک بڑھ جائیں اور ورائی قبائل کو سیاسی حالات سازگار ہوتے ہی اپنی فوج میں بھرتی کر لیں اور خواہ اِس منبعِ قوّت کو دشمن کے نیزہ کی فولادی نوک بننے دیں جو ہمارے غیر محفوظ مقام میں پیوست ہو سکے، بنّوں کی اہمیت بدستور قائم ہے۔ یہ بہت سی شوارع کا مرکز ہے یا بہت سی شوارع ہماری سرحدی چوکیوں کے درمیان میں سے نکلتی ہیں جیسے کوہاٹ اور

تھل سے ، ڈیرہ اسماعیل خان، ٹانک اور گومل سے ؛ یہاں سے ہم کسی وقت بھی وادئ خوست، منگل قبیلہ یا پورے وزیری علاقہ پر اپنا موثر ضبط قائم کر سکتے ہیں۔ داور وادی سے غزنی تک کی سڑک کے لئے یہ نقطۂ آغاز ہے اور اِس سڑک کی تعمیر میں کوئی خاص مشکل نہیں اور فاصلہ ۱۵۰ میل کم رہ جاتا ہے ۔ جب یہاں تک ریلوے بن جائے تو بنّوں کابل بذریعہ کرّم کے متبادل راستے کا قدرتی بنیادی پایہ ہوگا جہاں سے ہم اِس راستے سے آنیوالے دشمن کے بازوؤں کا راستہ روک سکتے ہیں۔ اب یہ حقیقت تسلیم کر لی گئی ہے اور موجودہ انتظامیہ نے اِس ضمن میں کافی کچھ کیا بھی ہے۔ ریلوے کا رابطہ ایک طرف خوشحال گڑھ اور دوسری طرف ڈیرہ اسمٰعیل خان سے قائم ہو چکا ہے۔ اِن دونو مقامات سے سرحدی سڑک بلکہ پگڈنڈی اب ایک اعلیٰ درجے کی فوجی ، پختہ اور پُل دار سڑک بنادی گئی ہے۔ کرّم اور گمبیلا جیسی اہم ندّیاں (جو مستقل خطرے کا موجب اور اکثر جانی نقصان کی ذمّہ دار تھیں) پُلوں کے ذریعے پاٹ دی گئی ہیں جو بوقت ضرورت ایک چوڑی پٹڑی کی ریلوے کو سہار سکتے ہیں۔ سندھ ساگر نظام سے براستہ میانوالی ، ماڑی ، کالاباغ اور عیسیٰ خیل بنّوں تک ایک نئی پٹڑی کے لئے سروے کیا جا چکا ہے اور اُمید ہے کہ کسی قسم کی مالی مشکلات کو اِتنی اہم لائن کے راستے میں نہیں ہونے دیا جائے گا۔

بڑی فوج کے لئے ایڈورڈز آباد کی موجودہ چھاؤنی چُنی گئی ہے۔ اِس میں کافی جواز ہے گو آب و ہوا کی وجہ سے بعض دشواریاں بھی ہیں۔ وادی کا مزروعہ حصّہ اُتنا ہی بخار آور اور مضرِ صحت سمجھا جاتا ہے جتنا سابقہ پشاور تھا۔ بنّوچی

جو پانی پیتا ہے اُسی سے نہاتا ہے (بشرطیکہ وہ نہاتا ہو) اور اسی سے کھیت سینچتا ہے۔ وہ کبھی کبھار ان مصارف کی ترتیب بدلتا ہے یعنی پہلے کھیت سینچ لیتا ہے جن پر اُس نے خوب کھاد پھیلائی ہوئی ہوتی ہے۔ خالص پانی کی فراہمی آسانی سے ہو سکتی ہے اور وہ اس مشکل کو دور کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ بہترین صحت افزا مقامات ہیں اور ان سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔ کوہِ غبر ۶,۰۰۰ فٹ سے زیادہ اونچا ہے اور کرّم چوکی اور پیزو کے درمیان بھٹانی علاقے میں ایستادہ ہے۔ یہاں سینی ٹوریم بن سکتا ہے لہٰذا اس پر قبضہ ہمارے اور قبائل کے لئے مفید ہوگا۔ تھوڑا سے آگے بالائی داور، جدران سطوح مرتفع یا خوست کے اردگرد کے پہاڑ کشمیر جنّت نظیر کی آب و ہوا کے مالک ہیں۔

ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ کابل پہنچنے کے لئے کرّم راستے کی خوبیوں کے باوجود بنّوں تک ریلوے کی تعمیر اسے ہماری موثّر ترین کارروائیوں کے لئے نقطۂ روانگی بنا سکتی ہے۔ کرّم کی طرف مغرب میں ہماری سب سے اگلی چوکی تھل ہے جو کابل سے ۱۶۷ میل دور اور کوہاٹ سے چھیاسٹھ میل ہے جو بجائے خود ریلوے سے تیس میل دُور ہے۔ بنّوں سے دریائے کرّم کے ساتھ ساتھ فاصلہ بیالیس میل ہے یا کوئی دس میل زیادہ براستہ گمٹی یا برگانو درّہ جہاں سے یہ موڑی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ راستہ بھی وزیری قبضہ میں ہے جن کے علاقہ کا ایک پانہ ہمارے علاقے کے عین وسط میں گھسا ہوا ہے لہٰذا یہ راستہ ہمارے لئے بند ہے۔ ابھی حال تک اس کا نقشہ بھی نہ تھا اور

میجر ہولڈچ کے اسسٹنٹ کو ۱۸۸۲ء میں نہایت صبر آزما شرائط کے تحت صرف اس کی سطح کا جائزہ لینے کی اجازت دی گئی۔ ایک شرط یہ تھی کہ وہ سرحد کی پرلی طرف کبھی نہ سوئے گا۔ ریلوے مکمل ہو تو بنّوں سے تھل تک براہِ راست اچھی سڑک بنی چاہیئے اور ساتھ ہی ساتھ وادیٔ داور کو بیرونی دُنیا کے لئے کھول دینا چاہیئے۔ پیش آئند مشکلات سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ۷۹-۱۸۷۸ء کی سردی میں تھل بنّوں راستے سے ہمارے رسالے کی ایک پلٹن اور جیند اور کپورتھلہ کے دستے گذرے اور ۱۸۸۰ء کے شروع تک کانوائے باقاعدگی سے بدرقہ کی حفاظت میں جاتے رہے۔ داوریوں نے کئی دفعہ ہماری حفاظت کی التجا کی ہے اور ابھی تک یہ دونو راستے خطرآفریں ظاہر نہیں ہوئے۔ ضرورت صرف عزم بالجزم اور سلیقہ مندی کی ہے کہ ہم وزیریوں کو منوا لیں۔ اگر ہمارا پختہ ارادہ اُن پر واضح ہو جائے تو وہ سمجھ سکتے ہیں کہ رکاوٹ ڈال کر وہ بہت کچھ کھوئیں گے اور معاونت کر کے بہت کچھ پائیں گے۔

Scanned by CamScanner

پندرھواں باب

سرحدی مذہبیات، پٹھان مذہب پر ایک مختصر تبصرہ

پٹھان کی توہم پرستی ضرب المثل ہے اور بے پایاں لیکن اِس ضمن میں وہ شاید قرونِ وسطیٰ کے عیسائی سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے جو "ایک آسیب زدہ فضا میں سانس لیتا تھا"۔ سرحد پر کرامات، ٹونے ٹوٹکے اور فال بالکل عام چیزیں ہیں جیسے کلیسا کے معجزات، جادو، تعویذ گنڈے، روحوں کی دستک، میزوں کی الٹ پلٹ وغیرہ کو مغرب کا عام پجاری مانتا تھا اور کسی حد تک آج بھی مانتا ہے۔ لہٰذا پشاور کے میلہ جنڈہ میں پیر بابا کی بنیر یا خٹک میں کوکا صاحب کی کرامتوں پر اعتقاد کے سلسلے میں پٹھانوں کو رگیدنے کی ضرورت نہیں۔ سینٹ انٹونی کی وعظ کے دوران مچھلیوں کا سراپا گوش بن جانا، سارگوسا کے محل کی دوشیزہ کا شکستہ اعضاء کو بحال کر دینا اور نیپلز میں سینٹ جنا رئیس کے خون کی ترقیق بھی ایسی ہی کہانیاں ہیں اور پٹھان قصّے ان سے زیادہ ناقابلِ اعتبار نہیں ہیں۔ روح العصر کے متعلق اتنی ہاؤ ہو کے باوجود عقلیت کی رفتار بہت سُست ہے اور دعائیں، صدقات، روزے، زیارتیں، پیر پرستی اور ان کے متولیوں کا احترام پٹھان کے لابدی اور بنیادی فرائض میں شامل ہیں جو

ہماری قریب تر قوموں میں بھی موجود ہیں۔ ہر طبقے اور صنف کے لوگ' درگاہ' پر جاتے ہیں، اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں' اپنے سچے نبی اور سچے مذہب' کا ذکر کرتے ہیں اور اپنے پیر و مرشد کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں جیسے ایک آئرستانی کسان اپنے پادری کے سامنے!

جہاں کرامتوں کی طلب اتنی ہو وہاں لازماً رسد بھی اتنی ہی ہوگی۔ سرحدی مسلمانوں کے ہاں تبرکات، مورتیاں، تصویریں یا صلیبیں تو ہیں نہیں بلکہ اکثر و بیشتر روضوں کی عمارات بھی محض پتھروں کے انبار ہیں اور چیتھڑوں کا ڈھیر (جو ایک خستہ و شکستہ ڈراؤنا معلوم ہوتا ہے) نذر نیاز کا ظاہری اور مرئی نشان ہوتا ہے۔ لیکن سرحد کی کسی زیارت پر حاضری (جو سینٹ کتھ برٹ' بکیٹ' نکولس یا ڈنسٹن کی زیارتوں کی ہم پلہ ہیں) بخار، آشوب چشم، وجع المفاصل' اور دیگر انسانی تکلیفات کا علاج ہے۔ دوسری زیارت نظر بد سے بچاتی ہے' مویشیوں کی افزائش کرتی ہے اور اکثر مواقع پر عاشقوں کی مرادیں بر لاتی ہے پشاور کے اخوند درویزہ یا جلال آباد کے اخوند موسے' کے مزار کی مٹی سانپ کے کاٹے کا علاج ہے اور پاگل لوگ علی بوغان کے میاں علی کے مزار پر حاضر ہو کر صحت مند ہو جاتے ہیں۔ بہت سے مقابر پر بے اولاد عورتیں بار آور ہو سکتی ہیں اور ایک مشتاق زائر (جو مکہ معظمہ جانے کی توفیق نہ رکھتا ہو) اپنے ہی علاقے کی زیارتوں پر جا کر بار بار صدقات و عطیات دے کر حج کا ثواب حاصل کر سکتا ہے۔

ان کے اپنے قدیم آباؤ اجداد ہیں جن کے سامنے کلیمنٹ، اگنیشس یا

پولی کارپ کل کے نیچے ہیں۔ پٹھان آئرستانی کی طرح ابتدائی سرخیلوں کی طرف رجوع کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ وہ جتنے قدیم ہیں ان کی قبریں بھی اتنی ہی طویل ہیں۔ ننگرہار میں بالا باغ کے قریب حضرت لوطؑ کی قبر ۳۸۰ گز سے زیادہ لمبی ہے۔ حضرت نوحؑ کے والد، مہترلمؑ (یوروپی لامِش) کی زیارت لغمان میں ہے اور روایت ہے کہ کشتیٔ نوحؑ کوہ کنڈ پر ٹھہری اور ملحقہ وادی آج تک درۂ نوحؑ کہلاتی ہے۔

حضرت ایوبؑ اور دیگر پیغمبرانِ کرام بھی یہاں مشہور و معروف ہیں اور ان کی قبور کے لئے پچیس فٹ درمیانی لمبائی سمجھی جاتی ہے۔ یہی حال شہداؑ یا غازیوں کا ہے جو کافر ہندوؤں یا انگریزوں کے خلاف لڑتے رہے۔ پنجاب میں وہ 'نوگزا' (۹ گز کے) مشہور ہیں۔ جیسے جیسے اُن کا تقدس بڑھتا ہے ویسے ویسے اُن کا قد بھی بڑھتا ہے۔ پشاور چھاؤنی میں مدفون ایک ایسی ہی ہستی کا مزار اتنا بڑھا کہ شارع عام میں رکاوٹ پڑنے لگی اور حاکمانِ ضلع کو اس کے گرد دیوار بنانا پڑی۔ یہ واقعی 'طاقتور لوگوں کے مقابر' ہیں لیکن کٹر سے کٹر وہابی (پیوری ٹن) بھی یہ شکایت نہیں کر سکتا کہ ان میں فن یا آرائش کا شائبہ ہے۔ پتھروں یا اینٹوں یا مٹی کا ایک لمبا اور پست ڈھیر ہی ان شاہوں کو دفنانے کے لئے کافی ہے۔ سرحدی ولی کی شہرت محلات یا مقابر پر منحصر نہیں اور نہ ہی اس کی جانشینی حدود و احکام پر۔

اس کے مدارج و مناصب میں کافی رعب داب ہے اور اگر پٹھان اولیا کی فہرست شائع کی جائے تو وہ کچھ یوں ہوگی: آستانہ دار

جو موروثی طور پر زاہد انہ شہرت رکھتے ہیں یا کسی مشہور ولی کی اولاد ہیں اور آستانہ یا زیارت کے اوقاف سے متمتع ہوتے ہیں۔ نظری طور پر سیّد آنحضورؐ کے داماد حضرت علیؓ کے براہِ راست اخلاف ہیں اور عملاً وہ عیسائی کلیسا کے اُسقف کا درجہ رکھتے ہیں اور 'شاہ' کے معزز لقب سے پکارے جاتے ہیں اور پٹھان اُن کے سامنے جُھکتا ہے۔

لیکن پیر سرِ فہرست ہیں کیونکہ وہ بادشاہ ہیں "۔ مجمع پیر صاحب کے آنے پر کھڑا ہو جاتا ہے اور اُس وقت تک کھڑا رہتا ہے جب تک وہ تشریف نہ رکھیں"۔ وہ اکثر کسی مزار کا متولّی ہوتا ہے اور پٹھان خطیب عموماً اسے کسی مشہور ولی سے منسوب قرار دیتے ہیں۔ کلیسائی لحاظ سے وہ ڈین کی طرح بااختیار ہوتا ہے، مخصوص موروثی حقوق و مراعات کا مالک اور کھیتوں اور ریوڑوں پر ٹیکس لیتا ہے۔" اُن کا سماجی مرتبہ اُن کے اوصاف سے بالا اور بے نیاز ہے"۔ اور بیلیو کہتا ہے: "تمام پیر اگر دولت مند نہیں تو خوشحال ضرور ہیں۔"

میاں عموماً ایک دیہاتی ڈین کے برابر ہوتا ہے گو ترکِ دنیا میں اتنا اہم نہیں رہا۔ وہ تبلیغ اسلام کے لئے دنیا چھوڑتا ہے لیکن وہ خوب عیش و آرام کی زندگی گذارتا ہے۔ ان میں سے بعض وبا اور قحط کو روکتے ہیں اور بعض اِردگرد کے گناہگاروں پر انگشت نمائی (انگشتِ حقارت) کرتے ہیں۔

صاحبزادے پارسا انسانوں کے اخلاف ہیں اور سیّد، پیر اور میاں کے سامنے وہی حیثیت رکھتے ہیں جو اُسقف کے سامنے ڈیکن کی ہوتی ہے

اور یہ چاروں طبقے یکساں طور پر آستانہ دار ہوتے ہیں اور خوب مرفہ الحال ۔

یہ ضروری نہیں کہ ان میں سے کوئی فعّال ہو البتہ ملّا عام اور محنتی امامِ مسجد ہے جس نے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کے بعد مولوی کا درجہ حاصل کیا ہے ۔ وہ عالمِ شریعت ہے ، مسجد میں نماز کی قیادت کرتا ہے ، مذہب سکھاتا ہے اور مکاتب کی نگرانی کرتا ہے ۔ وہ تعداد میں سب سے زیادہ ہے اور پٹھان زندگی کا محور ہے اور بحد اثر و رسوخ کا مالک ہے ۔ بسا اوقات امام کوئی اور ہوتا ہے اور ملّا کے سپرد صرف خطابت ہوتی ہے ۔ فقرا عموماً کلیسائی بھیک مانگنے والے کلیسائی فرائر ہوتے ہیں ۔ شیخ عموماً تارک الدنیا ہوتا ہے ۔ جو کسی ولی کا مرید ہو اور سب سے آخر میں طالب العلم آتا ہے ۔ وہ علم و دانش حاصل کرتا ہے اور لوگوں کے صدقات اور خیرات پر پلتا ہے ۔

اگر طالب اس سیڑھی کا بنیادی زینہ ہے تو ان کا سربراہ اخوند یا استاد ہے لیکن مشہور اخوند سواتی تو نصف صدی کے لئے عملاً سرحدی پاپا یا پاپائے سرحد بنا رہا اور اس کے لئے ایک علیحدہ باب درکار ہوگا ۔

ان انسانوں کی تعظیم کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ محفوظ ترین زندگی گذارتے ہیں ۔ یہ واحد لوگ ہیں جو اتفاقیہ گولی اور زود کش چاقو سے مبرّا ہیں اور پٹھانوں کے مروّجہ خوں بہا کے دائرے میں نہیں آتے ۔

کچھ مدّت پہلے ضلع پشاور میں ایک آدمی نے ملّا کو گولی سے مار دیا ۔ یہ شاید حادثہ تھا یا غلط فہمی یا شیطنت کا نتیجہ تھا ۔ بہرحال ملّا مر گیا اور دیگر قانون شکنوں کی طرح قاتل کو فرار ہونا پڑا ۔ وہ بنیر گیا لیکن خبر پہلے پہنچ چکی تھی لہٰذا

پناہ نہ ملی - پھر وہ سوات گیا لیکن اخوند کی سرزمین میں اُس کی کہاں گنجائش تھی ؟ اُس کے بعد وہ مہمندوں کے پاس گیا تو انہوں نے کہا۔ "تم نے ایک ملّا کو مارا ، اگر وہ کوئی عام قبائلی یا صاحب ہوتا تو ہم تمہیں پناہ دیتے لیکن اب تم مفرور ہو جاؤ۔" آفریدی اہلِ رُوحانیات کے اِتنے قائل نہیں لیکن انہوں نے بھی اِسے ٹھکرا دیا کیونکہ اُس کے ہاتھ ایک ملّا کے خون سے رنگے ہُوئے تھے - دربدر ٹھوکریں کھاکر وہ عاجز آگیا اور پچھتانے لگا۔ اُس نے کہا۔ "تم میں سے کوئی مجھے قبول نہیں کرتا لیکن مَیں تمہاری قبولیت حاصل کرکے رہوں گا ، مَیں شہید بنوں گا اور ایک 'صاحب' کو مار دوں گا۔" چنانچہ وہ پشاور چھاؤنی واپس آیا اور اپنے شکار کے لئے مال پر گھومنے لگا۔ فوری طور پر شکار نہ ملا تو وہ واپس مُڑا۔ ایک اناڑی سوار سارجنٹ نظر آیا جو گھوڑے کو قابو نہ کرسکتا تھا اُس نے فوراً نشانہ باندھا لیکن پہلی گولی سارجنٹ کی بندوق کے زدنما پر لگی اور پیشتر اِس کے کہ وہ حملہ آور کا پیچھا کرتا پٹھان نے دوسری گولی اُس کے خود میں ماری اور اس کے پیچھے لپکا لیکن ایک جری مقامی بھاگتا ہُوا آیا اور اُسے قابو کرلیا۔ کمشنر نے اسی دن مقدمہ سنا اور فوری اختیارات کے تحت وہ اگلی صبح تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا وہ اپنے گناہ کا کفّارہ دے کر بہت خوش تھا۔ اُس نے صرف ایک التجا کی کہ اس کا جسم جلایا نہ جائے اور یہ منظور کرلی گئی - شاید کسی دن وہ اسے 'نوگزا' بنادیں گے !

سولہواں باب

سفید کوہ کا دامن

وادئ کرم سے کابل ہندوستان میں موجودہ عشرہ کے انگریزوں کے لئے اتنا ہی مانوس ہے جتنا کبھی بری راستہ تھا۔ قریباً دس سال پہلے نومبر ۱۸۷۸ء میں ہماری فوج اس پر پوری طرح قابض تھی اور امیر شیر علی کے حواریوں کو ادھر اُدھر بکھیرتی پھر رہی تھی۔ ایک سال سے بھی کم عرصہ بعد سر فریڈرک رابرٹس کے تحت ایک انتقامی فوج آگے بڑھ رہی تھی، بہ زور و شور، پرانے قلعۂ کرم سے گذر کر، سپین غوا، نراز کے اوپر، صنوبر پوش پیوار کے پار، علی خیل کی گھاٹیوں کے درمیان، ہزار درختوں کی گھاٹی کے بیچ میں سے اور شتر گردن کے اوپر سے، سفید کوہ کی برفوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے، جاجی ڈھول ڈھمکا سے بے نیاز، منگلوں اور زمختوں کو ایک طرف ہٹاتی ہوئی، کسی خوشی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے، دیوانہ وار کابل کی طرف بڑھ رہی تھی تاکہ بدقسمت کاوگنری اور ہمارے سفارتی عملے کے بزدلانہ قتل کا انتقام لے سکے۔ مئی ۱۸۷۹ء میں یعقوب خان گنڈمک کے برطانوی کیمپ میں آیا تھا اور ایک معاہدہ پر دستخط کئے تھے جس کے مطابق نہ صرف افغانستان کے خارجی تعلقات کاملاً برطانوی اثر کے تحت کر دیئے گئے اور کابل میں ایک برطانوی ریذیڈنٹ مقرر کر دیا گیا بلکہ علاقہ جات

پشین، سبی اور کرم ہماری سرحد کے اندر آ گئے اور کرم سے کابل تک ایک ٹیلی گراف لائن منظور کر لی۔ وسط ۱۸۸۰ء تک ہمارے ریذیڈنٹ کے قتل میں یعقوب کی مجرمانہ شرکت ثابت ہو گئی اور اُسے ہندوستان میں نظر بند کر کے امیر عبدالرحمٰن کو مسند نشین کر دیا گیا۔ پالسی پھر پلٹا معاہدہ منسوخ کر دیا گیا اور اکتوبر میں جنرل واٹسن نے توری طوک کے سامنے کرم سے ہماری فوج کی واپسی کا اعلان کیا۔ میرانزئی وادی (جس کی مغربی حد ہی اب ہماری سرحد کی انتہا ہے اور جو شاید ضلع کوہاٹ کا خوشگوار ترین حصہ ہے) کو بلا سوچے سمجھے بالائی اور زیریں وادی میں تقسیم کر دیا گیا ہے حالانکہ جو دریا موخرالذکر کے مشرق کے نیچے سے بہتا ہے کوہاٹ توئی (: ندی) کا معاون ہے اور پھر سندھ میں مل جاتا ہے اور دریائے اشکلی جو بالائی کے ساتھ ساتھ مغرب کی طرف بہتا ہے۔ کرم کا ایک حصہ ہے۔ دونو بالائی اور زیریں اور کرم بھی عظیم سفید کوہ کے دامن میں ہیں جن کی سفید چوٹیاں سب پر حاوی ہیں اور جو اِس کے اور مشہور تر درۂ خیبر کے درمیان ایک مہیب دیوار کی طرح حائل ہے۔ میرانزئی اور کرم کے درمیان کچھ زیادہ عدم مشابہت نہیں سوائے اِس کے کہ بعض دیگر جگہوں کی طرح یہاں بھی بہترین علاقہ سرحد پار واقع ہے۔ یہ کبیر و صغیر پہاڑوں، چٹانوں اور پتھروں کی سرزمین ہے۔ ان سے نکلنے والے دریا کسی وقت خطرناک نالے بن جاتے ہیں اور کسی وقت ان کے پاٹ کھود کر بمشکل ذرا سا پانی نکلتا ہے۔ وادیاں چھوٹی چھوٹی، محدود لیکن خوش کاشتہ ہیں اور ان میں غلّہ اور پھل خوب پیدا ہوتے ہیں اور ان کی گھاٹیوں میں کھجور کا چھوٹا درخت ہوتا ہے جس پر اِس علاقے کی

چند صنعتیں چلتی ہیں۔ ان کے علف زاروں پر غیر معمولی طور پر پست قد مویشی اور بے حد موٹی چکتی کی بھیڑیں پرورش پاتی ہیں۔ تھل سے گذر کر کرم کے کناروں پر پہنچ جائیں تو ایک خوشگوار تبدیلی محسوس ہوتی ہے۔ کم و بیش پودے راستے کے ساتھ ساتھ اناج کے کھیت، پھلوں کے باغات، شہتوت کے جُھنڈ اور زرخیز کُنج ہیں جو تا شاہ بلوط، زیتون، صنوبر اور سدا بہار درختوں سے ڈھکی ہوئی بلندیوں کی طرف اُٹھتے ہیں اور عقبی سلسلہ... ۱۵ فٹ سے بھی زیادہ اونچی چوٹی ستیارام تک بلند ہو جاتا ہے جو برف پوش ہوتی ہے۔ وادی کے کچھ حصّے بنّوں کی طرح غیر صحت مند ہیں لیکن افغان سرحد کے ساتھ ساتھ کرم سے زرخیز قطعے شاذ و نادر ہی ہوں گے۔

زمین سے اہلِ زمین کی طرف آتے ہیں۔ گو بیلیو کے مطابق یہ غیر اغلب نہیں ہے کہ ماضی نامعلوم میں سفید کوہ کے دو طرف کا علاقہ اور اس کے دامن میں پیوار سے سندھ تک کے اضلاع ایک ہی قبیلہ کے ماتحت تھے جو ہیروڈوٹس کے آستاریتے تھے (جن کے موجودہ نمائندے آفریدی ہیں) لیکن اب یہ مختلف قبائل و شعوب جیسے بنگش، توری، جاجی، زمخت، اورکزئی، آفریدی وغیرہ جو ایک بنیادی خاندانی تعلق کے باوجود ایک دوسرے سے کافی حد تک مختلف ہیں۔ ان میں سے بعض تو افغان بھی سمجھے نہیں جاتے، اور غالباً سبکتگین اور تیمور کے جلو میں آنے والے انبوہِ ترکان کے ساتھ خلط ملط ہو گئے ہیں یا ان سے بھی پہلے سیتھی لوگوں سے گڈ مڈ ہوئے ہیں گو عملاً اُن پر لفظ پٹھان ہی سراسر منطبق ہو سکتا ہے۔

روایت ہے کہ بنگش عربی الاصل ہیں جو آنحضرتؐ کے افاغنۂ غور کے لئے مقرر کردہ صحابی قیس کی اولاد ہیں - وہ زُرمت یں گردیز کے آس پاس رہتے تھے لیکن غلزئی دباؤ کے تحت چودھویں صدی کے اواخر میں یا حملۂ تیموری کے فوراً بعد مشرق کی طرف آئے، کرم میں آباد ہوئے اور خٹکوں کے ساتھ مل کر اورکزئیوں کو دبایا جو ڈھلانوں کے اوپر چلے گئے۔ مشہور ہے کہ ایسا کرنے کے لئے وہ تین شب و روز کی جنگ لڑے جو براق سوار کے طور پر لڑی اور جس نے اعلان کیا کہ "میدان بنگش کے لئے تھا اور پہاڑیاں اورکزئیوں کے لئے"۔ یہ روایت آج بھی مالکانہ حقوق کے لئے قولِ فیصل ہے۔ ہوتے ہوتے توری بھی آ گئے، پہلے ماتحت اور پھر بنگش کو محروم کر کے غالب آ گئے۔ ابتداء میں بنگش کے دو حصے تھے، گار اور سامل جو بلیو کے نظریہ کے مطابق اسلام پر بدھ اور مجوسی اثرات سے ماخوذ ہیں اور چونکہ ان دونوں کے درمیان جانی دشمنی تھی لہٰذا "بن گش" (یا بیخ کن) مشہور ہو گئے۔ کچھ بھی ہو یہ تمیز آج بھی قائم ہے اور سرحدی سیاسیات کا ایک اہم پہلو ہے جو نہ صرف بنگش بلکہ دیگر قبائل پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور اس کا حریف شیعہ اور سُنّی مسلمانوں کا مجنونانہ افتراق و اختلاف ہی ہو سکتا ہے۔ کچھ سنّی سیاسی طور پر سامل ہیں اور کچھ شیعہ گار اور کبھی اس کے برعکس لہٰذا عام وجوہات اختلاف کے علاوہ قبائلی سر پھٹول کے محرکات بے شمار ہیں جو پٹھان کو زندگی سے لطف اندوز نہیں ہونے دیتے۔

کوہاٹ، میرانزئی اور جنوبی وادیٔ کرم بنگش ہیں، کوہاٹ کے

قریب بستی اور باقی زیادہ تر شیعہ۔ مغربی لمبی لمبی داڑھیاں رکھتے ہیں اور چہرے
کے دونوں طرف تھوڑی سی چھوٹی چھوٹی پھودیانہ لٹیں اور باقی سر ترشواتے ہیں۔
مشرقی تھوڑی سی کٹواتے ہیں اس کے علاوہ کوئی خاص فرق نہیں۔ جسمانی طور پر
وہ ایک اوسط پٹھان کے برابر ہیں لیکن عموماً لڑنے کے جوہر سے عاری۔ چند نمک
کے تاجر ہیں لیکن زیادہ تر شتربانی کی بجائے زرعی زندگی گزارتے ہیں۔ عموماً
مہمان نواز لیکن بہت سے دغاباز اور سفاک ہیں، تشدد کا خاص رجحان نہیں
رکھتے لیکن "چوری کے زبردست عادی" ہیں۔ وہ چھاپہ مار نہیں بلکہ اپنے ہمسایوں
کا تختۂ مشق ہیں اور انتظامی نکتۂ نظر سے خوش کردار ہیں۔ ان کا محلِّ وقوع
ہی ایسا ہے اور ان میں اتنی دانش ہے کہ اسی میں اپنی حفاظت کی ضمانت
پاتے ہیں۔

بالائی وادی کرم کے طاقتور ترین قبائل توری ہیں جو تین چار سو سال پہلے
کنارِ سندھ سے یہاں آ بسے، پہلے بنگش کے ہمسائے بنے، پھر بتدریج اپنے
پاؤں پر کھڑے ہو گئے اور بنگش خود اُن کے ہمسائے ہیں۔ وہ اور ملحقہ جاجی شکل و
شباہت، لباس اور رسومات میں اکثر پٹھان قبائل سے مختلف ہیں۔ ایڈورڈز
انہیں ہندکی کہتا ہے اور بتاتا ہے کہ اصل آئندگان صرف ساٹھ خاندان تھے
لیکن وہ اتنا پھلے پھولے کہ اب ان کے پاس پانچ چھ ہزار محاربین ہیں۔ وہ نہ
عظیم الجثہ نہ خوش وضع ہیں بلکہ وحشی معلوم ہوتے ہیں لیکن وہ مضبوط، سخت جان
اور گٹھے ہوئے ہیں اور وزیریوں کی طرح گھوڑپال ہونے کے باوجود وہ بنیادی
طور پر پیادہ ہیں۔ توری ایک مثالی سرحدی قزاق ہے۔ سرتاپا مسلح، اُس کی

پُشت پر کئی پیتل کی ترابین ہوتی ہیں ، دو تین پستول سامنے ، کمر کی پیٹی میں کئی قسم اور جسامت کے چاقو اور پہلو میں ایک تلوار۔ اس کا گھوڑا ادنیٰ لیکن بےحد چوکنا اور پھرتیلا ہوتا ہے ۔ وہ تُوری اور اس کے اسلحہ خانہ کے علاوہ اس کا پورا لباس خانہ بھی (کاٹھی کے نیچے رکھا ہُوا) اٹھاتا ہے اور ان کے علاوہ انسانی و حیوانی خوراک کے تھیلے، کچھ فالتو جوتے ، نعل ، ایک ہتھوڑا ، آہنی میخ اور ایک میخ کا رسہ بھی گویا وہ تمام لوازمات جو اسے دور دراز اور جرأت مندانہ حملوں کا اہل بناتے ہیں اور اسے شہرت و امتیاز بخشتے ہیں ۔

اِس مقامی ڈاکو کو خَلک کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے جو مردِ ساعت کے لئے تُوری لفظ ہے ۔ نوزائیدہ توری کے سر کے اوپر سے چند گولیاں چلائی جاتی ہیں تاکہ وہ آواز سے مانوس ہو جائے اور اس وقت گھبرائے نہیں جب اُس پر گولی چلائی جائے ۔ اِس کے لئے اُسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑتا کیونکہ وہ اپنے تمام ہمسایوں (وزیریوں، زخمتوں، منگلوں اور بالخصوص جاجیوں) سے برسرِپیکار رہے حتیٰ کہ ایک بنگش بھی تُوری بدرقہ اپنے ساتھ رکھتا ہے تاکہ یہ پیوند زدہ اور وفادار شہدا اُسے دیگر تُوریوں سے بچا سکے ؛

بدرقہ کئی قسم کا ہوتا ہے اور پٹھان سرحد پر بدرقہ دے کر اُس کی امانت د مخالفت کرنا ایسے ہی ممنوع ہے جیسے اسکاچستانی سطوح مرتفع پر۔ خان یا قبیلہ بدرقہ کی اِس سے بڑی توہین ناممکن ہے ۔ بلوڈون نے لکھا ہے کہ ایک تُوری مَلک نے ایک آفریدی قافلے کو اپنی ٹوپی بطور بدرقہ دی جو لُٹ گیا تو مَلک خود انتقام لیتے ہوئے مارا گیا ۔

یہ سرحدی قزاق مہمان نواز ہے حتیٰ کہ مستورات بھی نو واردوں کی خاطر تواضع کر لیتی ہیں اور ایک لحاظ سے وہ مذہبی بھی ہے - وہ بنی نوع انسان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے، سیدھا اور ٹیڑھا۔ شیعہ (اور سب توری شیعہ ہیں) سیدھے ہیں اور باقی سب ٹیڑھے۔ ایک اجنبی کے لئے یہ سوال ایک فراموش شکل اختیار کر لیتا ہے۔ توری سیدھے آدمی کو ایک انگلی پیشانی پر عمودی رکھ کر تسلیم بجا لاتا ہے اور ٹیڑھے آدمی کو مڑی ہوئی انگلی سے سلام کرتا ہے۔ اگر اجنبی باخبر ہے تو وہ عمودی انگلی سے جواب دے گا۔ ضلع کوہاٹ پر قبضہ ہوا تو توری کچھ دردِ سر بنے لیکن ۱۸۵۶ء کی پہلی اور آخری مہم انہیں راہِ راست پر لے آئی۔ ان کے نمائندوں نے بصد آداب و تسلیمات بتایا کہ وہ چند بد خواہوں کے زیرِ اثر آ گئے تھے اور اپنے ہمسایوں کو لوٹتے رہے تھے لیکن برطانوی حکومت کے سائے میں وہ ان کی حفاظت کریں گے۔ وہ اِس معاہدے پر پورے اُترے اور ۱۸۵۹ء میں کابل خیل کے مقابلہ پر ہماری مدد کی اور اِس کے علاوہ میجر ڈو گلڈ ڈلگیٹی کی طرف افادیتِ جنگ سے واقف ہو کر انہوں نے اپنے لئے کچھ نفع بھی حاصل کیا۔ ۱۸۷۷ء میں انہوں نے امیر کا مطالبہ (آدمی اور نقدی) مسترد کر دیا اور ۱۸۷۹ء میں زمختوں کے خلاف ہمارا ساتھ دیا۔

توریوں کے مغرب اور پیواڑ تا شترگردن پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ جاجی ہیں جو انہی جیسے ہیں لیکن سُنّی ہونے کی وجہ سے باہم دست و گریباں ہیں۔ وہ عمدہ اور سخت جان کہستانی ہیں، غریب اور بالخصوص غلیظ ہیں اور غلاظت اُن کی طرزِ زندگی اور رہائش گاہوں کا خاصہ ہے بلکہ وہ اپنے مویشیوں کی طرح گندے ہیں، صنوبر

کے گٹھوں کے دھوئیں کی طرح بدبودار جو وہ بالائی حصّوں میں سردی روکنے کے لئے جلاتے ہیں۔ وادیٔ کرّم کے دونو طرف دیگر اہم یا حقیر قبائل بھی ہیں لیکن ان پر تبصرہ کرنے سے پہلے یہ جان لینا چاہیئے کہ مذکورہ قبائل ہمارے اپنے ماتحت تھے۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا یہ معاہدۂ گنڈمک کی ایک شرط تھی اور جب ہم نے ۱۸۸۰ء میں توری علاقہ خالی کیا تو ان کی آزادی تسلیم کر لی گئی۔ ان کا امیر کابل سے کوئی تعلق نہ تھا، وہ اپنے انتظام میں آزاد تھے، لشکر رکھ سکتے تھے، اپنی مزروعہ زمینوں سے ٹیکس لے سکتے تھے اور آزادی تسلیم کرنے کے بعد ہم سے مشورہ لیتے تھے۔ یہ طریقہ کامیاب نہ رہا اور ۸۳-۱۸۸۲ء میں ان کی آپس میں نوک جھونک ہوتی رہی۔ یہ دیکھ کر ہمسائے ان پر حملے کرنے لگے، کبھی جاجی اور کبھی زمخت اور جب توریوں نے جوابی کارروائی کی تو امیر کابل (جو سابقہ ناکامیوں پر خفا تھا) ان کی بدقماشی کا شکوہ کرنے لگا اور راست اقدام کی دھمکی دی اور یوں ہم نے انہیں منجدھار میں چھوڑ دیا۔ ازیں سو راندہ و ازیں سو ماندہ۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ ایک بڑا قبیلہ جس میں بے قاعدہ رسالہ کی بہترین صلاحیتیں ہیں، جو ایک خوشحال نوآبادی کے وسائل سے مالامال ہے، ہماری رعایا بننا چاہتا ہے اور ہم اس کی آزادی کے ضامن بھی ہیں لیکن اگر ہم اسے زیرِ سایہ نہیں لاتے تو وہ امیر کابل کی گود میں چلا جائے گا اور شاید اس سے بھی بدتر ہو جائے اور یوں ہم نہایت عمدہ افرادی طاقت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھو بیٹھیں؛

سترھواں باب

خٹک

سرحدی پٹھانوں میں خٹکوں سے زیادہ سازگار نمونے الّا ماشاء اللہ ہی ہیں۔ بہادر، محنتی، جنگجو اور مہمان نواز۔ انھوں نے اپنی بہترین صفات قائم رکھی ہیں جن کا مظاہرہ وہ اپنے قبائلی رہنماؤں کے تحت کرتے رہے جن کے کارنامے واحد تاریخ خوانین میں محفوظ ہیں۔ برطانوی رعایا بننے کے بعد سے ان کا رویہ مسلسل اچھا رہا ہے اور وہ اس حقیقت کی ایک تابندہ مثال ہیں کہ ایک مضبوط حکومت بظاہر اثر ناپذیر لوگوں کو بھی بہترین شہری بنا سکتی ہے۔

اس قبیلے کی اہمیت یہاں سے ظاہر ہے کہ آخری مردم شماری میں اس کی آبادی اضلاع کوہاٹ و پشاور میں ۱۴۰،۰۰۰ تھی جس کا کافی حصہ سپاہیانہ خصائل کا مظہر تھا۔ ان کا علاقہ بالخصوص جنوبی خٹکوں کا پوری سرحد میں بے حد ویران اور چٹیل ترین ہے۔ پتھریلے اور خشک پہاڑ، گہری اور ریگ تحت نمودار ہونے والی وادیاں جن میں پانی کمیاب ہے اور صرف کھاری نالے ہیں، گھاس پھوس کی چند اداس جھونپڑیاں جو گاؤں کا کام کرتی ہیں، پہاڑیوں پر اناج کے چند قطعے ان کے کھیت ہیں اور کسی بلندی سے کوئی غیر اہم سبز وادی نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں

شاہراہیں نہیں ہیں سوائے ان کے جو ہم نے بنائی ہیں، جن کی دیہاتی سڑکیں پگڈنڈیاں ہیں جو پہاڑیوں پر اور مشکل ترین گھاٹیوں میں بل کھاتی ہیں یا چٹانوں سے گذرتی ہیں، ہمیشہ مشکل اور کہیں کہیں خطرناک۔ ان کے جنگلات میں صرف خودرَو زیتون ہیں یا اِدھر اُدھر کے جھنڈ۔ لیکن اِن بے کیف وادیوں میں گراں بہا نمک فراواں فراواں ہے۔ بہادر خیل میں نیلے، بھورے نمک کی تہہ ہے، ایک ہزار فٹ سے زیادہ موٹی اور پچاس میل لمبی۔ اِس وادی میں سڑکیں نمک کی ہیں، ندیاں شور ہیں جن کے بر فیلے کنارے بلوریں ہیں اور جہاں صرف نمک کے ڈلے کاٹے جاتے ہیں اور کسی بھی بار بردار جانور پر لادے جاسکتے ہیں۔

لہٰذا یہ عین قدرتی ہے کہ خٹک زراعت پیشہ کی بجائے نمک کے بیوپاری ہیں۔ وہ طویل، خوش قامت، شہ زور، خوبصورت نہیں تو بد وضع بھی نہیں اور شکل وشباہت اور اطوار وکردار میں وہ افغانستان اور اکثر پٹھانوں کے برعکس شمالی ہند کے لوگوں سے ملتے جلتے ہیں۔ اوّل درجے کے گپ باز (بلا امتیاز پیشہ)، مجروں کے مسخرے، پُرجوش رقاص اور شہرۂ آفاق پائپ (نَے) نواز؛ اُن کی نَے اسکاچ بیانیوں کو دنگ کرسکتی ہے اور اُن کے رقص انگریزی رقص گاہوں میں بھی ہلچل مچا سکتے ہیں۔ وہ گوشت خور، شیر نوش لوگ ہیں اور کبھی شراب کے رسیا بھی تھے جس کی تعریف میں اُن کے مشہور ترین سردار خوشحال خان نے لکھا: "ایک لبریز صُراحی کے مقابلے پر سورج محض مشعل کی روشنی ہے۔" اور وہ بہترین نان پکاتے ہیں، ایک پہیے کے برابر۔ ان کے متعلق مشہور (افسوسناک طور پر) ہے کہ وہ ہمیشہ سچ نہیں بولتے لیکن وہ مہمان نواز اور زندہ دل ہیں

اور اگر انگریز شریکِ طعام ہو تو وہ اپنا پلا ہُوا بچھڑا بلکہ موٹی چکیتی کی بھیڑ بھی قربان کر سکتے ہیں اور نمک بردار بھی نان کا کوئی ٹکڑا کاٹھی کے تپنچے سے نکال کر اجنبی کو پیش کرتا ہے اور کہتا ہے "ذرا ٹھہرو اور کھاتے جاؤ۔"

یہ حقیقت ہے کہ وہ اپنے ہمسایوں سے کچھ زیادہ ہی متصادم رہے ہیں شاید ہی گرد و پیش کا کوئی قبیلہ ہوگا جس کے ساتھ خٹک کی کبھی نہ کبھی لڑائی نہ ہوئی ہو۔ شمال کے بنگشوں کے ساتھ ضلع کوہاٹ میں اتحاد کے باوجود ان کی شدید ترین جنگ ہُوئی اور جنوب میں عیسیٰ خیل اور میانوالی کے نیازیوں کے ساتھ بھی۔ مغرب میں وزیریوں کے ساتھ کئی خونیں معرکے ہُوئے اور مروت تو خیر ان کے ہیں ہی جانی دشمن۔ مروت کہاوت ہے: "خٹک کے سوا دوستی سب سے اچھی: خٹک کو شیطان سمجھے۔" اور خٹک اور بنوچی ایک دوسرے کے متعلق کئی کہاوتوں کے حامل ہیں۔ تین دفعہ آفریدیوں سے لڑے ہیں اور کوئی ایک صدی تک خٹک تمام یوسفزئی قبائل کا دشمن نمبر ایک تھا۔ وادئ پشاور میں خٹک اور یوسفزئی لڑائیاں تاریخی تھیں جو آخر دم تک لڑی گئیں۔ مصری باندہ پر بہت سے یوسفزئی خوانین کھیت رہے اور خٹک سردار یحیٰی اور اس کے اقارب کام آئے۔ کبھی خٹک اپنی پہاڑیوں تک پسپا ہوتے اور کبھی وہ یوسفزئیوں کو پشاور پار بھگا دیتے۔ اُن دنوں مُسافر لقمہ ہائے تر تھے اور راہزن مضبوط گروہوں سے کتراتے تھے لیکن ان کے کمزور ہوتے ہی ہلّہ بول دیتے تھے۔

ہماری مضبوط حکومت کے تحت حالات بدل گئے ہیں۔ اب خٹک

نہ کسی قبیلہ سے جنگ نہ دشمنی رکھتے ہیں اور پرانے زخموں کی کسک بھی قابو میں رکھی جاتی ہے یا انفرادی انتقام تک محدود رہتی ہے۔ مجموعی طور پر انیسویں صدی کے خٹک اپنا اپنا کام کرتے ہیں، نمک ڈھوتے ہیں اور بیوپار یا کاشت کرتے ہیں اور ان کے جوانان شوخ و شنگ زیادہ تر برطانوی فوج میں بھرتی ہوتے ہیں اور اعلیٰ درجے کے سپاہی بنتے ہیں۔

ان کا قومی ناچ ان کا طغرائے امتیاز ہے۔ ہر مجلس یا تقریب اس کا موقعہ فراہم کر دیتی ہے۔ اسے ایک بڑے الاؤ کے گرد ڈھول اور سرنا کی موسیقی کے ساتھ کئی آدمی تلواریں سونت کر ناچتے ہیں۔ شروع میں تھاپ کے ساتھ مدھم اور نپی تلی حرکات ہوتی ہیں اور تلواریں اونچی یا خیالی دشمنوں کو کاٹتی ہوئی سر کے ارد گرد لہرائی جاتی ہیں، پھر حرکت بتدریج تیز ہوتی جاتی ہے اور زوردار موسیقی کے ساتھ رقاص اپنے جنگی نعرے لگاتے ہیں اور آخر میں وہ جنوں کی طرح گھومتے ہیں، اُن کی تلواریں کوندتی ہیں، گیت پُرجوش ہو جاتے ہیں، حتےٰ کہ پوری جمعیت تھک جاتی ہے۔ ایک قبیلہ، کاکاخیل خاص طور پر محترم سمجھا جاتا ہے کیونکہ وہ عظیم خٹک ولی، رحیم کے کی اولاد ہے جن کا مزار نوشہرہ میں ہے جو مشہور زیارت گاہ اور منظر کرامات ہے۔ کاکاخیل کی شہرت علاقائی حدود کو پار کر کے افغانستان کے دور افتادہ صحراؤں میں بھی ایک طلسم کا درجہ رکھتی ہے۔

دوسرا مشہور قبیلہ، فقیر خیل ہے جو خوشحال خان اول کے بڑے بھائی کی اولاد ہیں جو ولی کی نصیحت پر تارک الدنیا ہو گیا تھا۔ مرحوم خان کا بڑا بیٹا، سر خواجہ محمد بھی اسی طرح ترک دنیا کر گیا ہے۔

غالباً اہم ترین خصوصیت موروثی خوانین کا اقتدار بے اندازہ ہے جو دیگر انفرادیت پسند پٹھانوں کے مقابلے پر صرف خٹکوں میں موجود ہے۔ وہ ان خوانین کو اپنا عوامی قائد سمجھتے ہیں۔ ان کے مراعات و اختیارات اکثر جاگیردارانہ ہیں۔ بنجر اور غیر مزروعہ زمینیں ان کی ملکیت ہیں۔ کاشت کاروں سے وہ پیداوار کا حصہ یا نقد وصول کرتے ہیں اور نمک کی تجارت پر وہ اپنی فیصدی لیتے ہیں۔ وہ قبائل کو اپنی سرکردگی میں میدانِ جنگ میں بلا سکتے تھے اور کم از کم کچھ وقت کے لئے وہ سب ایک سالار کے تحت متحد ہو جاتے تھے لہٰذا خٹک خوانین کی تاریخ خصوصی دلچسپی کی حامل ہے اور پٹھان سرداروں کے کردار پر واحد تاریخ ہونے کی بدولت (جو انہی میں سے ایک کی زبانی سے ہے) یہ محض سرسری مطالعہ سے کہیں زیادہ توجہ اور مغز سوزی کی طلبگار ہے۔

خٹک کی وجہ تسمیہ مخصوص ہے گو مانوس ہے۔ ماضی میں قبیلہ بنوں کے مغرب میں غول چوٹی کے پاس (جو اب غلزئیوں کا گرمائی صدر مقام ہے) شوال وادی میں رہتا تھا۔ چار بھائی شکار کے لئے میدانوں میں اترے تو وہ چار پٹھان عورتوں سے دوچار ہوئے جو لباس کے لحاظ سے دوشیزائیں تھیں۔ جب وہ قریب آئیں تو بڑے بھائی لقمان نے تجویز کی کہ اگر ہر بھائی ایک ایک کو بیوی بنا لے تو بہت مزہ رہے۔ بھائیوں نے اتفاق کیا اور انتخاب کے لئے قرعہ اندازی کا سوچا لیکن لقمان نے بڑے ہونے کی وجہ سے پہلے قرعہ کا حق مانگا چونکہ ان کے چہرے مخفی تھے لہٰذا اس نے شوخ ترین لباس والی کو پسند کر لیا۔ جب چاروں تقسیم ہو گئیں اور دیکھی گئیں تو لقمان کی پسندیدہ

افسردہ و پژمردہ اور بے حد مایوس کن ثابت ہوئی ...... نوجوان اُس کے زیرِ نقاب چہرے اور نظر فریب لباس پر فدا ہو گیا۔ نقاب اُٹھایا تو دادی (ضعیفہ) نکلی۔"

دیگر تینوں لڑکیاں خوش وضع تھیں اور گو ناموس نے لقمان کو اپنے انتخاب پر قائم رکھا تاہم وہ نشانۂ مذاق بن گیا۔ "پہ خٹہ لاڑ۔" (کیچڑ میں چلا گیا) اور یوں خٹہ یا کیچڑ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُس پر چسپاں ہو گیا اور وہ سب خٹک کہلانے لگے۔ اِس معمر، بد وضع پٹھان بیٹی (جس کا نام سپادہ تھا، جو سانولے رنگ اور مضبوط جسم کی مالک تھی اور ذہین تھی) کے بطن سے لقمان کے ہاں دو بیٹے متولّد ہوئے اور دیگر تینوں دوشیزاؤں نے بہت سی اولاد کو جنم دیا لیکن ستم ظریفی یہ ہوئی کہ وہ سب کے سب خٹک مشہور ہو گئے۔ کم از کم یہ مشہور و معروف خوشحال خان خٹک کی بیاض میں مذکور ہے جسے اُس کے پوتے نے اپنی "تاریخِ مرصّع" میں درج کیا۔

شوال سے قبیلہ مشرق کی طرف موجودہ ضلع بنوں میں آ گیا جہاں اسے دو اور ہم نسل قبیلے ملے ـــ ہونئے اور منگلئے۔ یہ دونوں ۱۰۵۰ء کے قریب اِس وادی پر قابض ہوئے تھے جب یہ محمود اور اُس کے غزنوی جانشینوں کے ڈیڑھ سو سالہ حملوں سے ویران ہو چکی تھی۔ کوئی ۱۲۰۰ء کے قریب بنّیک یہاں آئے اور ہونئی اور منگلئی کو نکال کر خٹکوں کے ساتھ آباد ہو گئے۔ کچھ عرصے تک دونوں کرّم (موجودہ ایڈورڈز آباد چھاؤنی) کی دونوں شاخوں کی زمینوں پر آباد رہے۔ جب خٹکوں کو کچھ اور جگہ کی ضرورت محسوس ہوئی تو

وہ مزید مشرق کی طرف بڑھے۔ بنوں شیتکوں کے پاس چھوڑ کر (جو بنوچیوں کے مورث بنے) وہ شمال اور مشرق کی طرف پھیلتے گئے۔ "جنوغر" (= دوشیزہ کی چوٹی) یا کافر کوٹ کے اوپر (جو روایتاً چوٹیوں کا ایک مجموعہ ہے اور دور سے کسی ناقابلِ تسخیر قلعے کی حدود معلوم ہوتی ہیں) کی طرف۔ تیری وادی کے اوپر (جو اب بھی مغربی شاخ کا صدر مقام ہے)، موجودہ ضلع کوہاٹ کے جنوب اور مشرق کے اوپر اور بنگش کے ساتھ مل کر اورکزئیوں کو تیراہ اور سفید کوہ کی شاخوں کی طرف دھکیل کر اور بالآخر سندھ کے نیلاب (اٹک کے قریب) تک کا سارا علاقہ انہوں نے زیر کر لیا۔ اب بھی یہ علاقے زیادہ تر خٹک قبضے میں ہیں۔ بعد میں شہنشاہ اکبر کے ہم عصر ملک اکو نے انہیں ضلع پشاور کے جنوب مشرقی حصے تک پھیلا دیا اور اسی میں اُس نے اکوڑہ بسایا جو اب ڈویژن کا صدر مقام ہے۔

ملک اکو خٹک شہرت کا بانی مبانی ہے اور پہلا اہم خان تھا جس کے بعد خوانین کا ایک سلسلہ چلا جو پٹھانوں میں مشہور ترین ہے۔ اکو بے حد بہادر اور موقع شناس جنگ آزما تھا۔ جب اکبر کابل سے واپس آیا اور قلعہ اٹک کی بنیاد رکھی تو اس نے نوشہرہ سے سندھ تک سڑک کو مسافروں کے لئے ہموار پایا اور اس نے بھرے دربار میں خٹک سردار کو امیر الثغور مقرر کیا اور خطاب بھی دیا لیکن ملک نے کہا: "یہ مجھے نہیں چاہیئے مبادا میرے قبائلی حسد کریں اس کی بجائے مجھے جانوروں کی آمد و رفت پر ٹیکس لگانے دیں۔" وہ اسے "کان (گوش) ٹیکس" پکارتا تھا اور سارا قبیلہ اس میں حصہ دار تھا۔ یہ ٹیکس

بہت جلد پھیل کر گھاٹ، کنواں، گھر، نمک اور زمین تک حاوی ہو گیا اور بالآخر نوشہرہ سے سندھ تک کا علاقہ اسے بطور جاگیر مل گیا۔ اس نے مسافروں کے لئے سرائے بنوائی اور وہ خوب خاطر مدارات کرتا تھا۔" اگر صبح اس کے پاس کچھ ہوتا تھا تو وہ شام تک اسے خرچ کر ڈالتا تھا۔" لیکن وہ سڑک کو راہزنوں سے محفوظ کر سکا یا نہیں، اس کے متعلق حتمی طور پر کچھ معلوم نہیں۔ اس نے اسے یقیناً ہندو فقیروں سے صاف کر دیا کیونکہ اس نے اکبر کو جھمکوں سے بھرے ہوئے دو بڑے بڑے مٹی کے مرتبان دکھائے جو جوگیوں کے اسلام قبول نہ کرنے پر انہیں مار کر ان کے کانوں سے اتارے گئے تھے۔ اس نے کہا" میں نے مقتولین کی تعداد کا اندازہ صرف اسی طریقے سے لگایا ہے۔"

وہ اور اس کے جانشین شہنشاہان دہلی کے تحت اپنی جاگیرات پر قابض (برائے نام ہی سہی) رہے اور ہر خان، گو کافی سال حکومت کرتا تھا تاہم وہ بالآخر عموماً کسی عزیز کی تلوار کی نذر ہو جاتا تھا۔ مثلاً اکو نے نصف صدی سے زیادہ (۱۵۵۰ء تا ۱۶۰۰ء) حکومت کی اور اکو بقول ایک خٹک شاعر اس نے "زر و سیم کی تلوار چلا کر" یعنی داد و دہش سے لوگوں کے دل جیت لئے تاہم وہ اپنے ہی قبیلے سے مارا گیا۔ اس کا بیٹا یحیٰ طویل القامت اور اسی نسبت سے "بہادر" کوئی بیس سال برسر اقتدار و پیکار رہا حتیٰ کہ وہ یوسفزئیوں سے لڑتا ہوا کام آیا۔ اس کا پوتا شہباز "حاتم ثانی" خداداد صلاحیتوں کا مالک لیکن سخت ظالم تھا، کوئی اکیس سال کے دور کے بعد ۱۶۴۱ء میں ڈاکوؤں سے لڑتا ہوا مارا گیا۔

پھر اکو کا پڑپوتا خوشحال خان برسر اقتدار آیا، عظیم ترین خان، ایک

لاثانی سورما، ایک شاعرِ بااسلوب، ایک مردِ تعلیم یافتہ، جو تاریخ ساز ثابت ہُوا اور اب بھی خان رفیع الشان کہلاتا ہے۔ وہ شاہجہاں کی فوج میں رہا اور بہت سے انعامات و اعزازات پائے۔ اُس نے یوسفزیوں اور دیگر قبائل کو دبایا جو وادیٔ پشاور میں لُوٹ مار کرتے تھے اور گو بعد میں اورنگزیب نے اُسے پکڑ لیا اور چھ سال جیل میں رکھا لیکن اُسے پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ چھوڑنا پڑا کیونکہ صرف وہی شمالی سرحد پر امن و امان قائم رکھنے کا اہل تھا۔ لیکن قید و بند میں اُس کے ولولے جاتے رہے گو اُس کی بہترین اور معرکے کی غزلیں اسی دَور کی پیداوار ہیں۔ تھوڑے عرصہ بعد وہ سیاست و جنگ اپنے بیٹوں اور پوتوں کے حق میں ترک کر گیا اور کافی عرصہ زندہ رہا حتیٰ کہ ۱۶۰۹ء میں چھہتّر سال کی عمر میں فوت ہُوا۔ اُس کی وصیّت یہ تھی کہ اُس کا مزار ایسی جگہ ہو:

"اُڑا کر نہ لائے جہاں بادِ کوہ
مُغل شاہسواروں کی گردِ سمند" (اقبالؒ)

اُس کا مرقد خفیہ رکھا گیا تاکہ دشمن اُس کی لاش کی توہین نہ کریں جو اُس کے عینِ حیات اُس کے نام سے ہی تھرا اُٹھتے تھے اور جس کی (اور جس کے قبائلیوں کی) تلوار اُن کی بہترین فوجوں کو ایسے تتر بتر کر دیتی تھی جیسے بگولہ خس و خاشاک کو۔"

اُس کا بیٹا اشرف (چوبیس سالہ لیکن راورٹی کے مطابق ستاون سالہ) ۱۶۵۹ء میں برسرِ اقتدار آیا (اورنگزیب نے ایک سال پہلے

اُس کے والد کو پکڑا تھا) اور ۱۶۸۲ء تک حکومت کرتا رہا اور بالآخر ایک مُغل قید خانہ میں مرا۔ ایک پوتا افضل، قریباً ساٹھ سال تک (۱۶۸۲ء تا ۱۷۴۱ء) حکمران رہا۔ وہ اپنے جدِّ امجد کے علمی و ادبی مذاق کا مالک تھا اور اُس نے خٹکوں کی تاریخ لکھی جس سے یہ خاکہ ماخوذ ہے۔

لیکن اُس کے دَور میں نفاق پڑ گیا۔ ایک بیٹا (جو اپنے باپ کے ساتھ کشیدہ تھا) تیری پر متمکن ہُوا جو اُس وقت سے ایک اہم اور علیحدہ خانی کا مرکز بن گیا۔ ایک چھوٹا سا حصّہ اکوڑے کے وقت میں ہی جُدا ہو کر شکر درّہ پر قائم ہو گیا تھا اور ساگری خٹک کہلانے لگا تھا۔ کچھ عرصہ کے لئے سردار تیری خان اکوڑہ کا ماتحت رہا لیکن وادیٔ پشاور سکھوں کی زد میں آگئی اور اکوڑہ کی سیادت ٹوٹ پھوٹ گئی اور صرف چند چھوٹے چھوٹے خان ہی بچ سکے۔ تیری وادی سکھ یورشوں سے محفوظ رہی لہٰذا تین چار ممتاز خوانین کے بعد سربراہی اپنی نسل کے جائز وارث اور سپوت نواب سر خواجہ محمد خان کو ملی جو حال ہی میں فوت ہُوا ہے۔

وہ ۱۸۲۴ء میں پیدا ہُوا اور وہ مستقلاً حکومتِ انگلشیہ کا وفادار رہا۔ دوسری سکھ لڑائی میں اُس نے ہماری نمایاں اعانت کی اور اُسے اپنی جان بچانے کے لئے بھاگنا بھی پڑا۔ ۱۸۵۷ء کے دوران بھی اُس کی وفاداری میں لغزش نہ آئی اور بعد کے افغان قضیئوں میں بھی وہ اوّل تا آخر پختہ رہا۔ وہ ایک جنگجو اور شورش پسند نسل کا سردار ہے اور بقول میک گریگر "گو وہ سینکڑوں

طریقوں سے آزمایا گیا تاہم وہ وفادار اُستوار ثابت ہُوا۔" ۱۸۷۳ء میں اُسے نواب اور کے سی ایس آئی (نائٹ کمانڈر آف دی سٹار آف انڈیا، ایک انگریزی خطاب) بنا دیا گیا اور چند ماہ پہلے تک وہ نہایت عزت و احترام سے زندہ رہا ـــ ایک جانباز، بامروّت اور مہمان نواز، وفادار پٹھان سردار کا بہترین نمونہ اور ایک ایسے خاندان کا چشم و چراغ جو تاریخِ مغرب کے مشاہیر کے بہت سے سلسلوں کی طرح صاحبِ امتیاز و افتخار رہا ہے!

اٹھارھواں باب

پٹھان، کوہستان اور کوہستانی

کیا خوب ہو اگر ہماری سرحدی پالیسی اتنی آگے بڑھ جائے کہ ہم بنوں اور تھل کے درمیان سڑک پر اصرار کر سکیں۔ ہم نے اب تک وزیریوں کے دوستانہ جذبات سے فائدہ اٹھا کر وادئ داور میں جھانکا ہے اور اسی قبیل کے چند دیگر اقدامات (جن کا ابھی ذکر ہوگا) کسی واضح پالیسی کے لوازمات ہیں اور ملحقہ وادئ خوست کو بھی ہمارے دائرہ مطالعہ و معائنہ میں لانا مفید ہوگا۔ یہ پہاڑیوں کے مدور گھیرے کی بجائے ایک دائرے میں بند ہے اور داور اور کرم کے درمیان واقع ہے اور صرف وہیں کھلی ہے جہاں کرم کا ایک معاون دریائے شامل باہر نکلتا ہے۔ یہ بنوں سے تھل کو جانے والی چھوٹی سڑک کے ساتھ ساتھ قدرتی راستہ ہے لیکن اس میں بالائی وادئ داور سے بھی داخل ہو سکتے ہیں یعنی وادئ کرم سے گاؤں درپ خیل کے پاس سے گذر کر۔ اس سے بھی مشکل راستہ مغرب سے ہے۔ گو ۹۔۱۸۷ء میں ہمارے افسر اور فوجی اس میں سے گذرے تاہم ہمارا علم اتنا ہی ہے جتنا داور کے متعلق ہے۔ کوئی چالیس میل لمبی (لیکن اتنی چوڑی نہیں) اور کرم کی طرح زرخیز، اسے شامل

کی تین معاون ندیاں سیراب کرتی ہیں اور اس میں تجارتی لکڑی، ایندھن اور
چارے کی بہتات ہے اور بہت اچھا چاول، تمباکو اور گندم پیدا ہوتے ہیں اور
خوست وال اسے بنوں میں بیچتے ہیں۔ ایسبسٹوس بھی بہت مقدار میں ہوتا ہے
آب و ہوا عمدہ ہے اور لوگ بوزجیوں اور داوریوں کی طرح دوغلے ہیں۔
ان کے بڑے بڑے گاؤں تو نہیں لیکن چھوٹے چھوٹے بہت سے ہیں
آبادی کافی ہے اور خوشحال ہے، کسی کو مالیہ نہیں دیتے سوائے اس کے
کہ کابلی لشکر یہاں تک پہنچ کر زبردستی اینٹھ لیں اور وہ غزنی اور زکو جدران سے
آتے ہیں یا منگل علاقے سے۔

جدرانوں کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ان کی صنعت و حرفت ضرب المثل
ہے اور ان کا علاقہ خاص طور پر سرسبز ہے۔ بقول حیات خان یہ "خوبصورت
پہاڑوں، بے شمار نالوں سے سیراب ہونیوالی اور سرو سے ڈھکی ہوئی
زرخیز ڈھلانوں (جن پر مختلف النوع پھلوں کے درخت بہت جلد اُگتے
ہیں) اور تازہ تقویت بخش ہوا" کا علاقہ ہے۔ گویا یہاں بنوں کا سینی ٹوریم بن
سکتا ہے۔ لیکن اس کی پیداوار قبیلے کے لئے ناکافی ہے جو حیات خان کے
مبالغہ آمیز بیان کے مطابق ۵,۰۰۰ ہتھیاربند پر مشتمل ہے۔ وہ دیگر کہستانیوں
کی طرح ہر سال کافی تعداد میں تلاشِ معاش میں برطانوی علاقے میں آتے ہیں۔
وہ جبلتاً جھگڑالو نہیں لیکن منگلوں اور غلزیوں کے درمیان رہتے ہوئے انہیں
ہر وقت لڑائی کے لئے کمربستہ رہنا پڑتا ہے اور اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیئے
کہ ان کا ایک قبائلی فیصلہ ہے کہ ایک غیر مسلح جدران کو ایک بیل جرمانہ ہوگا جسے

بھری محفل کھائے گی۔

منگل قبیلے غالباً منگلئے یا شمال مغربی چین سے آئے ہیں اور وادئ کُرّم کی جنوبی طرف کافی مضبوط ہیں (۸,۰۰۰ متحاربین) اور پیوار پر ایک بُرج کے بھی مالک ہیں۔ ہمارا ان سے واسطہ بہت کم پڑا ہے لہٰذا ہماری معلومات محدود ہیں اور یہ ان کا کوئی اچھا تاثر نہیں دیتیں۔ انہوں نے بھی زمختوں کی طرح جنرل رابرٹس کے تحت کرّم فوج کی مواصلات میں خلل اندازی کی پوری کوشش کی جو بعض اوقات تشویش انگیز بن گئی۔ ان کا مخصوص پیشہ چوری ہے گو وہ موقعہ ملنے پر ڈکیتی سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اگر ان پر منظّم اور مصمّم حملہ ہو تو وہ ٹھہر نہیں سکتے اور جدران پہاڑیوں یا بالائی کرّم سے اُنہیں آسانی سے ناک چنے چبوائے جا سکتے ہیں۔

ان کے برعکس زمخت بہت دلیر کہستانی ہیں، جسمانی طور پر خوشنما اور طاقتور اور ہمسایہ تُوریوں کے ہم پلّہ۔ وہ مذہب میں سُنّی اور سیاست میں سامل ہیں اور تُوریوں اور بنگشوں کے ساتھ کشیدگی کے باوجود ان سے برسرِ پیکار نہیں لیکن ان کے اپنے دو حصّے خوب اُلجھے رہتے ہیں۔ ان میں سے ہر حصّہ ۲,۰۰۰ متحاربین پر مشتمل ہے۔ ان کی جنگ چالیس سال پہلے ایک ندی پر واقع گاؤں پر قبضہ کے سلسلہ میں شروع ہوئی اور اتنی شدت اختیار کر گئی کہ ایک زرخیز علاقہ کی ترقی رُک گئی۔ یُوں سمجھئے کہ ان کا علاقہ ایک مثلّث ہے جسے قصبہ ہانگو سے وادئ میرانزئی کے ساتھ ساتھ تھل تک اور وہاں سے کرّم کے پاس سے ابراہیم زئی تک کھینچا جا سکتا ہے جبکہ زواغر کی پہاڑیاں اس کا قاعدہ ہیں۔ یہ

پہاڑیاں اُنہیں اور کرزیرُں سے علیٰحدہ کرتی ہیں اور کہیں کہیں ۹,... فٹ سے بھی بلند ہیں اور وسط کی بلند تر گھاٹیوں میں کئی دیہات کا مجمع ہے جسے زَادو کہتے ہیں۔ اِن کا بڑا قلعہ ان کے نزدیک ناقابلِ فتح ہے۔ ہمارے خطِ مواصلات پر حملوں کی سزا دینے کے لئے جنرل ٹِکر ۱۸۷۹ء میں وہاں گیا اور زادو کے علاوہ بالاتر گھاٹی پر بھی قابض ہوگیا اور ایک حِصّے کی بستیاں تہ و بالا کردیں۔ بڑے بڑے زرخیز گاؤں چبوترے دار کھیتوں کے درمیان سفید کوہ کی چکّردار اور چٹانی چوٹیوں اور گھاٹیوں پر ہیروں کی طرح نصب ہیں۔ اِن میں تجارتی لکڑی بہت کم ہوتی ہے اور صرف محروم نوشاہ بلوط اور جنگلی زیتون ہوتے ہیں گھاٹیوں اور وادیوں میں پانی وافر ہے اور اگر باہمی جدال و قتال نہ ہو تو کاشت اور ترقی کے امکانات کافی ہیں۔

زیادہ طاقتور کہستانیوں کی طرف رجوع کرنے سے پہلے (جو سلسلہ کی بالائی ڈھلانوں پر ہیں) چمکنیوں کی ایک چھوٹی سی بستی کا سرسری ذکر ضروری ہے جو ان میں در آئی ہے۔ بقول بیلیو یہ لوگ ایرانی مسلمانوں کا ایک ملحدانہ فرقہ ہیں جو اپنی مخصوص مذہبی تقریبات اور غیر اخلاقی رسومات کی وجہ سے زیرِ تعذیب رہنے کی وجہ سے ہجرت کر آیا۔ ان کی ایک کہانی میں انگلستان کے جدید فرقوں کی دعوتِ عشق، کی چاشنی ہے۔ مذہبی تقریب کے ایک مرحلہ پر روشنی بجھادی جاتی تھی اور مرد اور عورتیں بلا امتیاز شیروشکر ہوجاتے تھے اور خوب دادِ عیش دیتے تھے۔ ایرانی اسے چراغ کُش اور پٹھان 'اورمڑ' کہتے تھے لیکن اب چمکنیوں کی کایا پلٹ ہوگئی ہے اور وہ کٹّر مسلمان بن گئے ہیں۔

ان میں سے جو وادیٔ کرمانہ کے مغربی حصہ میں آباد ہیں وہ کبھی کبھی اورکزیوں سے منسوب کر دیئے جاتے ہیں حالانکہ یہ چراغ کُش ہر لحاظ سے ایک علیٰحدہ نسل ہیں اور ان کی چھوٹی چھوٹی بستیاں وادیٔ پشاور سے کابل تک اور وزیری علاقہ میں کنی گورم تک پائی جاتی ہیں۔

زمختوں کے مشرق میں اور سفید کوہ کی جنوبی ڈھلانوں کے ساتھ ساتھ، آفریدیوں کے پاس سے گذر کر کوہاٹ تک اور جنوب میں زیریں میرانزئی اور شمال میں دریائے بارہ کے بین الدریائی فراز کے درمیان، اورکزئی علاقہ ہے جسے کبھی کبھی تیراہ بھی کہتے ہیں جو اصلاً ایک محدود علاقے پر منطبق ہوتا ہے۔ یہ کثیرالتعداد، طاقتور، جنوں آگیں اور بعض لحاظ سے ناقابل رسائی سرحدی قبیلہ بلکہ مجمع القبائل ہے کیونکہ یہ صرف نسلیاتی لحاظ سے ہی ایک ہیں سیاسی لحاظ سے نہیں۔ ان کے چھ بڑے حصّے بہت سے گروہوں میں تقسیم ہیں، سیاست میں گار اور سامل ہیں اور تیراہ سادات اور سنیوں کے درمیان باہمی حرب و ضرب پر تو کاوگنڈی نے حکومت کو ایک خصوصی رپورٹ پیش کی۔ کچھ حصّوں کا دارو مدار زیادہ تر برطانوی علاقے پر ہے لیکن دیگر حصّے حلقے سے باہر ہیں لہٰذا تادیبی کارروائی آسان نہیں۔ دولت زئیوں نے کئی معاندانہ اقدامات کئے ہیں اور بزوٹی اور ربیعہ خیل کے خلاف تو فوج کشی کرنا پڑی لیکن اکثر نے ہمیں کوئی خاص تکلیف نہیں دی۔ ان کے ساتھ من حیث القبیلہ تعلقات قریباً ناممکن ہیں کیونکہ وہ لوٹ مار کی ہوس یا کفار سے نفرت کے سوا متحد نہیں ہو سکتے۔ ان کی متحارب طاقت ۲۵,۰۰۰ آدمی ہیں۔ مجموعی طور پر وہ آفریدیوں جیسے عمدہ تو نہیں پھر بھی قوی اور توانا

کہستانی ہیں اور گو ان کی جنگجویانہ خدمات مباحثہ فیہ ہیں تاہم ان کا نشانہ مسلّمہ طور پر پکّا اور سیدھا ہے۔ ان کا پٹھان ماخذ مشکوک ہے لیکن اگر دغا، لالچ اور ظلم میں وہ اپنے پٹھان ہمسایوں سے بہتر نہیں تو کمتر بھی نہیں۔ بقول میک گریگر" اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ دیگر پٹھانوں کی طرح اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لئے پاجیانہ جھوٹ بولنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ وہ روپیہ لے کر گھناؤنے سے گھناؤنا جُرم کر سکتے ہیں۔ وہ زخمی یا بے بس دشمن پر نفرت انگیز ظلم کر سکتے ہیں اور مصمّم مدافعت و مقاومت پر بُزدلی دکھا سکتے ہیں۔" اس کے برعکس یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ صدیوں سے جنوں آموز معلّمین اور سخت مذہبی آویزش نے انہیں تلخ و ترش بنا دیا ہے۔ وہ اچھی حکومت کی بجائے توہمّات کی گرفت میں رہے ہیں اور وہ ہمارے نظریۂ رواداری و عدم مداخلت کو نہیں سمجھتے۔ وہ آفریدیوں سے بدتر نہیں ہیں جن کے خمیر میں یہ جرائم گندھے ہوئے ہیں لیکن آفریدی کڑے ضبط کے تحت ہماری مقامی فوج کا بہترین سپاہی بن سکتا ہے۔ جسے ہم حیرت انگیز تحمّل کہتے ہیں وہ ان کے لئے ناقابلِ فہم ہے اور مزید شہ دیتا ہے لیکن فوری سزا ان کے شوریدہ سروں پر بھی جادو کا اثر رکھتی ہے۔ وہ صرف ایک جابرانہ حکومت کے قائل ہیں اور اگر وہ کبھی اس کے تحت آ جائیں تو ہم باہم دست و گریباں اور تکلیف دہ ہمسایوں کو خوشحال لوگوں میں بدل سکتے ہیں اور وہ ہمارے لئے تنومند کہستانیوں کا خزانہ بن سکتے ہیں۔

تیراہ اپنے محدود معنوں میں تو رہ بیلا کی اوپر کی وادی بارہ، حصار کے

اوپر کی اسی دریا کی جنوبی شاخ، سہ درّہ کے اُوپر کی خانکی وادی اور خزینہ کے اُوپر کی وادی کُرمانہ پر مشتمل ہے۔ اگر یہ یاد رکھا جائے کہ یہ سب قریب قریب سے ہی نکلتے ہیں اور پہلے دونو دریا پشاور کے پاس سے گذر کر دریائے کابل، تیسرا کوہاٹ توئی (ندی) ہانگو کے قریب اور چوتھا ابراہیم زئی کے قریب کرّم میں گرتا ہے تو یہ ۰۰۰، ۲ مربّع میل کا رقبہ ہو جاتا ہے۔ جو پانچ سے چھ ہزار فٹ تک بلند ہے اور اس کا محلّ وقوع اور فوائد آسانی سے سمجھ میں آسکتے ہیں۔ ان میں سے پہلا (بمعہ وادئ رنگیال اور میدان) آفریدیوں کے قبضہ میں ہے اور باقی تینوں بمعہ مضافین اورکزئیوں کے ہیں جو اکثر سردی اور گرمی میں مکان بدلتے رہتے ہیں اور سردی میں اپنے ریوڑ بھی پست پہاڑیوں بلکہ برطانوی علاقہ میں لے آتے ہیں۔ سب کم و بیش وحشیانہ اور کھڑی پہاڑیوں میں محصور ہیں جن کی چوٹیاں بالخصوص ہماری سرحد کے آس پاس شاندار شاہ بلوط اور صنوبر سے لدی پھندی ہیں۔ زادہ غر اور سمندغر (جو میرانزئی کی طرف خانکی وادی پر محیط ہیں) علی الترتیب ۰۰۰، ۹ اور ۰۰۰، ۷ فٹ اونچے ہیں۔ جنوبی بارہ سے جُدا کرنے والا مُعزّ و غر ۰۰۰، ۸ فٹ سے زیادہ اونچا ہے اور خانکی دریا سے ۰۰۰، ۵ فٹ بلند ہے۔ لہٰذا ان کو پار کرنا خالہ جی کا گھر نہیں۔ درّہ اُبلان کوہاٹ سے چھ میل دور ایک مضبوط مقام ہے اور بزوٹی قبیلہ کے ساتھ ایک دو معرکوں کا منظر رہا ہے۔ یہ چار ہزار فٹ اُونچا ہے اور نیچے جنوبی بارہ طوّغر (۰۰۰، ۷ فٹ) کے دامن میں بہتا ہے اور عین اس کے مقابل ہے۔ یہاں تو جنگ بھی معمولی لڑنے کے لئے

تین سو اہلِ سپارٹا بھی بمشکل درکار ہوں گے۔ اس سے آگے بھی دو تین راستے ہیں جن پر لدے ہوئے بیل سفر کر سکتے ہیں لیکن پیش قدمی کی اصل مشکلات تو انہیں عبور کرنے کے بعد ہی شروع ہوتی ہیں۔ وادیاں یہاں زرخیز طاسوں اور واضح سنگلاخ پہاڑیوں سے پٹی پڑی ہیں جو قدرتی مورچے ہیں اور فوجوں کے گذرنے میں سدِّ راہ ہیں۔ دوسری طرف سے آئیں تو آفریدی در آجاتے ہیں۔

اُوپر جاکر یہ وادیاں چوڑی، وسیع بلکہ کشادہ سطوحِ مرتفع بن جاتی ہیں۔ وادیٔ کُرمانہ کوئی ۲۰۰ مربع میل کا طاس ہے جس میں چبوترے دار کھیت، دیہات اور برج متعدّد ہیں۔ پُراشجار، سیراب و شاداب، سیب، ناشپاتی اور انگور وغیرہ کی بہشت اور مختلف النوع سبزیوں اور بہترین عمارتی لکڑی کی سرزمین!

کم لباس اور کرزئی کے لئے سردی سخت ہے تو گرمی نہایت خوشگوار ہے۔ تاہم برطانوی حکومت کے لئے تو یہ وادیاں ممنوعہ علاقہ ہے یا ایسا کہ داخل ہو جائیں تو نکلنا محال ہے۔ بہرحال ہمیں اس کے اندر جھانکنے کا تو حق ہے جو روایاتی شہزادۂ حبشہ سے زیادہ ہے جو چین سے پیرو تک بنی نوع انسان کو جاننے کا آرزومند تھا۔ زیادہ دیر کی بات نہیں کہ ہندوستان کے کوارٹر ماسٹر جنرل نے فقدانِ معلومات کی توجیہہ کی کہ "گو پشاور اور کوہاٹ کی چھاؤنیوں سے دور ترین مقام اسّی میل سے زیادہ نہیں، گو یہاں کے باشندے مستقلاً ہمارے علاقے میں نظر آتے ہیں، اس کے قبائلی سرحد کے بڑے

قبائل میں سے ہیں اور اس کی سیاست سرحدی معاملات کا ایک اہم ترین حصّہ ہے تاہم اس کے متعلق کوئی قابلِ قدر چیز تحریر میں نہیں آئی " اِس کا لفظی مطلب نہیں لینا چاہیئے۔ کیپٹن ٹکر ۱۸۰۲ء میں تیراہ گیا تو اسے آڑے ہاتھوں لیا گیا۔ ایک مقامی، آغا عباس نے اِس پر لکھا ہے اور ایک سروئیر مقامی بھیس میں پٹھان شکاریوں کے ساتھ گیا اور اسے اوپر سے دیکھ کر میدان وادی کے ایک حصّہ کا نقشہ بنا لایا۔ بارہ وادی کو اوپر سے دیکھنے کی کوشش ناکام ہو گئی اور گو برطانوی افسر اس کے گرداگرد گھوم چکے ہیں تاہم یہ اندر سے خطّہ نامعلوم ہے۔ لہٰذا اِن کہسانوں اور کہسانیوں کے متعلق قطعی معلومات ہنوز ناپید ہیں!

اُنیسواں باب

ایک پٹھان شب خُون

"پفر" (پنجاب اِرریگولر فرنٹیئر فورسس کا مخفف) روزمرہ میں "قبائل باہر نکل آئے" کا فقرہ ہمیشہ سرحدی مقامات میں اضافی جوش وخروش کا موجب ہوتا تھا۔ گو سنتریوں کی تعداد دوگنی کر دی گئی تھی (کسی افسر کا برآمدہ ایک یا دو سے خالی نہ ہوتا تھا) اور پہرہ بھی اپنے کارتوسوں کے ساتھ تیار ادھر ادھر گشت کرتا رہتا تھا تاہم یہ خطرہ ہمیشہ رہتا تھا کہ کوئی چالاک پٹھان کسی پہ طعام خانہ سے گھر جاتے ہوئے گولی نہ چلا دے۔ قلعہ کوہاٹ کی دیواریں بعض قبائلیوں کی نظروں میں رہتی تھیں جو اپنی شامیں غیر محفوظ حصوں پر دور سے گولیاں چلا کر گذارتے تھے اور مقابل موکھوں پر مستقل نشانہ باندھے رکھتے تھے تاکہ کوئی بے خبر قابو آ جائے۔ چھاؤنی کی حدود کے باہر کوئی راستہ بدرقہ کے بغیر محفوظ نہ تھا اور مسافروں کو پہاڑیوں سے گذرتے وقت چوکنا رہنا پڑتا تھا۔ زیادہ تر اورکزئی سرحد کے اِس پار علاقے کو نشانہ بنائے رکھتے تھے متصل دیہات مسلسل زیرِ آتش رہتے اور گو وہ جوابی حملہ ہوتے ہی سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگ جاتے تاہم وہ پہلے ہی ہلّہ میں ایک دو دیہاتی مار دیتے یا

زخمی کر دیتے۔ بلا حفاظت جانور تو فوراً اُڑا لئے جاتے۔ نوبت بایں جا رسید کہ کچھ پولیس چوکیوں پر بھی حملے ہوئے اور ایک دو سپاہی کاٹ پھینکے گئے اور بعض کو پکڑ کر لے گئے۔ ڈپٹی کمشنر کی فرستادہ ایک مختصر سی جمعیت بد قسمتی سے کسی غلط فہمی کے تحت پہاڑیوں کے اندر بہت دُور نکل گئی اور اُبلان پہاڑیوں کی ڈھلوان زمین میں اُلجھ گئی اور ناکام لوٹی۔ اس کا ایک افسر اور کوئی ایک درجن سپاہی مارے گئے اور بہت سے زخمی ہو گئے۔ مشکل یہ پڑی کہ مُجرم ایک غیر اہم قبیلہ سے تھے اور قدرتی طور پر محفوظ محلّ وقوع کی وجہ سے اُن کے خلاف وسیع پیمانے پر کارروائی ہی کامیاب ہو سکتی تھی۔ اصل میں بزدوٹی اپنے کو محفوظ سمجھتے تھے اور اس مفروضے پر کس بل دکھا رہے تھے۔ مزید برآں معدودے چند پیشہ ور جانور چوروں اور راہزنوں کے خلاف ایک لشکر بھیجنا بھیئے پر مکھی مارنے کے مترادف تھا۔ اُبلان کا معاملہ سنگین ہوتا جا رہا تھا لہٰذا اُن کی سخت ناکہ بندی کر دی گئی لیکن اس سے کیا نقصان ہوتا؟ تاجر وہ تھے نہیں اور پست وادیوں میں چاول بو کر خود تیراہ چلے جاتے تھے۔ چوبیس گھنٹے کے اندر وہ اپنے گرمائی صدر مقام سے لڑائی کے لئے اُتر سکتے تھے اور اس سے بھی آدھے وقت میں چاروں کھونٹ بکھر بھی سکتے تھے۔ اُن کی سرمائی آبادیاں کوہاٹ سے صرف ایک گھنٹے کا سفر (گھوڑے پر) تھیں لیکن ایک مُہیب سلسلۂ کوہ کی دوسری طرف تھیں جس میں جانے کے لئے ایک نعلیں درّہ تھا جس میں بندوقچیوں کے لئے جگہیں تھیں اور جس کا وسطی پست ترین مقام ... ۴۰۰ فٹ بلند تھا۔ اس پر کوتل یا دیدبان تھا جہاں سے

بزوٹی فوج کی نقل و حرکت کو بخوبی دیکھ سکتے تھے جیسے کوہاٹ سے قبائل کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کی مستعد نگرانی اور بازار میں جاسوسوں کی موجودگی انہیں لمحہ بہ لمحہ خبردار رکھتی تھی۔ دیگر اورکزئی دونوں طرف ساز باز رکھتے تھے اور مجرم بزوٹیوں کو راہِ راست پر نہ لاتے تھے۔ مہم کے لئے ٹھوس جواز چاہیئے اور صرف زر اور زیانِ جاں کے لئے حکومت کی منظوری درکار ہے تبھی اُبلان کوتل پر حملہ ہو۔ پھر بھی ناکہ بندی سے زیادہ مؤثر کارروائی ضروری تھی اور چونکہ فروری آ چکا تھا لہٰذا کارروائی فوری طور پر درکار تھی۔ تاخیر کا مطلب غیر معیّن التوا تھا۔ ان حالات میں ڈپٹی کمشنر اور کمانڈنٹ نے بزوٹیوں پر شبخون مارنے کا منصوبہ بنایا اور اسے اتنا خفیہ رکھا کہ فوج کو بھی اس کی بھنک نہ پڑ سکی۔

فیصلہ ہُوا کہ ایک دن ایک فوج پشاور سے چلے۔ اس کا ایک حصّہ اکاخیل علاقے میں جائے تاکہ قبائل اُس طرف منعطف ہو جائیں اور دوسرا حصّہ درّہ کوہاٹ جائے اور یہاں اُن کی توجّہ مرکوز کرائے۔ اسی وقت درّہ کے آفریدیوں کو کوہاٹ مذاکرات کے لئے بُلایا جائے اور اسے طُول دیا جائے تاکہ اگر شک ہو تو آفریدیوں اور درّے تک محدود رہو۔ بالآخر کوہاٹ کے کمانڈر کو خفیہ ہدایات ملیں اور ایک رات اواخر فروری میں وہ سب طعام خانہ میں آئے اور عشائیہ کے بعد کچھ بازیاں لگاتے رہے۔ آدھی رات سے پہلے افسر توپخانہ کو قلعہ بھیجا گیا کہ وہ پہاڑی توپ خانہ کو تیاری کا حکم دے اور آدھ گھنٹہ بعد جوانوں کو بھی یہی حکم دیا جانا تھا۔ اسی

وقت مقامی پیادہ کی دو رجمنٹوں کو پریڈ کرائی گئی اور ایک بجے تیسری بھی شامل کر دی گئی کسی بگل کے بغیر۔

دریں اثناء پنجاب کیولری کی ایک رجمنٹ نے خاموشی سے قصبے کو گھیر لیا اور آمد و رفت بند کر دی۔ پولیس ناکوں پر آ گئی۔ ایک بجے ڈپٹی کمشنر، کمانڈنٹ، چیدہ دستہ، حلیف سردار اور پہاڑی توپ خانہ بمعہ دو رجمنٹ پیادہ اور کوئی ایک درجن اسلحہ بردار خچر سیدھے درّے کی طرف روانہ ہو گئے۔ پروگرام کے مطابق حلیف سردار سنتریوں کا منہ بند کریں گے اور پھر پولیس اُنہیں فوراً پکڑ لے گی۔ لیکن یہ کارروائی ایسی اچانک تھی اور بزوٹی اپنے محلِ وقوع پر اتنے مغرور تھے کہ اُنہوں نے سنتری رکھے ہی نہیں اور وہ کوہاٹ رنگ رلیوں کے لئے گئے ہوئے تھے۔ لہٰذا کوتل پر خاموشی سے قبضہ ہو گیا اور فوج اندھیرے میں چوٹی پر چڑھ آئی اور صبح تک ایک بزوٹی گاؤں پر پل پڑی۔ حلیف سرداروں کو پیشگی مدافعت سے روکنے کے لئے بھیجا گیا تھا لیکن انہوں نے اپنے لوگوں کی بھلائی کے لئے دہشت پھیلانا مناسب سمجھا لہٰذا جب فوج پہلے بڑے گاؤں میں پہنچی تو ایک طرف سے عورتیں اور جانور نکل رہے تھے اور دوسری طرف ان کے جنگجو آتشباری کر رہے تھے۔ لیکن اس پر ہلہ کر کے قبضہ کر لیا گیا اور سرغنے مارے گئے۔ شبخون مکمل ہو گیا لیکن مزید پیش قدمی خطرناک بھی تھی اور لاحاصل بھی۔ خوب سبق سکھایا گیا۔ بہت سے جانور پکڑ لئے گئے اور سارا گاؤں ماسوائے مسجد نذرِ آتش کر دیا گیا۔ اور کافی بزوٹی (بہادری کے باوجود) مارے گئے اور

زخمی ہوئے۔ اب پہاڑی توپوں نے گولہ باری شروع کی اور ان کے سائے میں فوج کوہاٹ واپس آ گئی، صرف تین جانوں کے بدلے اور بارہ گھنٹے کے اندر اندر؟

ان تکلیف دِہ ہمسایوں کا سزا سے میانت کا تصوّر غالباً اِس سے بہتر طور پر نہ توڑا جاسکتا تھا۔ ان کے لئے یہ بالکل ایک خالص، پٹھان شبخون تھا اور اردگرد کے قبائل نے بھی بلا شک و شبہ اِس اچانک کامیاب وار کی تعریف کی جو شاید ایک بڑی مُہم بھی انجام نہ دے سکتی۔ اِس کا اثر طلسمی تھا۔ مارچ کے آخر تک ان کے جرگے آئے اور اِس پر راضی ہوگئے کہ وہ ۲۰۰،۱ روپے جُرمانہ اور نو بڑے معتبر بطورِ یرغمال دیں گے اور اپنی تلواریں جو انسال ڈپٹی کمشنر، کاو گُنزی کے پاؤں پر ڈال دیں۔ قبائل میں امن و سکون ہو گیا۔

بلیسواں باب

کوہاٹ اور فرنٹیر فورس

پانی کی نالیوں، گندم کے کھیتوں، باغیچوں اور پایاب اور کنکریلی ندیوں کے درمیان ایک منظر خیز قصبہ جس کے پس منظر میں نیلی پہاڑیوں کے سلسلے ہیں ؛ مشرق کی طرف سنگلاخ جو اکی آفریدیوں کے سنگلاخ پہاڑ ؛ ڈھلوان اور اُوپر کو اُٹھتا ہُوا ، کوتل کے عین عقب میں جس کے اُوپر سے درّہ گلے آفریدی علاقہ سے پشاور کو جاتا ہے اور مزید ڈھلوان اُبلان درّہ سے ٹلوغر کی بلند تر چوٹیوں کی سمت بڑھتا ہے ؛ مغرب کی طرف اورکزئی پہاڑیاں اور زرخیز میرانزئی وادی جو شاذ و نادر ہی جانسوز گرمی کے دوران بادِ نسیم سے محروم رہتی ہیں اور جو بسا اوقات اتنی تیز اور ٹھنڈی ہوتی ہے کہ سرحد کے ساتھ ساتھ خنک ترین نسیم کو ہی ہانگو کہنے لگ گئے ہیں ۔ ذرا جنوب کی طرف زیتون سے لدا پھندا میر خُویلی ایستادہ ہے اور وہ سلسلہ بھی جس کے گرد دریائے توئی ایک سرسبز مزروعہ علاقے سے گذرتا ہُوا سندھ کی طرف آتا ہے۔ پیش منظر میں شہتوتوں کے جُھنڈ اور باغات ہیں یا اخروٹوں اور ہندوستانی انجیروں کے درخت اور ان میں حاجی بہادر کا مشہور مقبرہ ہے جہاں سرحدی

پٹھان اپنی غیر معمولی قسمیں اٹھاتے ہیں جو عدالتی قسموں سے بھی زیادہ واجب العمل ہوتی ہیں ۔ یہ ہے کوہاٹ ، ایک نخلستان ایک ایسے علاقے میں جو دوسرے علاقوں سے کچھ زیادہ ہی بنجر، چٹیل اور پتھریلا ہے ؛

قصبہ کے پاس ہی قلعہ ہے جو خطِ سرحدی سے رائفل کی زد میں ہے اور نہ جانے کتنے مواقع پر کتنے جوان اِن کی زد میں آئے ہیں ۔ اِس سے تھوڑے ہی فاصلے پر چھاؤنیاں ہیں جن میں دو تین پیادہ ، ایک رسالہ پلٹنیں ہوتی ہیں اور ایک ایک پہاڑی اور عام بیٹری ہوتی ہے جن کی کل نفری ٣،٥٠٠ ہوتی ہے جو سراسر فرنٹیئر فورس سے تعلق رکھتی ہے جسے پنجاب میں پیفر کہتے ہیں ۔ چھوٹے چھوٹے آراستہ پیراستہ مکان مع آراستہ پیراستہ باغیچے جہاں سنتری رات بھر پہرہ دیتے ہیں اور گملوں اور گوزبیری جیسی جھاڑیوں پر بھی کڑی نظر رکھتے ہیں مبادا کوئی سرحد پار کا اُٹھائی گیرا ان کے پیچھے چھپا ہُوا ہو ۔ ایک چھوٹا سا گرجا ، ایک کمرۂ اجتماع جسے رقص گاہ یا تھیئٹر میں بھی بدلا جا سکتا ہے، ایک لائبریری، ایک ریکٹ کورٹ، ٹینس کورٹ، کرکٹ گراؤنڈ، پولو، ریس کورس، سب کے سب حسبِ موقعہ تغیر پذیر ! سب ایک بنگلے کے اندر تاکہ مکین ورزش بھی کرلیں، شام کی چائے بھی پی لیں، بینڈ بھی سُن سکیں اور ناول بھی پڑھ سکیں اور طعام خانہ کے حلقہ سے باہر نکلے بغیر المیہ یا طربیہ کی دیولیوں کے کرشمے بھی دیکھ سکیں ! فوجی طعام خانہ کے دروازے اُن تمام کے لئے کھُلے ہیں جو فرض کے تحت یا خوشی سے یہاں آتے ہیں ۔ یہاں ہر شخص رہ تو نہیں سکتا لیکن راہگیر کو بھی یہاں اجنبی نہیں سمجھا جاتا کیونکہ کوہاٹ گیریژن

کے دروازوں کے اندر اجنبی تو آ ہی نہیں سکتے۔ اور کوہاٹ ایسی چھاؤنیوں کا نمونہ ہے جو ہوتی مردان سے لے کر راجن پور تک پھیلی ہوئی ہیں اور سب میں پتھر کی نعزی ہے۔ اگر مہماں نوازی سرحدی لوگوں کا خاصہ ہے تو یہ سرحدی دستوں کا بھی اوّلین اور واجب التعمیل قاعدہ ہے؛

لیکن فوج مسافر کی صرف خاطر تواضع ہی نہیں کرتی بلکہ اُسے بدرقہ بھی دیتی ہے اور وہ بہترین سنتریوں کی حفاظت میں سفر کرتا ہے اور اکثر جگہوں پر اسے ان دونوں کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ راستے کے دونو طرف کے غنڈے اپنی دار و گیر میں مہمان نوازی کی روایات کو مُخل نہیں ہونے دیتے۔ ممکن ہے وہ اس کی جان نہ لیں (کیونکہ ایک صاحب کی جان لینا نفع بخش سودا نہیں ہے) لیکن ننانوے مومن پٹھانوں کے مقابلے پر ایک انگریز کافر کے لئے خوب شور مچتا ہے اور وہ اس کی کوئی منقولہ چیز نہیں چھوڑتے اور اس کاروبار میں ان کا اصُول یہ ہے کہ "جو آسانی سے ہاتھ آئے وہ لے جاؤ"۔ کمشنر کے گھوڑے، لیفٹننٹ گورنر کے کیمپ سے اُونٹ یا پشاور کی بارکوں سے رائفلیں چُرانا تو آئے دن کا کاروبار ہے جو ان کے لئے اتنا ہی آسان ہے جتنا گاؤں سے مویشی چُرانا یا تاجر کا اکلوتا بیٹا اغوا کر لینا (جو کسی موٹے تازے ہندو کی آنکھ کا تارا ہوتا ہے) جو اس کے کان کا پہلا کٹا ہوا ٹکڑا دیکھتے ہی ان اٹھائی گیروں کو منہ مانگی رقم دے دیتا ہے۔ لیکن کرنل کے تکیے کے نیچے سے ریوالور اٹھانا، ضلعی افسر کے خیمے کی سب چیزوں پر ہاتھ صاف کر جانا اور صرف اس کے بستر کی دری چھوڑ جانا یا خوابیدہ پولیس افسر کے خیمے میں سوراخ کرنا اور اونگھتے ہوئے کانسٹیبلوں

کے بیچ میں سے اُس کے اور اُس کی بیوی کے کپڑے چُرا لے جانا واقعی ہاتھ اور فن کا کمال ہے، لیکن سنتریوں (جو دیکھتے ہی گولی چلا دیتے ہیں) سے بھرپور کوہاٹ چھاؤنی کے وسط میں سے ایک پُورے کا پُورا خیمہ اُٹھا کر لے جانا تو گویا غضب کا کمال تھا اور یہاں کاج جو تھوڑا ہی عرصہ پہلے وقوع پذیر ہُوا۔

فورس کے سنتری بھی عام سنتری نہیں ہیں۔ وہ بھاری بھرکم بُوٹ پہنے ہوئے اور ایک چمکدار سنگین لئے ہُوئے صاف سامنے آگے پیچھے نہیں پھرتے اور نہ دعوتِ نظارہ دیتے ہیں اور نہ سرحدی چور کو دعوتِ معرکہ بلکہ بعض کے سنتری دیوار کے عقب میں گھات میں لگے ہُوئے ہوتے ہیں، موقعہ کے منتظر یا ٹکڑیوں کی صورت میں ایسے مقامات پر پھُونک پھُونک کر قدم اُٹھاتے ہیں جہاں کوئی ڈاکو قابو کیا جا سکتا ہو۔ وہ پکے نشانہ باز ہوتے ہیں اور اُن کے ریوالوروں میں گولیوں کی بجائے چھرّے ہوتے ہیں اور اُن کا مشہور اصُول ہے "بولو اور چوٹ مارو، للکارو اور گولی مارو اور گولی ہمیشہ پہلے مارو"۔ محافظ خانے میں کسی اضافہ کی ضرورت نہیں بلکہ ہر صبح کو عموماً یہ رپورٹ ملتی ہے کہ "رات دو بدمعاش مار دیئے گئے اور تیسرا بُری طرح زخمی ہو کر بھاگ نکلا"۔ اگر سرحد پر جھٹ پٹے میں کوئی للکارے تو فوراً بولنا چاہیئے بلکہ ایک زمانے میں پشاور میں تو یہ ریت تھی کہ فوراً زمین پر لیٹ جاؤ اور پھر پکارو "دوست"! عام بعض سنتری اتنا تیز فہم ہے کہ وہ "صاحب" پر گولی نہیں چلاتا لیکن مہمان کو ضرور اشارہ دیا جاتا ہے کہ وہ "رات کو اپنے ملازموں کو دور نہ جانے دے کیونکہ گشتی پارٹیاں متوقع حملہ آوروں کی تلاش میں اِدھر اُدھر سرگرداں ہیں"

حملہ آور کو سنتری نظر آ جائے تو فوراً کمین گاہ سے گولی چلانے سے نہیں چوکتا لہٰذا سنتری کا بچاؤ اسی میں ہے کہ وہ بلا دریغ پہل کرے!

سنتری یونٹ کو بچانے کے لئے جو کچھ کرتا ہے وہی بعض سرحد یا اس کے کافی حصّہ کے لئے کرتی ہے۔ پشاور اور کوئٹہ کے سوا بعض ہندوستان کی اہم ترین چوکیوں میں متعیّن ہیں اور فوج کا ہراول دستہ ہیں۔ وہ ہر لحاظ سے ایک سرحدی فوج ہیں جو قریباً اہلِ سرحد سے ہی بھرتی کی جاتی ہے۔ اس میں سکھ، گورکھے، پنجابی، مسلمان، افغان، چند بلوچ اور سرحد کے اُس پار کے کافی پٹھان قبائلی ہوتے ہیں۔ اسی طرح ملکہ کی اپنی کور آف گائیڈز (پیادہ و رسالہ کی شاندار پلٹن جس کا صدر مقام وادئ پشاور میں ہوتی مردان میں ہے) میں ماوراے سرحد کے چیدہ چیدہ آدمی ہوتے ہیں جو سندھ اور کابل کے درمیانی علاقے اور درّوں کو بخوبی جانتے ہیں اور اُن قبائل سے تعلق رکھتے ہیں جن کے خلاف ہمیں کسی وقت مہم کشی کرنا پڑی اور جن کے اہلِ قبیلہ کے ساتھ پھر بھی نوک جھوک ہو سکتی ہے۔

جن ملکوں میں حبّ الوطنی ایک بنیادی خوبی سمجھی جاتی ہے وہاں ایسے لوگوں کو بھرتی کرنا خطرناک یا مشکوک ہو سکتا ہے جو اپنے ہی وطن کو نذرِ شمشیر و آتش کر دیں اور اپنے ہی عزیز و اقارب سے لڑیں اور اپنے ہی گاؤں کو نذرِ آتش ہوتا دیکھیں۔ پٹھان بعض نے اگر ڈاکٹر جانسن کو پڑھا ہے تو وہ شاید اس سے اتفاق کرے گی کہ حب الوطنی ایک شہدے کی آخری پناہ ہے۔" شاید اس میں نمک حلالی یا عسکری غیرت کا بھی احساس ہے۔ بہر حال فرنٹیئر فورس

میں ہماری یہ پالیسی نہایت کامیاب ہے۔ وہ ہر جگہ جا سکتا ہے، کسی کے خلاف بھی حسب ہدایت لڑ سکتا ہے اور گھر واپس جا کر وہ حکومت کے لئے نیک جذبات رکھتا ہے جس کی طاقت اور وسائل اُس نے دیکھے ہیں اور وہ اپنے لوگوں کی رائے اُس کے بارے میں ہموار کرتا ہے۔ یہ لوگ بار بار اپنے قبیلہ اور جنم بھومی کے خلاف لڑے ہیں۔ نہ صرف اپنے بزرگوں اور بھائیوں کے خلاف بلکہ مقامی غازیوں کی پُرزور مذہبی اپیلوں کے خلاف بھی: میرانزئی مہم میں ایک موقعہ پر ایک مقامی افسر نے (جس کا والد زیرِ نشانہ پہاڑی پر تھا) اپنے کمانڈنٹ پر زور دیا کہ فوج اور غازیوں کے درمیان آمدِ شب سے پہلے خون بکھیر دیا جائے تاکہ ہمدردی کا احساس تک نہ رینگ سکے:

ممکن ہے ہماری ملازمت میں آنے سے پہلے اُس نے بھی ہمارے دیہات پر حملہ کیا ہو، ہمارے گھوڑے چُرائے ہوں، ہمارے سنتریوں پر گولی چلائی ہو یا ہمارے خلاف جم کر لڑا ہو لیکن ہماری طرف آنے کے بعد وہ اپنی خدمات سے اِن سب کا مداوا کر دیتا ہے۔ اِس کے برعکس چور کو چور کے پیچھے ڈالنے یا شکار چور کو محافظِ شکار کے طور پر سیاہ و سفید کا مالک بنا دینے کے اصُول کے مطابق بعض اوقات ایک مہادیری ایک مفید ترین سرحدی سپاہی بن جاتا ہے۔ پٹھّان کا افسر نہ صرف اپنے مقابلے کے دشمن سے لڑ کر خوش ہوتا ہے بلکہ وہ اِس میں ایک عمدہ رنگروٹ کی امکانیّت بھی دیکھتا ہے۔ جب علی مسجد پر شدید ترین

لڑائی ہو رہی تھی تو امیر کے کچھ گھوڑ سوار پیادہ گائیڈز کی پوری آتشباری کی زد میں آ گئے اور عاجز آ کر واپس چلے گئے لیکن ایک پٹھان واپس آیا اور للکارتے ہوئے آدھی پلٹن کی آتشباری کے سامنے سینہ سپر ہو گیا۔ اتفاق سے وہ بچ رہا لیکن کرنل نے اسے تاڑ لیا اور موقعہ ملتے ہی اسے بھرتی کر کے بہترین گائیڈ بنا دیا۔ مسٹر رڈیارڈ کپلنگ نے ایک اور گائیڈ رنگروٹ پر ایک عظیم قصہ تحریر کیا جس کا والد ایک مشہور قانون شکن تھا۔ وہ کرنل کی گھوڑی لے گیا لیکن بیٹے کی زندگی بچا دی جو اُس کی خاطر تک آیا۔ بوڑھے نے اپنا بیٹا بھرتی ہونے کے لئے بھیج دیا اور اُسے آب و دانہ کی قسم دلوائی کہ وہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر لڑکے کو بچائے گا خواہ اُسے والد کی مزاحمت ہی کرنی پڑے۔

ایک چیز وہ کبھی ترک نہیں کرتا بلکہ اپنے ساتھ لاتا ہے، ملازمت کے دوران زندہ رکھتا ہے، اُس کی زندہ داری کے لئے رخصت لیتا ہے۔ اُس کی تسکین کے لئے اپنی ترقی بھی ٹھکرا دیتا ہے اور ریٹائر ہونے کے بعد اُس سے دل کھول کر لطف اندوز ہونے کے خواب دیکھتا رہتا ہے اور وہ ہے اس کی محبوب دشمنی! اگر ملازمت پر کوئی دشمنی نہ ہو تو اسے کوئی نہ کوئی ورثے میں مل سکتی ہے جو یکساں طور پر واجب العمل ہوتی ہے خواہ یہ ان لوگوں سے متعلق ہو جنہیں اُس نے سالہا سال سے نہیں دیکھا یا جن سے وہ باہر آتے وقت آشنا بھی نہ تھا۔ ہندوستان میں سفید آدمی شادی یا بیماری یا تبدیلی آب و ہوا یا بڑے سٹیشن سے بچنے کے لئے چھٹی لیتا ہے یا کبھی کبھار گھر جانے

یا ورثے میں ملنے والی دولت کے لئے رخصت مانگتا ہے۔ کالے آدمی کی والدہ یا قریبی عزیز کی مرگ ہوتی ہے یا مقدمہ ہوتا ہے یا کوئی پھوڑا نکلتا ہے پٹھان سپاہی کے لئے ایک ہی اشد ضروری نجی کام ہے جس کے لئے اُسے لازماً چھٹی چاہیئے۔" پلٹن کے مائی باپ: چھ مہینے، نہیں تو کم از کم تین مہینے!" پھر وہ کہتا ہے" اے خدا کے دوست! خدا کے لئے چھ ہفتے تو دے ہی دیں کیونکہ میرا کام ناگزیر ہے اور اِس سے کم مدت میں نمٹایا نہیں جا سکتا!" ہر ایک اِس چھٹی کا مقصد جانتا ہے لیکن ایسے ہی مواقع پر چھٹی کے انکار پر وہ مفرور ہو جاتا ہے۔ وہ سرحد کے اندر کچھ نہیں کرے گا اور سرحد پار وہ سب کچھ کر سکتا ہے اور اگر وہ واپس نہ آئے تو غالباً وہ کسی تکڑے دشمن کی نذر ہو گیا۔ چچا اور بھتیجا، ہولادین خان اور عیسیٰ خان کی خونی دشمنی مشہور کہانی ہے۔ وہ دونو ایک ہی پلٹن میں تھے اور دونو کو بیک وقت چھٹی نہیں دی جاتی تھی۔ وہ دونو سالہا سال تک ملکہ کے دشمنوں سے لڑتے رہے اور مُہم آزمائی کرتے رہے لیکن باہمی دشمنی اتنی تلخ تھی کہ اگر دونو چھٹی پر جاتے تو ایک ہی واپس آتا۔ کچھ دیر بعد نئے افسر آگئے اور دونو کو چھٹی مل گئی اور صرف عیسیٰ خان واپس آیا۔ اُس نے یہ ذکر نہیں کیا کہ جانے سے تین دن پہلے وہ بنوں سے ڈیرہ اسماعیل خان گیا تھا اور پھر واپس آیا تھا (کوئی ۷۰ میل کا فاصلہ) اور اپنے سابقہ افسر سے بارود کا ایک ڈبہ مانگا جو خود اعلیٰ نشانچی تھا لیکن اُس نے واپسی پر رازدارانہ طور پر بتایا کہ اگر نارمن صاحب کا سیدھی مار کرتا ہوا بارود، نہ ملتا تو وہ یہ قضیہ کبھی نہ چکا سکتا۔

ککی خیلوں کی پست پہاڑیوں میں ایک بُرج ہے جو تھوڑے فاصلے تک اِردگرد کے علاقہ پر حاوی ہے۔ یہ ایک سابقہ گائیڈ کی رہائش گاہ ہے۔ وہ شہ زور، عقاب چشم اور مضبوط الارادہ انسان تھا، ۱۸۵۷ء کے جنگ آزماؤں سے لڑا تھا اور رفارستہ مشن کے ساتھ کاشغر گیا تھا، امبیلہ کے متحدہ قبائل کے خلاف اور دوسری کوہ سیاہ مُہم میں لڑا تھا لیکن بالآخر ایک بدلہ چکانے کے لئے اپنا نام کٹوا گیا تھا۔ اُس کے سامنے اعزاز و امتیاز کا راستہ کُھلا تھا لیکن وہ نام کٹانے پر مُصر رہا اور اپنے افسر سے کہنے لگا: "مَیں نے یہ بُرج دیکھا تو پتہ چلا کہ سچی خوشی کیا ہے اور یہ بھی کہ مَیں اِس سے ہر آنے جانے والے دشمن پر گولی چلا سکتا ہُوں"۔ جب تک وہ خاص دشمن نہ مرے یہ آدمی اب بھی اُس کی تاک میں ہوگا۔ پیفر کے پُرانے کاغذات و دستاویزات سے ایسی بہت سی کہانیاں اخذ کی جا سکتی ہیں، نہایت بہادرانہ کارناموں کی جو ہمارے نظریۂ قانون کے مطابق ان کارپردازوں کو تختۂ دار پر لٹکوا دیتے۔ ہمارے نزدیک "ایک قتل غنڈہ پن کی علامت ہے لیکن لاکھوں ایک ہیرو کی"۔ لیکن پٹھان اتنا تاویل پسند نہیں ہے کہ وہ اِس فرق کو دیکھ سکے۔ اِس کے لئے تعداد کی بجائے متصوّرہ ذمہ داری جرم کو پاک کر دیتی ہے۔ ایک تازہ تر، نمائندہ مثال پٹھان سپاہی کے نظریۂ قتل کو واضح کرنے کے لئے کافی ہوگی۔

وقائع نگار لکھتا ہے: "بنّوں سے سوار ہو کر اپنے خیمہ کی چوکی پر پہنچنے سے پہلے مَیں ایک خوش وضع راست قامت پٹھان سے آملا جو اپنی پُھرتی اور طریقۂ سلام کی بنا پر ایک سپاہی معلوم ہوتا تھا گو وردی میں نہ تھا اور

اُس کا انداز کسی خاص گلے شکوے کا مظہر تھا۔ ایک وجیہہ، خندہ رُو انسان جس کی میں نے خیریت دریافت کی تو اُس نے مجھے اپنی کتھا سُنائی۔ "چند دن پہلے میں پہلی پنجاب انفنٹری میں جمعدار تھا اور یہی رجمنٹ میری زندگی تھی۔ میں اُس میں پندرہ سال رہا اور افغان مہم میں اور اُس سرحد پر لڑتا رہا۔ میرے خلاف کوئی اندراج نہیں۔ میں اپنے افسروں کو پسند کرتا تھا اور صوبیدار بننے کا منتظر تھا۔ حال ہی میں ایک "اشد نجی کام" (اُس نے اس کا ایسا لطیف سا ذکر کیا گویا کسی دشمن کی موت کی بجائے بچے کی پیدائش کا واقعہ تھا) کی وجہ سے مجھے رخصت لینا پڑی اور اپنے گھر ابازئی میں آیا۔ چار ماہ کی رخصت تھی، میرے پاس بہترین رائفلیں تھیں اور میں ہر طرح تیار تھا لیکن مطلوبہ آدمی چلا گیا تھا اور میری چھٹی تک اس کی واپسی کی اُمید نہ تھی۔ لہٰذا میں واپس نہ جا سکا اور نہ ہی اپنے ایڈجوٹنٹ کو عریضہ لکھ سکا کیونکہ مجھے ہر روز اس کی واپسی کی اُمید رہی۔ صاحب! یوں میں تین ہفتے تک انتظار کرتا رہا اور جس دن وہ آیا (یہاں اُس کی آنکھیں یکبارگی چمک اُٹھیں) میں نے اُس کا صفایا کر دیا اور اگلے ہی دن رجمنٹ کو واپس ہُوا لیکن بدقسمتی سے اُنہوں نے میرا نام کاٹ دیا اور میری ملازمت جاتی رہی کیونکہ میں بلا رخصت غیر حاضر تھا۔ مجھے چھٹی نہ لینے کا افسوس ہے لیکن اُس آدمی کی تاخیر میں میرا کیا قصور تھا؟ صاحب! آپ مجھے بتائیں گے کہ جرنل کہاں ہے؟ میں اسے تلاش کر رہا ہوں۔ وہ اچھا اور منصف مزاج آدمی ہے، پٹھانوں کو جانتا ہے اور مجھے سُن کر میری اُلجھن دُور کر دے گا"۔۔۔ اور یہ رہے صاحب! آپکے خیمے۔ السلام علیکم!"

ایبٹ آباد، کوہاٹ ، بنوں، ڈیرہ اسمٰعیل، ڈیرہ غازی، ہوتی مردان اور راجن پور (جن میں سے پانچ پہلے ضلعی صدر مقام اور آخری دونو تحصیلی صدر مقام بھی ہیں) کے دستوں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے قلعوں یا چوکیوں کی ایک قطار ہے جن میں فرنٹیئر فورسس اور فرنٹیئر ملیشیا کے دستے تعینات ہیں۔ ہزارہ، پشاور اور کوہاٹ کی سرحدوں پر یہ سسٹم کم ہیں لہٰذا کافی تعداد متعین ہے۔ بنوں اور ڈیرہ جاتی سرحدوں پر یہ چھوٹے چھوٹے اور زیادہ ہیں جن کا درمیانی فاصلہ دس بارہ میل ہوتا ہے اور یہ صرف ایک دو دروں کی حفاظت کے لئے ہوتے ہیں اور لعض ملیشیا سے وابستہ ہوتے ہیں یا صرف ملیشیا ہی ہوتی ہے۔ سرحدی روزمرہ میں ملیشیا کا سپاہی 'زندہ گیر' ہوتا ہے اور شکل وشباہت میں سرحدی قزاقوں سے زیادہ مختلف نہیں ہوتا جن کا ذکر پہلے ہوا ہے۔ عملاً وہ ایک قبائلی اور حملہ آور (چھاپہ مار) ہوتا ہے جو اپنے اہل قبیلہ کو ہماری سرحد میں مار دھاڑ کرنے سے روکنے کے لئے ملازم رکھا جاتا ہے۔ اُسے بہتر اسلحہ دیا جاتا ہے لیکن اسے مجرموں کو پکڑ کر قانون کے حوالے کرنا ہوتا ہے۔ اس کا میلان بہتر اسلحہ اور مواقع کی وجہ سے اپنی دشمنیاں چکانے کا ہوتا ہے لیکن اسے سختی اور کامیابی سے دبا دیا گیا ہے۔ وہ سپاہی نہیں ہوتا کیونکہ اسے تربیت نہیں دی جاتی لیکن وہ علاقے سے بخوبی واقف اور مخالف ساتھیوں کی نقل و حرکت سے آگاہ ہوتا ہے بلکہ ان کے ساتھ کافی وقت گذارتا ہے اور بہترین سپاہی بننے کی امکانیت رکھتا ہے۔

اُنہیں اور قبائلی لیویز کو منہا کرکے فرنٹیئر فورسس کی نفری قریباً

....،۱۵ہے[1] جو بریگیڈیر جنرل کے تحت ہوتی ہے جو خود چند سال پہلے تک پنجاب کے لیفٹننٹ گورنر لیکن اب سپہ سالار کے ماتحت ہوتا ہے۔ ہر رجمنٹ کے پاس باربرداری، رسل و رسائل اور خورونوش کے اپنے انتظامات ہیں اور یہ ایک لمحہ کے نوٹس پر لام کے لئے نکل سکتی ہے۔ ہنگامی ضرورت کے تحت کوہاٹ میں جنگی مشاورت کے بعد پیادہ، رسالہ اور توپخانہ چند گھنٹے کے اندر مُہم پر روانہ ہو سکتے ہیں۔ ایسی متحرک قوت شاید ہی کسی اور حکومت کو نصیب ہو اور نہ ہی ایسے قابلِ فخر سپاہی!

رفتارِ واقعات نے اِس کی تنظیم میں کئی تبدیلیاں کروائی ہیں اور مزید متوقع ہیں۔ اپنے امتیازی کردار کے باوجود سپہ سالار کے تحت آنے سے یہ افواجِ ہند کا حصّہ بن گئی ہے۔ کوئٹہ پر تسلط اور مزید پیش رفت کے ساتھ ساتھ یہ صرف مقامی اور سرحدی فوج نہیں رہ سکتی۔ راجن پور اور ڈیرہ غازی خان اب سرحدی مقامات نہیں رہے بلکہ چوکیاں کئی سو میل مغرب کی طرف بڑھ گئی ہیں۔ پفر کے جتنے جوان اب رجمنٹ کے صدر مقام میں ہیں اتنے ہی خور، رکھنی، کینگری اور کوٹ محمد خان میں تعینات ہیں اور ان سے پرے پوری وادی اور پشین

---

[1] فرنٹیئر فورس اس وقت پنجاب کیولری کی چار رجمنٹوں کو رآف گائیڈز، کیولری، انفنٹری (جن کو کھلنے بند ہونیوالی توپیں فراہم ہونیوالی ہیں)' چار پہاڑی بیٹریوں' ایک گیریزن بیٹری، سکھ انفنٹری کی چار رجمنٹوں، پنجاب انفنٹری کی پانچ رجمنٹوں اور دو گورکھا بٹالینوں پر مشتمل ہے۔

میں بنگال رجمنٹ کے جوان متعین ہیں۔ اوپر کی طرف ڈیرہ اسماعیل خان سے جلد ہی کچھ پلٹنیں ایازئی اور وادئ ژوب منتقل ہو جائیں گی اور بنوں سے کچھ جوان ٹوچی کے راستے جدران سطوحِ مرتفع پر چلے جائیں گے۔

لیکن بدقسمتی ہوگی اگر ان تغیرات کے تحت فورسس کا امتیازی کردار ہا تا رہے کیونکہ نہ صرف اس کی خصوصی اہمیت ہے بلکہ یہ ایک بہترین تنظیم ہے جس سے ہم اضافی ملیشیا اور لیویز بھرتی کر سکتے ہیں۔ اب یہ بے قاعدہ فورسس نہیں رہی لیکن بہترین ملیشیا کی بے قاعدہ رجمنٹوں کو اس کی شاندار رجمنٹوں میں ضم کر دینا چاہیئے۔ خصوصی قبائلی لیویز اس کے آزمودہ کار افسروں کے تحت (جنہیں سرحدیوں پر عبور حاصل ہے) چمک اٹھیں گے۔ معتدل اندازہ کے مطابق صرف پنجاب میں ان قبائل کی متحارب طاقت ۱٫۶۰٫۰۰۰ پٹھانوں اور ۱٫۵۰٫۰۰۰ بلوچوں پر مشتمل ہے۔ سرحد، سندھ اور خود بلوچستان اس کے علاوہ ہیں اور خواہ باقاعدہ خواہ ملیشیا یا لیویز کی صورت میں یہ بہت کارآمد ہیں۔

قطعی اعداد و شمار کچھ بھی ہوں، بھرتی کا میدان یقیناً وسیع ہے اور فرنٹیر فورس کی توسیع صرف پالیسی اور سرمائے کا مسئلہ ہے اور آئندہ تبدیلیاں اس سمت میں ہوں یا محلِ وقوع کے سلسلہ میں فرنٹیر فورس کسی بھی جامع سرحدی دفاع کی سکیم میں سرِفہرست ہوگی۔ یہ بھی پیشینگوئی کی جا سکتی ہے کہ بغیر زمانی کی طرح مستقبل میں بھی ایسے سالار فراہم کرے گی جو اس دفاع کی اہم ترین کارروائیوں کی قیادت کر سکیں گے!

اکیسواں باب

آفریدی اور درہ کوہاٹ

جو بات اورکزئیوں اور ان کے علاقہ کے متعلق صحیح ہے وہی ملحقہ آفریدیوں پر صادق آتی ہے جو کوہِ سفید پر اگلا بڑا مجمع القبائل ہے اور اضلاع کوہاٹ و پشاور میں نوّے میل تک ہمارا سرحدی ہمسایہ ہے۔ یہ ان سے بھی عمدہ اور کثیر التعداد لوگ ہیں، ان کے متحاربین ۲۶,۰۰۰ سے زیادہ ہیں، کوہاٹ اور پشاور کے دروں پر قابض ہونے کی وجہ سے دیگر اکثر قبائل سے اہم تر ہیں اور دفاعی نکتۂ نظر سے وہ قریب قریب ناقابلِ رسائی ہیں۔ وہ وحشی ترین اور پرلے درجے کے قانون شکن لیکن بہادر ترین، صاف دل ترین اور دغاباز ترین پٹھانوں میں شامل ہیں گو ان کی جیداری اور چال ڈھال انگریزوں کو ان کا گرویدہ بنا دیتی ہے۔ سرحدی کہستانی جس کا ہم اتنا چرچا سنتے ہیں، جو بے شمار مخصوص کہانیوں کا کلیدی کردار ہے اور جس کے متعلق لکھنا تردید و تضاد کا ایک سلسلہ ہوتا ہے، وضع قطع میں ایک ملائم، مضبوط الاعضاء انسان ہے جس کی جلد نسبتاً سفید، ناک اور رخسار ابھرے ہوئے، چہرہ اکثر و بیشتر خوشنما، انداز و اطوار منضبط، بے تکلفانہ اور قریب

قریب مروّت آمیز ہے۔ بقول میک گریگر (جو ایک معمولی مبصّر نہیں) وہ" ایک عمدہ، طویل القامت اور کسرتی بدن کا کہستانی ہے جس کے لچکدار قدم پشاور کی گرد آلود گلیوں میں بھی اُس کے پہاڑی ماخذ کے مظہر ہیں۔" لیکن وہ مزید لکھتا ہے۔"(وہ) ایک بے رحم، بزدلانہ ڈاکو ہے، ایک شقی القلب، دغاباز قاتل جو بچپن سے گھناؤنے مکر و فریب اور سفاکانہ انتقام کے مناظر میں پروان چڑھتا ہے۔ اُس میں کوئی تغیر نہیں ہُوا۔ وہ جیسے بے ننگ، ظالم وحشی کی حیثیت سے زندہ رہتا ہے ویسے ہی مرتا بھی ہے۔ ہمارے ساتھ اتنے دیرینہ رابطے اور اتنی تعداد میں ہماری ملازمت میں آنے کے بعد توقع تو یہ تھی کہ وہ وفاداری، انصاف اور رحم کا معنی سمجھ سکے گا لیکن آفریدی آج بھی اپنے آبا و اجداد جیسا ہے۔" یہ دونو تبصرے انتہا پسندانہ ہیں۔ وہ خٹک اور یوسفزئی کی طرح طویل القامت اور وجیہہ نہیں اور پشاور میں تو اسے بھلا آدمی سمجھا جا سکتا ہے۔ مہمان نوازی اُس کی خصلت ہے اور وہ اُس پر جان دیتا ہے۔ ایسے کئی قصے مشہور ہیں کہ اُس نے اپنی زندگی مہمان کے لئے قربان کر دی اور یہ بھی کہ مہمان کے گھر یا زمین سے نکلنے کے بعد اُس کی جان لینے کے لئے جوڑ توڑ کرتا رہا۔ اُس کی کئی لڑائیاں عورتوں کے بارے میں ہوتی ہیں اور وہ حقوق الزوجین کے معاملے میں لااُبالی ہے۔ میکسن لکھتا ہے۔" ایسے بہت سے مقدمات ہوتے ہیں جن میں ایک آفریدی خوشحالی میں ایک حسین بیوی لاتا ہے اور پھر تنگدستی میں اُس کے بدلے میں کمتر درجے کی بیوی (کچھ رقم کے ساتھ) لے آتا ہے۔" داغِ تہمت صرف جان لے کر مٹایا جا سکتا ہے

لیکن "جو لوگ مُنہ مانگی قیمت دے سکتے ہیں وہ ان کے مشوروں سے بہرہ مند ہو سکتے ہیں۔"

بظاہر مذہب کا دعویدار اور قرآن حکیم کا عامل لیکن بباطن مذہب سے لاتعلق ہے حتیٰ کہ ملاّ سے بھی کوئی لگاؤ نہیں - خوشحال خٹک اورکزیوں کے متعلق کہتا ہے :

" وہ راسخ الاعتقادی سے محروم ہو گئے ہیں
تیراہ میں مُوذّن کی آواز سُنائی نہیں دیتی
اور آفریدی تو گمراہوں سے بھی بڑھ کر ملحد ہیں
اُن کے ہاں نہ جنازہ ہے نہ مُلاّ
نہ خیرات وصدقات ، نہ نذر نیاز اور نہ ہی خوفِ خدا ۔"

آفریدستان میں آنے والے مبلّغین کامیاب نہ ہو سکے اور اب بھی وہ اسے ایک خطرناک جگہ سمجھتے ہیں - پٹھانوں کے بُرے وفا حصّے میں بھی آفریدی بیوفائی ضرب المثل ہے ۔ جنوبی پٹھان کے لیے (اولیاً و شہدا کی) زیارتوں کی باافراط فراہمی عزیز ترین ہے اور کسی انگریز کافر کو مارنے والے غازی کے لئے پتھروں کا ایک ڈھیر تعمیر کر دینا ایسے ہی ہے جیسے ولیسٹ منسٹرایبی (انگلستان کا مشہور قبرستان - مترجم) یا معبد شہر ۔ لیکن آفریدستان ان سے محروم ہے ۔ بیلیو کے مطابق کسی وقت یہاں ایک بھی زیارت نہ تھی لیکن آفریدی نے جس طرح اِس کمی کو دُور کیا اس پر اُس نے ایک کہانی لکھی ہے ۔ ہمسایہ قبائل کے شرم دلانے پر وہ پشاور سے ایک ملاّ کو پکڑ لائے اور مذہبی خدمات پر

مامور کیا۔ ملّا نے قیام زیارت کی ضرورت پر زور دیا تاکہ اُس کی بھی کوئی قربانگاہ ہو اور زائرین نذر نیاز پیش کریں۔ لالچی آفریدی کو یہ نفع کا سودا معلوم ہُوا۔ زیارت کے لئے آسان ترین نسخہ کیا ہو سکتا تھا؟ محترم ملّا سے شہادت کا اہل تر اِنسان اور کون ہو سکتا تھا؟ پس ملّا کو قتل کر دیا گیا اور یوں تیراہ میں پہلی زیارت ظہور پذیر ہُوئی۔

ایک اور موقعہ پر ایک ملّا کو پکڑا جو قرآن حکیم کی کتابت کر رہا تھا اور اُس سے کہا گیا۔ "تم کہتے ہو کہ یہ کتاب اللہ سے آتی ہے لیکن تم خود اِس کو لکھ رہے ہو۔ ملّا کے لئے جُھوٹ بولنا تو مناسب نہیں ہے۔" پس آفریدی کو ایک دُوسری زیارت مِل گئی۔

اخلاق و مذہب کی طرح وہ سیاست و تفریحات میں بھی ایسے ہی بے ہنگم ہیں۔ پرلے درجے کے انفرادیت پسند اور باہمی طور پر متفرق و منتشر، غیر منضبط اور اپنے سرداروں کے قابو سے بھی باہر ہیں لیکن ہماری مخالفت میں وہ سب متحد ہیں بالخصوص جب کابل کا سوال ہو جس کے امیروں کو خراج مِلنے کی بجائے ہمیشہ اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ ایک سرکش قبیلہ کو سزا دینا ہو تو اُس کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ انتقامی کارروائی کا دائرہ زیادہ وسیع نہ ہو ورنہ سب قبائل اکٹھے ہو جائیں گے۔ ان کی اندرونی چپقلشیں جتنی زیادہ ہیں بیرونی چپقلشیں اتنی ہی کم ہیں یعنی آفریدی اپنی طاقت کو ہمسایوں سے لڑنے پر صَرف کرنے کی بجائے گھریلو کھیت کے لئے محفوظ رکھتے ہیں۔ باہمی لڑائیاں ان کی زندگیوں میں وہی حیثیت رکھتی ہیں جو آئرستانیوں کے میلہ میں یا

انگریز مزدور کی شب ہفتہ ہیں! یہ دنگا فساد ہی تو زندگی میں نوید مسرت ہے
یہ گویا آفریدی زندگی میں ملح فی الطعام کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ اس کے لئے
گار اور سائل اور سُنّی اور سیّد (شیعہ) کے جھگڑوں میں نہیں پڑتا۔ زن، زر، زمین
یا پانی کوئی بھی عذر نقطۂ آغاز ہو سکتا ہے اور ایک دفعہ شروع ہو جائے تو پھر
صلح صفائی کا سوال ہی نہیں، صرف کوئی اشد مزدوری کام اس میں التوا تو ڈال
سکتا ہے لیکن یہ ختم تبھی ہوتا ہے جب طرفین کے سب مرد کام آجائیں۔
انگریز کا وقت نہ گذرے تو وہ جانور یا پرندے کا شکار کھیلتا ہے اور آفریدی
کا شکار اپنے ہم نوع کو مارنا ہے۔ جب کوئی کام نہ ہو تو وہ بندوق لے کر
چٹان کے عقب میں گھنٹوں شست باندھ کر بیٹھا رہتا ہے حتیٰ کہ کسی ہمسائے
پر گولی چلا دیتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ گولی اسی وقت مارتا ہے جب ہمسایہ
عین اُس مقام سے گذرے جس پر اُس نے نشانہ باندھا ہے اور اس
کے لئے اس کا انتظار خونیں کی بجائے قابلِ تعریف سمجھا جاتا ہے۔ اور تو
اور اس ذوقِ دغا سے گاؤں یا خاندان نصفا نصف آپس میں لڑتے ہیں،
کسی پناہ کی اوٹ میں، کسی تدبیر سے فائدہ اٹھا کر اور یہ لڑائی اس وقت
تک جاری رہتی ہے جب تک طرفین کے کئی آدمی نہ مارے جائیں یا بارود
ختم نہ ہو جائے یا فصل کی کٹائی سر پہ نہ آجائے یا طرفین کے درمیان کوئی طے
شدہ شادی عارضی صلح پر مجبور نہ کر دے۔ ہم اسے "دیدہ و دانستہ دغابازانہ قتل"
کہتے ہیں لیکن آفریدیوں کے لئے یہ کبوتر یا لومڑ کے شکار سے زیادہ نہیں۔
عورتیں خدمتگار ہونے کی وجہ سے کشاورزی اور چولہوں چوکوں میں اتنی

مصروف ہوتی ہیں کہ ان جنگوں میں حصّہ نہیں لے سکتیں لیکن وہ پتھروں کی پکّی نشانہ باز ہیں اور نازک وقت پر کامیاب ترین دفاع کرتی ہیں - دیگر اعتراضات کے علاوہ خواہ آفریدی ہمارے دیوانی اور فوجداری قوانین کی وجہ سے ہمیں رنگ میں بھنگ ڈالنے والا سمجھتا ہو خواہ ہمارے نرم اور مردم ناشناس سرحدی طریقہ کار کی وجہ سے ہم سے غیر مطمئن ہو، بہرحال وہ اپنے پہاڑوں میں ہمارا مستقل دشمن ہے اور مخالفت کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا - جو تھوڑا بہت ہم .... اُس کے متعلق جانتے ہیں وہ بہ نوکِ سنگین حاصل کیا گیا ہے اور بزبانِ میک گریگر "گو ہم سال ہا سال سے قبائل سے متعلق رہے ہیں تاہم کوئی انگریز آفریدستان میں بحیثیت دوست نہیں گیا"۔ اس کے برعکس آفریدی ہماری فوج میں بھرتی ہونے کے لئے بے تاب رہا ہے اور تین چار ہزار آفریدی ہماری یا مقامی سرداروں کی فوج میں شامل ہیں اور مختصر مدّت ملازمت کے پیشِ نظر ان کی مجموعی متحارب طاقت کا بیشتر حصّہ ہماری فوج میں خدمات انجام دے چکا ہے۔ مزید برآں آفریدی ایک وفادار سپاہی ثابت ہُوا ہے۔ اس کے اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ تعلقات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بخوشی ہمارے ساتھ مل کر ان کے خلاف لڑے گا اور اپنا علاقہ فتح کرنے میں ہمارا ممد و معاون ہوگا لیکن جن لڑائیوں میں وہ اچھا سپاہی ثابت ہُوا ہے ان میں بھی وہ لڑنے سے زیادہ لُوٹنے کی طرف مائل ہے، گرمی میں کچھ یادِ وطن سے مغلوب ہوتا ہے لیکن وہ اس وحشی سے ضرور ۔

مختلف ہے جس کا بدرقہ اپنے پہاڑوں میں بھی کارگر نہیں اور جس کی وزیری ڈاکو جتنی بھی عزت نہیں :

یہ تضاد آفریدیوں کے علاوہ ان کے علاقہ پر بھی صادق آتا ہے۔ سفید کوہ کی گھاٹیوں کی وجہ سے وہ مامون و مصئون معلوم ہوتے ہیں۔ خیبر کے سنگلاخ اور مضرِ صحت سلسلے ان کی فصیل ہیں، درّے ناقابلِ عبور ہیں اور خطرۂ مشترکہ کے پیشِ نظر قبائل وحدت پذیر ہو جاتے ہیں تاہم وہ میدانوں پر اتنے منحصر ہیں کہ ان کی یہ قدرتی طاقت بھی کمزوری بن جاتی ہے اور اُنہیں انہی کی پہاڑیوں میں محصور کر سکتی ہے۔ پشاور میدانِ لینیا کے علاوہ ان کی رسد اور طلب کی منڈی بھی ہے اور اِس سے قطع تعلق ان کے لئے بہت سنگین سزا ہے۔ ایک کامیاب ناکہ بندی بیرونی دُنیا سے اُن کا رابطہ توڑ سکتی ہے اور مہم سے زیادہ من مانی شرائط منوالنے پر مجبور کر سکتی ہے۔

آفریدی ماخذ پر بحث کرنا غیر ضروری ہے۔ بلیو کے مطابق وہ ہیروڈوٹس کا ذکر کردہ ایک قبیلہ دعلاقہ ہیں اور وہ کسی وقت ایک وسیع تر علاقے پر قابض تھے لیکن بعد میں علاقہ گیری کی جد و جہد میں پہاڑوں پر جانے کے لئے مجبور ہو گئے۔ وہ مخلوط النسل لوگ ہیں جیسا کہ دوسرے بھی ہیں لیکن وہ متعدد واضح جمعیتوں میں منقسم ہیں۔ آٹھ بڑے خیلوں میں سے چھ عموماً خیبر آفریدی کہلاتے ہیں۔ اکاخیل کا ان سے کوئی تعلق نہیں اور وہ سب کے سب وادئ پشاور میں دریائے بارا کے جنوب میں ہیں۔ آدم خیل کثیر التعداد ہیں اور پشاور اور کوہاٹ کی درمیانی پہاڑیوں میں رہتے ہیں

جو ایک پانے کی طرح ہماری سرحد میں سندھ تک پھیلی ہوئی ہیں اور جن کے بیچ میں سے دو اہم چھاؤنیوں کو سڑک جاتی ہے۔

یہ درہ کوہاٹ خیبر کی فوجی یا سیاسی اہمیت تو نہیں رکھتا لیکن اِس کی اپنی حربیاتی افادیت ہے۔ اِس کے ذریعے کوہاٹ سے پشاور ۳۷ میل ہے اور صرف دس میل آزاد علاقے میں ہیں۔ خوشحال گڑھ (جہاں سندھ پر ابھی پل نہیں بنا) سے پشاور تک ریلوے کا فاصلہ ۲۰۰ میل ہے اور سڑک کے راستے مسلح فوج کے لئے ۱۵۰ میل ہے۔ آدم خیل کے دو قبیلے اِس درّہ کے محافظ ہیں اور اِس کے کھُلا رکھنے کے اِنتظامات کتنے بھی وافر کیوں نہ ہوں پھر بھی ہماری مواصلات کا ایک اہم حصّہ ایک قانون شکن اور بے اعتبار قبیلہ کے قبضہ میں ہے جو ماضی کی طرح آئندہ بھی بے شمار مشکلات پیدا کر سکتا ہے اور اگر وہ اسے بند نہ بھی کر سکے تو بھی کسی نازک وقت ہماری کافی فوج کو اُلجھا سکتا ہے جس کی ہمیں کہیں اور اشد ضرورت ہو۔ اس کے تادہ ہمارے سالانہ وظیفہ کے باوجود وہ نہ ہمیں سڑک بنانے دیتا ہے نہ سنگہائے راہ ہٹانے دیتا ہے۔ کاشت کار کہیں کہیں ہل چلاتے ہیں تو چٹانیں راستہ روک لیتی ہیں اور آفریدی اسے ہٹانے کے لئے حکومت سے ایک لاکھ روپیہ اینٹھنے پر دندناتا ہے۔ اصل میں ہماری کارروائی غیر محکمی کی مظہر ہے اور ان کی حرّیت کے تحفظ کے نام پر فیصلہ کُن اقدامات سے گریز کرتی ہے۔ یہ درّہ نہ صرف ہماری فوجوں بلکہ خود آفریدیوں کے لئے اَن گنت مصائب کا ہولناک سرچشمہ ہے اور آدم خیلوں کے ساتھ ہمارے تعلقات

کو کشیدہ رکھتا ہے۔ ۱۸۵۰ء میں گلیوں کے خلاف مہم سے لے کر ۷۸-۱۸۷۷ء میں جواکی علاقہ پر قبضہ تک (جو مکمل قبضہ سے بھی زیادہ ان کے لئے تکلیف دہ تھا) یہ جنجال در جنجال بنا رہا ہے۔ پہیہ دار آمد و رفت کے لئے سڑک کی تعمیر بار بار زیرِ غور آئی اور بار بار ملتوی کر دی گئی۔ ۱۸۷۸ء میں لارڈ لٹن نے کارروائی کے آغاز پر ہی اسے ایک شرط رکھا اور قبضہ کے دوران یہ بن بھی جاتی لیکن پھر اسے 'حریتِ قبیلہ' کے نام پر ترک کر دیا گیا حالانکہ قبیلہ مہم کے دوران نقصانات کو عائد کردہ جرمانہ سے وضع کرنے کی درخواست کر رہا تھا۔ اس وقت ہم آدم خیلوں اور کچھ اورکزئیوں کو ۱۲،۰۰۰ روپے سالانہ درہ الاؤنس دے رہے ہیں جو حقیر سی رقم سہی تاہم ایک غریب قبیلہ کے نیک چلن کے لئے اچھی خاصی ضمانت ہے۔ پچھلی جنگ افغان اور ۱۸۸۳ء میں نمک ٹیکس میں اضافہ کے خلاف احتجاج کے دوران درّہ بند کرنے کی افواہیں تھیں لیکن یہ کامیاب نہ ہو سکیں اور درّہ کبھی بند نہیں ہوا سوائے اس کے کہ ہم نے خود ہی کسی مقامی قبائلی مناقشت کو ختم کرنے کے لئے یا موسم کی خرابی کی وجہ سے بند کیا ہو۔ لیکن آفریدی وعدوں کے باوجود یہ سڑک ابھی تک قدرتی حالت میں ہے۔ وہ نہ خود کچھ کریں گے اور نہ ہمیں اسے نالہ کے پاٹ سے باہر نکالنے دیں گے جس کی وجہ سے پہیہ دار گاڑیاں میلوں تک اس میں نہیں چل سکتیں۔ ان کو مجبور کرنے کی بھی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ مقامی افسروں کے مذاکرات بھی ناکام ہو گئے ہیں کیونکہ قبائلیوں کو پتہ ہے کہ ان کے عقب میں کمزوری اور تذبذب ہے اور ہر ناکامی حالات کو بد سے بدتر کرتی جا رہی ہے۔ آفریدیوں کا تاثر یہ ہے کہ حکومت ان کے معاملات میں دخل نہیں دے

سکتی یا دخل دینے کی جرأت نہیں کر سکتی اور گو وہ وظیفہ وصول کرتے ہیں تاہم ذمہ داری کوئی نہیں نبھاتے۔

یہ بلا پس و پیش کہا جا سکتا ہے کہ آفریدی علاقے کے کسی حصّہ پر قبضہ کرنے میں ہمیں کوئی مالی کشش نظر نہیں آتی لیکن دیگر وجوہات کی بناء پر اسے غیر مقبوضہ نہیں چھوڑا جا سکتا کیونکہ یہ ہمارے علاقے کے وسط میں قریب قریب کنارِ سندھ پر واقع ہے اور پشاور اور کوہاٹ سے حملے کی زد میں ہے بہر حال اِس علاقے پر قبضہ کرنے کے سلسلہ میں اختلاف رائے ممکن ہے لیکن سڑک کی ضرورت پر اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہی اِس پر کہ سرحد پر موجودہ گومگو کی حالت قابلِ تہنیت نہیں ہے۔

بائیسواں باب

ایک آفریدی فساد

خیبر میں داخل ہونے سے پہلے قلعہ جمرود کے بائیں طرف ایک میل سے ذرا زیادہ فاصلے پر الگ تھلگ بروج و عمارات کا ایک حقیر سا جمگھٹا ہے جس کا نام جام ہے اور جو اکا خیل آفریدیوں کا ہے۔ رود پشتو میں دریا کو کہتے ہیں اور یہاں کے دریا کا پتھریلا اور عموماً خشک پاٹ خیبر کی گھاٹی بناتا ہے۔ گاؤں دریا کے پاس ہے، ایک تالاب ہے بے آب لیکن اِس میں ایک شہ نشین ہے جس کے متعلق روایت ہے کہ مشہور مے نوش ایرانی بادشاہ جمشید اِس پر بیٹھا کرتا تھا اور ۷۰۰ سالہ دَورِ حکومت میں (بموجب فردوسی) اس نے نہ جانے شراب کے کتنے جام چڑھائے ہوں گے۔ ایک چھوٹی سی ندی گاؤں کی زمینوں کو سیراب کرتی ہے جس کا تھوڑا سا حصّہ قلعہ کو بھی مِل جاتا ہے۔ اِس کے علاوہ اس میں کوئی خاص بات نہیں۔ گرد و پیش انتہا درجے کے بے رنگ ہیں اور ننگی چٹانیں اور پتھر درجۂ حرارت اِتنا بڑھا سکتے ہیں کہ شاید دوزخ بھی ان کے مقابلے پر ٹھنڈی جگہ معلوم ہو اور لوگوں کے لئے اگر کوئی بنائے فساد ہے تو صرف ندی کا حصّہ ہے اور اہلِ جام کی بھی یہی

رائے ہے۔ اگر وائسرائے کے عملہ کا کوئی آدمی (جو حالیہ دورے پر یہاں سے گذرا تھا) ٹھہرتا اور جام کو دیکھتا تو اس کے ساتھ آفریدی جرائلچی بطور محافظ جاتے اور دو طرفہ دیواروں اور کونوں کھدروں کے عقب کو دیکھتے گویا وہ کسی کو رائفل بدست چھپا ہوا گھیر لینا چاہتے ہوں۔ لیکن وہ محفوظ رہتا کیونکہ اہلِ جام ان دنوں پُرامن ہیں اور اس کے ساتھ جھگڑنے کی وجہ بھی کوئی نہیں۔ لیکن وہ ان دیہاتیوں کی خانگی زندگی کے متعلق عجیب و غریب کوائف دیکھتا اور گو وہ لارڈ ڈفرن کے خطبہ میں مذکور امن و امانِ سرحد (جو اس نے سرداروں کے سامنے دیا) کی تصویر تو یہاں نہ دیکھے گا تاہم وہ ایک مخصوص آفریدی فساد کی عمدہ مثال ضرور پیش کریں گے۔

یہ بہت پُرانا قصّہ تھا، اِتنا پُرانا کہ بنائے آغاز کسی کو معلوم نہ تھی، صرف اتنا پتہ تھا کہ پُشت ہا پُشت تک چلا اور پانی کا مسئلہ پیش پیش تھا۔ اس کی کوئی اٹھارہ اِنچ چوڑی اور نو اِنچ گہری گذرگاہ جام کے بیچ میں سے بل کھاتی ہوئی گذرتی تھی جو تین بکھرے ہوئے پنڈوروں کا مجموعہ تھا۔ چار پانچ سَو گز کے فاصلے سے وہ جام کے شمالی، جنوبی اور مشرقی حصّے سمجھے جا سکتے تھے اور یہ تینوں دائمی طور پر برسرِ پیکار تھے اور صرف کاروبارِ زندگی کے لئے عارضی صلح کر لیتے تھے۔ کوئی تین سال پہلے شمالی نے جنوبی حصّے کا ایک آدمی مار دیا اور مشرقی نے شمالی کا ایک لہٰذا جنوبی اگر مشرقی کا ایک مار دیتا تو معاملہ برابر ہو جاتا۔ پھر گذرگاہ کی مرمت کا سوال آیا تا کہ قلعہ کو پانی دیا جا سکے اور بقایا پانی کی تقسیم نے خلجان پیدا کر دیا۔ تینوں حصّوں نے ندی تک مٹی کا دھس

ڈالنا ضروری سمجھا تاکہ پانی اُس کے نیچے سے حاصل کیا جا سکے۔ امیر خان (مقامی رجمنٹ کا پنشن یافتہ صوبیدار اور شمالی جام کا دشمن خیال قائد) نے باقاعدہ ایک سنگر (پناہ کی خندق) تعمیر کر دیا اور قسم کھائی کہ وہ جنوبی جام کے معتبر، خائستہ خان کی جان لے گا اور ہر صبح رائفل لے کر تاک میں بیٹھ جاتا۔ اُس نے دو جنوبیوں کو مار ڈالا اور پھر بے خبر خائستہ خان کا کولھا بھی دُور مار گولی سے توڑ دیا۔ اب وہ بیساکھیوں پر چلتا پھرتا ہے اور اگر دائرِ اسرائے کا آدمی پشتو سمجھتا تو خائستہ سارے حالات اور بعد کا ردِعمل بھی خوشی خوشی اُسے بتاتا۔ خائستہ کے حلیف ایک اندھیری رات مشرقی جام کے معتبر اکبر خان کے ساتھ گئے اور امیر خان کے سنگر کے پہلو میں ایک خندق کھود لی اور گھات میں رہے۔ صبح کے دھندلکے میں امیر خان نے اپنی رائفل اور پائپ اٹھائے اور اپنی خندق میں بیٹھ کر کسی جنوبی کا انتظار کرنے لگا جو شاید صبح صبح پانی پینے آ جائے اور یُوں اپنے آپ کو زد میں لے آئے۔ اُس نے ابھی پائپ جلایا ہی تھا اور نظریں اپنے ہمسائے کی دیوار پر مرکوز کی ہی تھیں کہ اُس کے اُوپر سے کئی گولیاں دَنادَن گذر گئیں اور خائستہ اپنی رائفل بھی نہ اُٹھا سکا۔ اِس فتح کے بعد خاموشی ہو گئی اور اُس کے بعد قلبہ رانی کا موسم شروع ہو گیا اور اکاخیل شغل کو کاروبار پر کبھی حاوی نہیں ہونے دیتے۔ چھ ماہ کے لئے صلح ہو گئی اور دائرِ اسرائے کی پشاور آمد پر ابھی اِس مدّت کے دو ماہ باقی تھے گو جنگ کی تیاریاں بھی زور شور سے ہو رہی تھیں۔ بدقسمت صوبیدار کا بھائی، امین خان تیراہ سے دو دُور مار توپیں لایا اور دھوکے باز خائستہ خان کی تباہی کے

لئے شمالی جام کے بُرج میں نصب کر دیں۔ خاسُتہ نے بھی اپنی توپ صحن میں لگا دی۔ تینوں حصّوں میں پکے نشانہ باز ہیں جو انگریزی ملازمت میں بھی رہ چکے ہیں اور سب کی دیواریں روزن دار ہیں۔

یہ ایک خاندانی تنازعہ تھا اور ایسی سہولیات دیگر دیہات میں بھی ہیں سڑک کے دوسری طرف چند میل پر قلعہ جمرود سے خیبر کی سمت میں کوکی خیل آفریدیوں کا ایک گاؤں ہے جو اس کے مالک رحمدل خان کے نام پر موسوم ہے۔ اس کا جام سے بالعموم اور شمالی جام سے بالخصوص شدید تنازعہ ہے۔ آخری قسط ایک عورت سے شروع ہوئی۔ رحمدل کے ایک آدمی نے ایک جام عورت کے زیورات اُتار لئے جس پر اس کے عزیز اسے رحمدل لائے کہ تمہارے لوگوں نے اس کے زیورات اُتارے ہیں لہٰذا اسے بھی لے لو کیونکہ ان کے بغیر یہ ہمارے کام کی نہیں اور ان کے انکار کے باوجود وہ اسے چھوڑ کر چلے گئے۔

اہلِ رحم دل بھی اسے نہ رکھنا چاہتے تھے لہٰذا اگلی رات وہ اسے جام کے باہر چھوڑ آئے۔ تیسری رات اہلِ جام اسے دوبارہ وہاں چھوڑ گئے وعلیٰ ہذا القیاس۔ بیچاری عورت دو گاؤں کے درمیان بازیچہ بنی رہی۔ اب طرفین عاجز آ گئے تھے اور گو وہ چند آدمیوں کو مارنا بُرا نہیں سمجھتے تاہم آفریدی عورت پر ہاتھ نہیں اُٹھا سکتا کیونکہ یہ ایک کلنک کا ٹیکہ ہے اور باہمی کشت و خون کا بھی جواز بنتا ہے۔ اس پر رحمدل[1] خان کو خود (وہ اعلیٰ

---

[1] اس قصّہ کے واقعات حرف بحرف صحیح ہیں لیکن رحمدل کا اصلی نام ظاہر نہیں کیا گیا

مرتبے کا مقامی افسر تھا، دو دفعہ برطانوی ملازمت میں تمغے لے چکا تھا اور لندن اور پیرس ہو آیا تھا اور دنیا کو گھوم پھر کر دیکھ چکا تھا) چھ ماہ کی رخصت لے کر اپنے گاؤں کی ویران پہاڑیوں میں آنا پڑا تاکہ معاملہ درست کیا جا سکے۔ اُس میں ابھی تک جوانی کی ترنگ باقی تھی اور گو اُسے کئی اقوام کی ملازمت کا لالچ دیا گیا تاہم وہ اپنے وطن، اپنے آفریدی وطن کو یاد کرتا رہا جہاں اُسے لڑنے جھگڑنے کی آزادی تھی!

تیئسواں باب
خیبر اور خیبری

ہندوستان سے کابل تک مشہور و معروف ترین سڑک خیبر ہے جو سب سے زیادہ افغانستان سے ہندوستان پر ہونیوالے حملوں سے متعلق رہی ہے۔ یہ ماضیہ اور موجودہ، مُغل اور انگریزی مہمات کی آماجگاہ رہی ہے گو ہماری فوج کے مطابق یہ گرمی، ہیضہ، بخار اور مکھیوں کی سرزمین ہے اور انگریز اور مقامی دونو اِسے ماورائے سرحد علاقوں میں سے بہت زیادہ ناپسند کرتے ہیں۔ صدیوں سے وسطِ ایشیا، بخارا اور کابل کی تجارتی شاہراہ ہے اور امیر اور اُس کے محصولات کے باوجود اِس میں سے ہر روز خراسان، ایران، ترکستان بلکہ رُوس کے لئے بھی اُونٹوں کے کاروان چلتے ہیں۔ ایک راستہ جس پر انجینئروں نے رپورٹیں لکھی ہیں، ماہرین نے عمدہ ترین خفیہ یادداشتیں تحریر کی ہیں اور غیر ماہرین نے بھی صفحوں کے صفحے اُس پر سیاہ کئے ہیں (جو محض اُس کی خوبیوں پر ہی دال نہیں ہیں) لہٰذا اُس پر مزید لکھنا تحصیلِ حاصل ہے۔ ویسے بھی ماہرین اُس سے بخوبی مطلع ہیں اور دیگر اپنے مخصوص نظریہ کے برعکس سُننا پسند نہیں کرتے خواہ وہ کتنا ہی قطعی کیوں نہ ہو! بہر حال اِن

نظریات کے اساسی تصوّرات (بالخصوص انگلستانی قارئین کے لئے) اکثر و بیشتر مغالطوں پر مبنی ہیں جو اکثر ہندوستانی اشیائے کے متعلق ہوتے رہتے ہیں ۔ یہ صرف سیر بینوں کی ہی بات نہیں جو جمرود اور جگدالک میں تمیز نہیں کر سکتے، جو سائنسی سرحد کو دیوارِ چین کی طرح سنگ و خشت کی دفاعی دیوار سمجھتے ہیں اور جو علی مسجد یا لنڈی خانہ جاکر اور وہاں کچھ نہ پاکر واپس آتے ہیں اور ایک اور ٹوری، دھوکہ کو بے نقاب کرتے ہیں بلکہ باخبر طبقے بھی ایسی ہی حرکتیں کرتے ہیں جنہوں نے بڑے پیمانے کے نقشے دیکھے ہیں اور پھر بھی "خوفناک خیبر" کو ۱۸۴۲ء اور اس کے بعد کے المیوں سے مربوط کرتے ہیں ۔ یہ ۲۰۰ میل سے زیادہ پر پھیلے ہوئے سب قبائل کو خیبری گردانتے ہیں، یہ سمجھتے ہیں کہ کامیابی اسی قوم (اور فرد) کے پاؤں چومتی ہے جو انتظار کرنا جانتے ہیں اور جو صرف آنا جانتے ہیں کہ روسی فوج خیبر درّہ میں آجائے تو اس کے دو طرفہ ناکے بند کئے جا سکتے ہیں یا میکالے کے رومیوں کی طرح (جو ماضی میں پل کی ایسے ہی حفاظت کرتے تھے) درّہ کے دہانے پر مورچہ بنایا جائے اور جیسے جیسے روسی باہر نکلتے رہیں ویسے ویسے اُن کا قصہ پاک ہوتا رہے۔

ہمیں تو اس میں بھی شبہ ہے کہ آیا اس طویل اور صبر آزما پالیسی کے علمبردار یہ بھی جانتے ہیں کہ نہیں کہ کابل اور پشاور کے درمیان تین متوازی راستے ہیں، تینوں قابلِ عبور اور تینوں کے جنوبی بازو کوہِ سفید کی محافظت میں !

پہلا راستہ خورد کابل درّہ، تزین وادی، ہیشں بولک اور بازار وادی کا ہے۔ دوسرا ثبت خاک، لٹابند درّہ، جگدالک، گنڈمک، جلال آباد، ڈھاکا

اور خیبر کا ہے اور یہ دونوں راستے جمرود کے قریب نکلتے ہیں۔ تیسرا لٹا بند، لغمان، جلال آباد، ڈھاکا، شلمان وادی اور تارتارا پہاڑی کا ہے جو شگئی کے قریب نکلتا ہے۔ اس میں شلمان وادی سے شالوتین کے مقام پر دریائے کابل پار کر کے قلعہ مشنی بھی نکل آتے ہیں اور چھند پہاڑیوں میں دوسرے راستے بھی ہیں جو ڈھلوان اور سنگلاخ ہونے کے باوجود ناقابل عبور نہیں ہیں۔ آفریدیوں اور شنواریوں نے نادر شاہ کے لئے درہ بند کر دیا تو اورکزئی اسے ایک اور راستے سے تیراہ لے گئے۔ جلال آباد پر کابل جائے بغیر بھی چترال سے کنار کے راستے پیش قدمی ہو سکتی ہے اور چترال پہنچنے کے لیے شمال اور جنوب دونوں سے متعدد مشہور و معروف راستے ہیں۔ مزید برآں بدخشاں سے براستہ کافرستان بھی کئی راستے ہیں جن سے شمالی بازو پر کارروائی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا یہ فرض کر لینا کہ بحران کے وقت پشاور میں بیٹھے رہنا اور بادلوں کے گذرنے کا انتظار کرنا شتر مرغ کا وطیرہ ہے جو اپنا سر ریت میں چھپا کر اپنے کو محفوظ سمجھ لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک غلط جگہ پر انتظار کرنا صریح غلطی ہوگی۔

اصل خیبر گھاٹی کے راستے کو دو کنگھوں کے درمیانی راستے سے تشبیہہ دی گئی ہے جس کے دندانے اندر کی طرف ہوں، دندانے جو دو رویہ سلسلوں کی شاخوں کے مترادف ہیں اور جو دو چھوٹی چھوٹی، علی الترتیب کابل اور پشاور کی طرف بہتی ہوئی ندیوں کی وجہ سے ایک دوسرے میں گڈمڈ نہیں ہو سکتیں اور جن کے کنکریلے پاٹ ہی واحد راستہ ہیں۔ اگر ان

کنگھوں کو خستہ و شکستہ سمجھ لیا جائے تو مقابلہ اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔ سالم دندانے ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں تو گویا گھاٹی کی چوڑائی بنتے ہیں اور ان کے درمیانی وقفے شمالی اور جنوبی پہاڑیوں کا نکاس ہیں اور ادھر اُدھر کا بڑا خلا ایک چھوٹی سی وادی بن جاتا ہے جہاں کوئی گاؤں ہے یا آفریدی یا ملاگوری علاقہ کو جانیوالی قابلِ عبور سڑک ہے۔ دوسری جگہوں پر یہ شاخیں اتنی ڈھلوان اور عمودی ہیں کہ وہ درّے کی کسی طرف سے عبور نہیں ہو سکتیں۔ یوں جمرود سے کوئی تین میل قدم پر (جو اصلی دروازہ ہے) پہاڑیاں ایک دوسرے کے قریب آتی ہیں اور درّہ بھی صرف ۴۵۰ فٹ چوڑا ہے اور تھوڑا آگے ۲۵۰ فٹ رہ جاتا ہے۔ پھر چند دندانے ٹوٹے ہوئے ہیں اور علی مسجد اور چشمے کے پاس یہ صرف چالیس فٹ رہ جاتا ہے جس کے دونو طرف ۱۲۰۰ فٹ بلند سلیٹی عمودی چٹانیں ایستادہ ہیں اور مسجد کا ہمنام قلعہ ایک الگ تھلگ پہاڑی کے اوپر واقع ہے اور سڑک پر حاوی ہے۔ چھ سات میل آگے لنڈی کوتل وادی ڈیڑھ میل چوڑی ہو جاتی ہے اور تھوڑا آگے جا کر عمودی چٹانی دیواروں کے درمیان صرف دس فٹ چوڑی رہ جاتی ہے۔ لنڈی خانہ درہ یا کوتل کے اوپر (جو سڑک کا مشکل ترین حصہ ہے) یہ ڈھلوان چڑھائی سے چٹانوں کے درمیان اٹھتی ہے جو ۱۵۰ فٹ ایک دوسرے سے دور ہیں اور پھر نیچے اترتی ہے حتیٰ کہ ڈھاکا پر وادیٔ کابل (دریا) آ جاتی ہے۔ کنگھے کا تیس میل سے زیادہ فاصلہ مضبوط گرفت میں بہت سے جانداروں کا راستہ روک سکتا ہے۔

لیکن خیبر گھاٹی اس راستہ پر کئی رکاوٹوں میں سے صرف ایک ہے۔ اور بھی کئی کنگھے ہیں گو ان کے دندانے دُور دُور ہیں اور جن کے درمیان چھوٹے چھوٹے میدانوں کے سلسلے ہیں جو عموماً بنجر اور پتھریلے ہیں گو اس کے باوجود یہاں کافی کاشت ہوتی ہے اور "ہفت چاہی" "ہزار ناؤ" اور دیگر جگہوں (جو کھیتوں اور باغات پر موسوم ہیں) سے ثابت ہوتا ہے کہ لوگ انہیں خوشگوار چیزوں سے منسوب کرتے ہیں۔ پشاور سے نوّے میل دُور، جلال آباد میں پہاڑیوں کے متقاطع سلسلے ایک سیراب و شاداب زرخیز علاقے کا رُوپ دھار لیتے ہیں جو بیسیوں میل لمبا اور دَرجنوں میل چوڑا ہے اور اس میں بروج و دیہات و اشجار کا جال بچھا ہوا ہے۔ یہاں دریائے کابل (جسے محض دراڑوں سے گذرنا پڑتا ہے) بھی ۔۔ اگر چوڑی صاف ندی بن جاتا ہے۔ اس کے بعد راستہ پھر غیر دلکش خطے میں آ جاتا ہے، لمبی پتھریلی گھاٹیاں، چٹانی دریائی پاٹ، کہیں کہیں فتح آباد جیسی حسین وادی یا نِملہ جیسا نخلستان، حتےٰ کہ گندمک آتا ہے جو ماورا علاقے کے مقابلے پر شیر و شہد کی سرزمین معلوم ہوتا ہے۔ جگدالک اور لتانیہ درّے یا تزین اور خورد کابل سے آگے بیکار ننگی پہاڑیاں ہیں جو بلند تر اور کریہہ المنظر پہاڑوں میں محصور ہیں۔ دندانے ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں، سڑک تنگ تر ہو جاتی ہے، گھاٹیاں دریائی پاٹوں سے سات آٹھ ہزار فٹ اونچی ہو جاتی ہیں، گہری یا تنگ وادیاں، جان لیوا جگدالک کی مانند، بے آب و گیاہ، جن میں سردی کے سُورج کی کرنیں بھی نہیں جھانک سکتیں؛ کابل کے

باغات، قلعوں اور بازاروں تک پہنچنے کے لئے ان بیرونی فصیلوں اور رکاوٹوں کو پار کرنا پڑتا ہے!

درہ خیبر کا بیان (جو ہماری پشاور سرحد سے کابل تک کوئی ۱۷۰ میل ہے) قدرتی طور پر دہشتناک معلوم ہوتا ہے لیکن اپنی مشکلات کے باوجود اس سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ افغانستان میں کارروائی کے دوران ہمارے انجینئروں نے سڑک کو کافی بہتر بنا دیا تھا اور کابل تک ریلوے کی تعمیر کی امکانیت پوری طرح قائم ہو گئی تھی۔ ایسی لائن قندھار کی سمت میں پیش آئند مشکلات یا خرچ کی حامل نہ ہو گی اور اس کی اہمیت اسی کے برابر ہو گی۔ اگر یہ ذہن میں رکھا جائے کہ ہمیں مواصلات کو محفوظ رکھنے کے لئے رسل و رسائل پر کتنا خرچ کرنا پڑا، ۱۵,۰۰۰ جوانوں کو وہاں لے جانے کے لئے کتنی چوکیاں اور قلعے اور خورونوش کے گودام بنانے پڑے اور یہ پوری طرح سمجھ لیا جائے کہ کابل پر بیرونی قبضہ کے ہندوستان پر کیا اثرات مرتب ہوں گے تو پھر ریلوے کو اشد ضروری سمجھنا مشکل نہ رہے گا۔ یہ مسئلہ اتنا اہم ہے کہ علیحدہ غور و خوض کا متقاضی ہے۔ ہندوستان کے بیرونی دفاع کی حیثیت سے خیبر اگر سائنسی محافظین کی گرفت میں ہو تو یہ قلعۂ جبرالٹر کی طرح ناقابلِ تسخیر ہو سکتا ہے لیکن یہ ہماری گرفت میں نہیں ہے اور جب تک ایسا نہ ہو اس کا دفاع اتنا آسان نہیں جتنا اکثر سمجھ لیا جاتا ہے۔

اس راستے پر جو قبائل ہیں وہ کابل سے تزین، جگدالک اور گنڈمک بلکہ جلال آباد تک غلزئی، باجر خیل، جبار خیل اور دیگر ہیں جو ما قتور سلیمان خیل

کے حصے ہیں۔ یہ بدنام ڈاکو ہیں اور کابل سے پسپائی کے دوران اُنہوں نے سیل کی غیر منظم فوج اور اُس کے نہتے خدمتگار دستوں پر مسلسل اور بے رحمانہ حملے کئے۔ انہوں نے پولک کی انتقامی فوج کو بھی بحد تنگ کیا اور وہ ہر حملہ آور کے کٹر دشمن رہے ہیں لیکن اگر وہ قابو میں ہوں تو مفید ترین اتحادی بن سکتے ہیں۔ جبار خیل کا بانی مبانی جبار اپنے وقت کا اہم انسان تھا۔ وہ بہت سے غلزئی اداروں کا بھی بانی ہے اور اب خورد کابل اور ہفت کوتل کے درمیان ایک برفیلی اور ویران جگہ پر مدفون ہے جو اَب بھی ڈاکوؤں اور بھیڑیوں کی پناہ گاہ ہے اور کابلی بھی اسے کلمۂ بدی سمجھتے ہیں۔ جلال آباد کے مقابل اور سفید کوہ کی شمالی ڈھلان کے اُوپر ایک چوڑی پٹی خوگیانیوں کے قبضہ میں ہے جو سلسلہ کی دوسری طرف کے جاجیوں اور توریوں سے متعلق ہیں بلکہ کسی وقت موخر الذکر دونو انہی کا حصّہ تھے۔ یہ سب بمعہ خوستوال غالباً ترک تھے جو چنگیز اُور تیمور کے ساتھ آئے تھے اور طویل جُدائی کی وجہ سے الگ الگ قبائل بن گئے۔ خوگیانیوں کے ....۵ گھرانے ہیں اور مرد جیدار اور جنگجو ہیں اور ہمیشہ والیانِ جلال آباد کے پہلو کا کانٹا بنے رہے ہیں لیکن زیادہ تر کاشت کار اور چرواہے ہیں جو شاذ و نادر ہی گھر سے نکلتے ہیں۔ ان کی سنگلاخ ڈھلانیں تین ماہ تک زیر برف رہنے کے باوجود مناسب موسم پر بکثرت عمدہ پھل پیدا کرتی ہیں۔ دورِ جہانگیری میں ایک معمولی سی بات پر دو حصّوں میں لڑائی ہو گئی جس میں ایک ہزار آدمی کام آئے اور اس کا خاتمہ اسی وقت ہُوا جب دونو نے امیر کابل کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور مستقلاً اس کی رعایا بن گئے۔

ان کے مشرق میں سفید کوہ کی پوری شمالی ڈھلان ننگرہار کہلاتی ہے جو بعض علمائے کے مطابق "ننگ نہر" (نو نہریں) سے ماخوذ ہے، ایک ناشپاتی نما علاقہ گھاٹی کی چوٹی اور کابل رود کے درمیان، جس کا قاعدہ جلال آباد کے قریب ہے اور ڈنٹھل لنڈی کوتل کے قریب جو دس تا بارہ ہزار متحاربین کے طاقتور قبیلہ، شنواری کے قبضہ میں ہے۔ یہ اپنے ہمسایوں کی طرح فارنگو نہیں ہیں اور برائے نام چاول اور پھلوں (انجیر و بادام) کی کاشت کرتے ہیں اور ریشم اور اون برآمد کرتے ہیں لیکن ان کا مرغوب پیشہ ہمیشہ لوٹ کھسوٹ رہا ہے۔ انہوں نے ۱۸۴۱ء میں پیش بولک پر ہماری فوجوں پر حملہ کیا اور ۱۸۴۲ء کے المیہ کے بعد وہ کافی کچھ لوٹ کر لے گئے (اور مونٹیتھ نے بعدہٗ انہیں خوب سزا دی) اور افغانستان میں ہماری بعد کی مہمات میں انہوں نے ہماری آمد و رفت میں بار بار خلل ڈالا اور کئی تادیبی مہمات بھیجنا پڑیں۔ انہیں امیر کابل کی ملوکات کا بھی لحاظ نہیں ہوتا خاص طور پر اگر یہ زیر حفاظت نہ ہوں۔ چار قبیلوں میں سے بدترین، سنگو خیل ہیں، پست قد، گٹھے ہوئے آدمی، خوفناک اور اندھادھند ہمت کے مالک، بدنام ترین لوگ جو زہرناک آلات کی گولیوں کی طرح سنگباری کے بھی ماہر ہیں۔ دوسری طرف علی شیرزئی ہیں جو لنڈی کوتل کے گرد اگرد لوڑگر وادی میں مقیم ہیں اور لوڑگری شنواری کہلاتے ہیں، پشاور اور کابل کے درمیان تجارتی سامان لاتے اور لے جاتے ہیں اور بیحد خوش رویہ اور بے ضرر لوگ ہیں۔

شمال کی طرف جلال آباد سے دریائے کابل کے ساتھ ساتھ چلی

طرف اور اُس کے دائیں کنارے کی زمین پر مشتمل ہماری سرحد تک اور لالپورہ کے مشرق کی وادیوں اور پہاڑیوں کے جال سمیت سارا علاقہ مہمندوں کے مختلف قبائل کے قبضہ میں ہے جن کا جلد ہی ذکر کیا جائے گا۔ دریائے کابل اور جمرود کے درمیان اور مغرب میں شلمان وادی سے لے کر مشرق میں ہماری سرحد تک کے مختصر کونے میں ملّا گوری آباد ہیں۔ وہ ابتدائی آبادکار تھے لیکن مہمندوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُنہیں دبا لیا اور اب وہ نہ اِللّذی ہیں نہ اُللّذی ہیں۔ نہ مہمند، نہ آفریدی اور نہ ہی شنواری اُنہیں اپنانے کے لئے تیار ہیں اور موخرالذکر کہتے ہیں کہ وہ گورستان میں ملنے والے ایک ناجائز بچے کی اولاد ہیں جس نے بڑا ہو کر کچھ پڑھ لیا اور اسی سے ان کا نام ماخوذ ہے۔ شنواری ان سے نفرت کرتے ہیں تو آفریدیوں سے ان کا دائمی بَیر ہے اور وہ صرف مہمندوں کی تھوڑی سی پُشت پناہی پر ان سے بچے ہوئے ہیں۔ سارا قبیلہ اِنتہائی غریب ہے۔ وہ کھجی کے بنے ہوئے رسے، چٹائیاں اور سینڈل بیچتے ہیں لیکن یہ صرف پشاور چھاؤنیوں کو لوٹنے کا بہانہ ہوتا ہے۔ عددی لحاظ سے وہ غیر اہم ہیں اور ان کے متحاربین بمشکل ..۸ ہیں لیکن وہ تار تارا پہاڑ کے مالک ہونے کی وجہ سے اہم ہو جاتے ہیں جو قریباً ...۷ فٹ بلند ہے، ایک عمدہ سینی ٹوریم بن سکتا ہے اور حربیاتی لحاظ سے تار تارا، آبخانہ اور خیبر کے دروازوں پر حاوی ہے، لالپورہ اور شنواریوں کو روکنے کے لئے مفید ہے اور کوکی خیل آفریدیوں اور خود ملّا گوریوں پر قدرت عطا کرتا ہے۔ ملّا گوریوں سے سیاسی افسروں کی واقفیت کسی حد

تک مفید ہے اور وہ وہاں پر قائم ہونے والی چھاؤنی میں بھی چٹائیاں بیچنے کو فائدہ مند سمجھ سکتے ہیں۔

قریباً پوری کی پوری خیبر گھاٹی نصف درجن آفریدی قبیلوں کے تصرّف میں ہے (جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) جو خیبر آفریدی کہلاتے ہیں۔ ان میں سے مؤثر ترین زخاخیل ہیں گو کوکی، ملک دین اور قمبر خیل بھی طاقتور قبیلے ہیں۔ یہ خوش وضع اور کیل کانٹے سے لیس ہیں (انگریزی یا کابلی رائفلوں سے) اور ہمارے ہاں اچھے سپاہی ثابت ہوتے ہیں۔ ہماری ابتدائی افغان مہمات میں وہ حسبِ معمول نڈر اور دغاباز ڈاکو ثابت ہوئے ہیں لیکن الحاقِ پنجاب سے دوسری جنگِ افغانستان تک اُن کا رویہ مجموعی طور پر تسلی بخش رہا۔ وہ موقعہ ملنے پر لوٹ مار کے لئے حملے ضرور بولتے رہے اور گو ان کے خلاف قبیلہ وار چھوٹی چھوٹی مہمات بھی بھیجنا پڑیں تاہم وہ مہمندوں یا یوسفزئیوں کے برعکس ہمارے خلاف مہیب قبائلی محاذ یا باقاعدہ دوبدو جنگ کا منظر پیش نہیں کر سکے جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ آفریدی دستور کے مطابق پرلے درجے کے انفرادیت پسند ہیں اور یہ بھی کہ ان میں سے کافی مردی میں پشاور پر دار و مدار رکھتے ہیں۔ ۱۸۷۸ء میں کچھ نے ہمارا ساتھ دیا اور کچھ امیر کے آلۂ کار بنے رہے لہٰذا بازار وادی میں کئی مہمات روانہ کرنا پڑیں جو مذکورہ راستوں کا متبادل ہے اور پشاور سے کم سروکار رکھتا ہے۔

معاہدۂ گنڈمک کے مطابق خیبر اور مچنی دروں اور ان سے وابستہ قبائل کے ساتھ روابط پر برطانوی حکومت نے اپنا تسلط برقرار رکھا اور ہماری

فوجوں کی واپسی پر باقاعدہ گفت وشنید ہوئی ۔ تمام خیبر قبائل کا ایک جرگہ پشاور میں بلایا گیا اور فروری ۱۸۸۱ء میں انہوں نے ایک معاہدہ پر اپنی مہریں ثبت کیں جس کے تحت اُن کی آزادی تسلیم کر لی گئی بشرطیکہ وہ اپنے سیاسی تعلقات خالصتاً اور کاملاً ہمارے ساتھ رکھیں گے ۔ قبائل درّے کی حفاظت کے لئے جزائلچیوں (بے قاعدہ رائفلمین) کی ایک کور مہیا کرنے کا وعدہ کیا جس کے اخراجات ہماری حکومت برداشت کرے گی اور وہ ہمارے سیاسی حکام کے تحت ہونگے ۔ قبائل برطانوی علاقوں پر حملوں سے مکمل اجتناب کریں گے اور بعض حکومتی وظائف کے بدلے خیبر میں امن وامان کے لئے اجتماعی ذمہ داری قبول کریں گے اور حکومت درّے سے گذرنے والے تمام کاروانوں سے چُنگی وغیرہ وصول کرے گی ۔ وظائف پھر آفریدی قبائل میں متناسب طور پر تقسیم کر دیئے گئے اور تھوڑی سی رقم لورگئی شنواریوں کو بھی دی گئی ۔ ان کی مجموعی رقم مشمولہ وظائف معتبرین اسّی اور نوّے ہزار روپے سالانہ کے درمیان ہے اور چنگی وغیرہ ان کی تین چوتھائی ہے اور یوں معاہدہ نفع بخش بھی ہے اور کارآمد بھی ۔ بعض شوریدہ سروں نے کچھ مسائل بھی پیدا کئے ۔ بعض زخاخیلوں نے ایک موقعہ پر کاروان کو لوٹنا چاہا لیکن جزائلچیوں نے انہیں فوراً روک دیا اور ان کے بعض آدمی مار دیئے ـــ
رسوائے زمانہ کمالخاں نے بعض مقامی تشدد کی کارروائیاں کیں لیکن مجموعی طور پر قبائل معاہدہ پر پورے اُترے ہیں ۔ مقررہ دنوں پر بدرقہ مسافروں اور کاروانوں کو جمرود میں اپنی حفاظت میں لیتا ہے اور لنڈی خانہ میں انہیں امیر کے آدمیوں کے سپرد کرتا ہے اور عازم پشاور قافلوں کو اپنی تحویل میں لیتا ہے اور موقعہ شناس

سیاسی افسر (جو اس کامیابی کا باعث ہے) اکثر رپورٹ کرتا ہے کہ اَب خیبر جرنیلی سڑک کی طرح محفوظ ہے۔

لنڈی خانہ سے پَرے تاجر محفوظ رہ سکتے ہیں لیکن انہیں شکایت ہے کہ امیر کے محصولات شنواریوں اور غلزئیوں سے زیادہ ہیں اور روس نے بخارا و سمرقند کی برآمدات پر اتنے بھاری ٹیکس لگا دیئے ہیں کہ خیبر اور ہندوکش کی بجائے بمبئی اور ماسکو سے تجاوت ارزاں پڑتی ہے۔ ممکن ہے یہ سراسر صحیح نہ ہو اور اُمید تھی کہ امیر عبدالرحمٰن اِستحکام کے بعد تجارت کو بڑھائے گا لیکن ۱۸۷۸-۸۰ء کی جنگ کے بعد عارضی اضافہ کے بعد توسیع روک دی گئی اور تجارت سُست پڑ گئی۔ ۱۸۸۷ء اور ۱۸۸۹ء کے درمیان مغربی سرحد کی درآمد برآمد ۱۲۱ لاکھ روپے سالانہ سے ۹۵ لاکھ پر آگئی اور اضافہ صرف قندھار کی طرف ریلوے کی توسیع کے تصدّق ہُوا اور اس نے کسی حد تک خیبری سمت کا خسارہ پورا کیا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ خیبر سے کابل تک امیر کے محصولات ۲۱ روپے فی شتر ہیں اور کئی جگہوں پر مزید محصولات لئے جاتے ہیں بشرطیکہ سفر دریائے جیحوں تک جاری رہے۔ براستہ غزنی تھانوں کے ایک اونٹ پر ۲۶ روپے بطور جرمانہ اور ہر چالیس تھانوں میں سے ایک تھان وصُول کیا جاتا ہے۔ لہٰذا سرحدی تاجر بزبان (سجاد حیدر یلدرم) کہہ سکتا ہے کہ "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ۔ (میں اپنے دشمنوں سے خود ہی نپٹ لُوں گا)"۔

چوبیسواں باب

کابل کا محلِّ وقوع

متنازعہ فیہ حربیاتی مسائل کی گہرائیوں میں اُترے بغیر یہ آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر کبھی شمال مغرب سے ہندوستان پر حملہ کی کوشش کی جائے تو ہر متحارب فوج کا ایک اوّلین مقصد کابل پر قبضہ ہوگا۔ پنج شیر، غوربند اور لغمان وادیوں کی عظیم مثلث جو بعض اہم ترین درّوں کے ذریعے ہندوکش سے ترکستان اور جیحوں اور کوہ بابا کے اوپر سے بامیان اور بلخ اور یونائی درّہ کے ذریعے ہلمند اور گرشک پر قادر ہے، غالباً پورے افغانستان میں قدرتی طور پر محکم ترین حصّہ ہے۔ شہر بجائے خود ملک کا تاریخی دارالخلافہ رہا ہے اور مشہور کہاوت ہے کہ کابل کا آقا افغانستان کا آقا ہے۔ اسی طرح درّہ خیبر بھی ہندوستان پر کامیاب ترین پیش قدمیوں کا راستہ رہا ہے لہٰذا آئندہ مہم میں کابل کا جو بھی حشر ہو، جب توپیں خیبر کی چوٹی سے باتیں کریں گی یہ امیر عبدالرحمٰن کے زیرِ تسلّط واحد شہر ہوگا جو جارحیت یا مدافعت کے لیے اہم ترین ہوگا اور اس میں اس کے وقار کا بھی دخل ہوگا۔

روس نے اس کی اہمیت مدّتوں پہلے تسلیم کر لی ہے اور کم از کم مسئلہ

پنج دیہہ سے یہ نتیجہ بہ آسانی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ افغانستان یا ہندوستان کے خلاف کسی نقل وحرکت میں روس کا نصب العین قندھار کی بجائے کابل ہوگا۔

اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ روس نے ریلوے کی توسیع سے کاکیشیا میں اپنی افواج کو خاص وسط ایشیا کی افواج سے ملادیا ہے اور وہ اپنی فوجیں قزل اروَت اور سمرقند کے درمیان کہیں بھی مرکوز کرسکتا ہے اور سرخس تک بھی ایک ریلوے لائن تیار کرلی ہے تو بھی موخر الذکر جگہ ہرات سے ۲۰۰ میل سے زیادہ دُور ہے۔ ہرات قندھار سے ۳۷۰ میل اور قندھار ہماری چمن کی چوکی سے ۷۰ میل دور ہے گویا کُل فاصلہ ۶۴۰ میل ہے۔ اِس خطِ پیش قدمی کے راستے میں بعض جنگجو ترین اور آزاد ترین افغان قبائل آباد ہیں، اِس میں رسد کی کمی ہے اور ایران، بلوچستان اور کابل سے اِس کے بازوؤں پر حملے ہوسکتے ہیں۔ اِس راستے سے آنیوالی فوج کو یہ بھی ذہن میں رکھنا ہوگا کہ اِس کے سرے پر ایک ناقابلِ تسخیر مقام میں ایک طاقتور فوج کا مقابلہ درپیش ہوگا۔ اِس کے برعکس سمرقند کے قریب جام کے صدر کیمپ سے جیحون پر واقع کِلف بخارا کی خانیوں سے صرف ۲۲۰ میل ہے جو نیم آزاد ہونے کے باوجود حملہ کے نقطۂ نظر سے عملاً رُوسی تسلط میں ہیں۔ کِلف کو صدر کیمپ بنا کر براستہ مزار شریف اور دولی شان یا باجگاہ اور یونائی درّہ سے کابل تک ۴۶۰ میل کا فاصلہ ہے اور کابل سے پشاور اور ہندوستان تک صرف ۱۷۰ میل کا بُعد ہے۔

اِس ضمن میں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ سمرقند سے کِلف تک ریلوے لائن کا سروے ہو رہا ہے اور جیحون کے بائیں کنارے کے ساتھ ساتھ چارجوئی سے کرکی تک

ریلوے لائن بچھائی جا رہی ہے، لہٰذا اس راستے سے پیش قدمی وادیٔ جیحوں کے اڈّوں سے ایسے علاقوں سے ہوگی جہاں رسد کافی ہے اور زرافشاں اور فرغانہ کی زرخیز وادیوں سے مزید وافر کیا جا سکتا ہے۔ باربرداری بخارا، خوقند اور ماوراء النہر سے بآسانی ہو سکتی ہے اور مزار شریف کو ایک کامیاب معرکے سے محفوظ کر لیا جائے تو پھر بغلی حملے کا خطرہ نہیں رہتا اور ہرات اور افغان ترکستان کو ایک ہی دفعہ لپیٹ میں لیا جا سکتا ہے۔ قندھار کی نسبت کابل کے راستے پر طبعی مشکلات زیادہ ہیں لیکن روسی اڈّے سے فاصلہ کم ہے اور اس کی افغان مدافعت کا انحصار ہندوستان سے ملنے والی امداد پر ہوگا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کابل پر ناگہانی حملے سے قبضہ نہیں کیا جا سکتا۔ افغان سرحد پر روسی نقل و حرکت کے متعلق مسلّمہ طور پر ہمارے ناقص نظام مخبری کے باوجود کابل کی طرف اُن کی کسی مؤثر پیش قدمی کا ضرور پتہ چل سکتا ہے اور ہم امیر کو بروقت امداد دے سکتے ہیں۔ امداد کی درخواست میں البتہ تاخیر ہو سکتی ہے اور افغان قوتِ مدافعت ہندوکش کی قدرتی رکاوٹوں کے ساتھ مل کر عبدالرحمٰن کو کچھ عرصہ کے لئے شمالی درّوں کو بچانے میں کامیاب کر سکتی ہے لیکن اگر خیبر کے مواصلات بہتر نہ کئے جائیں تو ہم شاید ہی اسے افغان ترکستان اور وراءِ جیحوں علاقوں کو بچانے میں مؤثر مدد دے سکیں۔

لیکن یہ سب مفروضات کا تانا بانا ہے۔ اگر باہمی اختلافات یا کاہلی یا محتاط غیر جانبداری ماضی کی غلطیوں کا اعادہ کرا دے اور پنجدہ کی طرح روسی ہرات پر قبضہ کر لیں اور انگلستان ایک گولی بھی نہ چلا سکے تو نہیں کہا جا سکتا کہ

زبت کہاں تک پہنچے۔ اِس کے بعد بلخ اور افغان ترکستان کا الحاق قدرتی ہوگا
کہا جاتا ہے کہ وادی ہری رود سے دولت یار اور چہل برج تک ایک خراب
سی سڑک موجود ہے اور چہل برج کابل سے صرف ۲۹۸ میل ہے۔ اگر یہ
سڑک ہر شعبۂ فوج کے لئے کارآمد ہو جائے اور ہرات اور مزار شریف کے
درمیان مواصلات بہتر ہو جائیں تو ہندو کش کی مطلوبہ سرحد قبضے میں آسکتی
ہے۔ اُس وقت تک رُوس اپنی ریلوے کی توسیع جنوب کی طرف کر چکا
ہوگا اور کابل اُس کی زد میں آجائے گا۔ اُس وقت ہندوستان اور کابل کے
درمیان ریلوے کا رابطہ اشد ضروری ہوگا لیکن اِس میں تاخیر ہو چکی ہوگی اور
اُس مرحلے میں کابل پر ہمارا قبضہ بہر کیف ضروری ہوگا خواہ افغانستان کے
اتحادی کی صورت سے اور خواہ دشمن کی حیثیت میں۔ اِس پر قبضہ کا مطلب ہوگا
۵۰۰۰۰ متحاربین کا ہمارے حق میں یا ہمارے خلاف ہونا۔ مزید برآں کابل
پر دشمن کے قبضہ سے ہندوستان بھر میں ہمارے وقار کو دھچکا لگے گا اور نہ
صرف افغان قابض طاقت کے اتحادی ہو جائیں گے بلکہ اُن کے اور ہندوستان کے
درمیان کے قبائل (بلکہ شاید اندرونِ سرحد کے بھی) بھی اُن سے مل جائیں گے،
اُس طرف جارحانہ اقدام کے لئے ہماری قوت صفر ہو جائے گی اور ہم صرف
مدافعت کے اہل رہ جائیں گے اور اگلی چال کا انتظار ہی کر سکیں گے۔

اب تصویر کا دوسرا رُخ دیکھیں۔ مدافعت کے مواقع غیر معمولی ہیں،
ملک کے وسائل قدرتی طور پر کافی ہیں۔ کابل کے اِرد گرد کی وادیاں بہترین رسد
فراہم کرنے کی اہل ہیں۔ ضلع جلال آباد میں بھی ایسی سہولیات ہیں اور اگر موخرالذکر

تک بھی ریلوے کی توسیع ہو جائے تو شمالی پنجاب کے بہترین حصّوں سے گھاس، چارہ، نفری اور ہر قسم کی رسد مل سکتی ہے بلکہ کابل میں ۵۰۰۰۰ جوان بخوبی رکھے جا سکتے ہیں جبکہ قندھار میں اِس سے صرف نصف کی سمائی ہو سکتی ہے۔ خیبر سے جلال آباد اور بالآخر کابل تک ریلوے لائن کا بھرپور جواز ہے اور اِس کی اہمیت بہتر طور پر وہی سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے اِس مسئلہ پر مغز سوزی کی ہے۔

اخراجات اور انجنیئرنگ کے مسائل غیر معمولی طور پر کٹھن نہیں ہوں گے۔ پشاور کے مغرب میں پہاڑیوں کے بیچ میں سے تین نہیں تو کم از کم دو قابل راستے ضرور ہیں (۱) جمرود سے (جہاں سے ایک ریلوے لائن منظور بلکہ شروع بھی ہو گئی تھی) خیبر کی ڈھلوان چٹانوں کے بیچ میں سے اور کہیں کہیں چٹانوں کے آگے نکلے ہوئے حصّوں کو کاٹ چھانٹ کر یا لنڈی کوتل یا درّہ میں ٹنل نکال کر لنڈی خانہ تک۔ (۲) پشاور شاہ گئی کے میدانوں کے ذریعے کبائیلہ کے فراز اور مُرداوان کے پاس سے ملاگوری علاقہ کے بیچ میں سے اور جزیری درہ اور سیمول کے پاس تارتارا چوٹی کی اطراف کے ساتھ ساتھ یا لیعقوبی سے دریائے کابل کے ساتھ ساتھ شلمان وادی تک جہاں سے لورگئی میدان سے لنڈی خانہ بھی جا سکتے ہیں۔ موخر الذکر میں کچھ لمبائی تک ڈھلان کی مقدار ۱/۲۵ اور کہیں کہیں ۱/۳۲ ہے اور تین سے چار ہزار گز تک ٹنل بھی بنانا ہو گی اور یہ کُل فاصلہ پشاور سے قریباً چالیس میل ہو گا (۳) ایک تیسرا اور شاید بہتر متبادل راستہ قلعہ مچنی (پشاور کے شمال میں ہماری چوکی) سے دریائے کابل کے ساتھ ساتھ

ڈھاکا کا ہے جو کم و بیش ۴۵ میل ہوگا اور مچنی اور ڈھاکا کے درمیان سطح کا فرق ۳۰۰ فٹ سے زیادہ ہوگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دریا کہیں کہیں بہت تنگ گھاٹیوں میں بہتا ہے جو ساٹھ یا اسّی فٹ سے زیادہ چوڑی نہیں ہیں اور اطراف عموماً ڈھلوان ہیں اور کہیں کہیں عمودی لہٰذا انہیں کاٹنا ہوگا۔ اس طرح جنوب کے درّوں کے نشیب و فراز کی ڈھلانوں سے بچا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس یہ راستہ مقابل کنارے کے مہمندوں کے حملوں کی زد میں ہوگا جو ہنوز ہمارے دائرۂ گرفت سے باہر ہیں جبکہ معاہدۂ گنڈمک کے تحت ملا گوری علاقے اور مچنی درّے ہمارے اثر میں ہیں اور ریلوے لائن سیاسی یا قبائلی مسائل کھڑے نہ کرے گی لہٰذا کابل کو یہ لائن فوراً شروع کی جا سکتی ہے اور اس میں امیر کے ساتھ موجودہ معاہدات پر بھی کوئی زد نہیں پڑتی۔

لنڈی خانہ یا ڈھاکا سے جلال آباد تک اور کچھ پرے تک ریلوے کی فوری تعمیر کے راستے میں کوئی خاص طبعی رکاوٹیں نہیں ہیں سوائے بُری کاب اور علی بوغان کے درمیانی ٹکڑے کے جس کو احتیاط سے سیدھ میں لانا ہوگا اور تعمیر کے لئے بھی زیادہ وقت درکار ہوگا۔ جلال آباد سے گنڈمک تک لائن مشکل نہ ہوگی گو درونتا گھاٹی کو تھوڑا کاٹنا ہوگا اور کٹر عزیز کے پاس چٹانوں کی کٹائی کرنی ہوگی (جو قابو سے باہر نہیں) اور پھر یہ اُدرق بدرق کوتل تک آ جائے گی جو جگدالک سے زیادہ دُور نہیں اور کابل سے پچاس میل سے بھی کم ہے۔ یہ تین دن کا سفر ہے جو زرخیز جلال آباد کے اڈے (بمنزلۂ چمن ثانی) سے طے ہوگا۔

اِس سے آگے مشکلات واقعی سنگین ہیں اور یہ ایک حل طلب مسئلہ ہے کہ آیا لغمان وادی اور پھر دریائے کابل سے سیدھ بہتر نہ ہوگی ؟ یہ یقین ہے کہ اِدھر سے ایک قابلِ عبور رستہ بن سکتا ہے جو ماضی میں لشکرہائے جرّار کے لئے مستعمل رہا ہے اور اب تجارتی کاروان صرف عدم محافظت کی وجہ سے اِس سے گریز کرتے ہیں۔

کوئی وجہ نہیں کہ کابل کو ایسی ریلوے بہت مہنگی پڑے۔ زیادہ تر لمبائی کے لئے خرچ اتنا ہی ہوگا جتنا عام ہندوستانی یا روسی سرحدی ریلوے لائنوں پر اور گراں ترین لمبائی اتنی بڑی نہیں ہوگی جتنی ہرنائی تا کوئٹہ ریلوے ہے۔ اصل مشکلات زیادہ تر سیاسی ہیں۔ کیا امیر رضامند ہو جائے گا اور کیا اس کی رضامندی کے بعد قبائلی سخت مزاحمت تو نہیں کریں گے — یہ ہے اصل اڑچن ؟

کابل وسطِ ایشیا کے بیشتر حصے کے ساتھ تجارت کا مرکز ہے لہٰذا اکثر لوگ اور اہلِ قافلہ درّہ خیبر کے دونوں سروں پر ریلوے کے فوائد سے خوب آشنا ہیں۔ یہ ہندوستانی تجّار کے لئے بہت اہم ہے اور وسطِ ایشیا سے انگریزی تجارت براستہ افغانستان کے لئے بھی جو اتنی ہی تیزی سے گھٹ رہی ہے، جتنی تیزی سے روسی تجارت بڑھ رہی ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ سبّی اور چمن کے درمیان بلوچی، مری، کاکڑ یا قندھاری قبائلیوں کو جو فوائد حاصل ہوئے ہیں وہ جمرود اور کوہ دامان کے درمیان آفریدیوں، شنواریوں یا غلزئیوں کے لئے کشش انگیز نہ ہوں۔ سب زر پسند

ہیں اور وہ جلد ہی سمجھ لیں گے کہ امیر کے قافلوں کو لوٹ کر سر کی بازی لگانے سے ریلوے کی مزدوری سے پیسہ کمانا بہتر ہے۔ امیر مداخلت کے شائبے سے بھی بدکتا ہے لیکن وہ تیز آدمی ہے اور اپنے سیاسی یا تجارتی مفادات سے غافل نہیں ہے گو اس کی روشن دماغی اتنی ہی ہے کہ اس کے انتہائی محصولات ہندوستان کے ساتھ رہی سہی تجارت کا بھی گلا گھونٹ رہے ہیں جو روسی آویزش سے بھی سخت ہے۔ ریلوے اس کے لئے بھی اتنی مفید ہے جتنی ہمارے لئے، کیونکہ وہ روسی دست درازیوں اور قبائل کی شورش پسندیوں کے مقابلے پر مضبوط ہو جائے گا۔ ۱۸۸۸ء میں جب اسحاق خان کے ساتھ مسئلہ ہنوز طے نہ ہوا تھا تو امیر نے خود جلال آباد میں ایک ہندوستانی ڈویژن کی تعیناتی کے لئے تجویز کی تھی۔ وہ آڑے وقت میں ہندوستان کی مدد کا ہی چشم براہ ہوتا ہے۔ گو ہندوستانی حکومت کا اصول تعجیل نرم رد ہے تاہم امیر پر محصولات کی کمی کے لئے دباؤ ڈالنا اور اسے مزید تجارتی سہولیات فراہم کرنا جائز اور ضروری ہے۔

اگر وہ اس پر راضی نہ ہو تو خود اس کی رعایا بھی یکساں نقصان اٹھائے گی جبکہ ایک ریلوے اس کا خزانہ بھرے گی اور اس کی پسندیدہ و مطلوبہ میکانکی صنعتوں کے فروغ میں مدد دے گی ویسے بھی ورالنہر کے صوبوں کے کامیاب دفاع کے لئے کابل کا ہندوستانی ریلوے نظام سے مربوط ہونا ضروری ہے۔ اگر وہ مداخلت سے گریزاں ہے تو وہ ماورلئے خیبر خود لائن بنائے اور

اسے ذاتی ملکیت میں رکھے۔

تھوڑی سی معاملہ فہمی اس پر اس کے فوائد یا کم از کم صورتِ حال کے تقاضے واضح کر سکتی ہے۔ دریں اثناء براستہ خیبر یا اس کے گرداگرد لائن کو فوراً مکمل کیا جائے اور باقی منصوبہ تیار رکھا جائے تاکہ بوقتِ ضرورت اسے بھی پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا جائے خواہ امیر رضامند ہو یا مخالف۔

پچیسواں باب

ماضی کی وادیٔ پشاور

اپنی دلچسپیوں کے باوجود میرے نقطۂ نظر سے وادیٔ پشاور کی قدیم تاریخ کا جائزہ غیر ضروری ہے۔ یہ ایک ایسی وادی ہے جسے اوّلین آریہ بزرگوں نے آباد کیا، قدیم ہندوؤں کی گندھارا وادی، وشتو پران کی پشکالاوتی، جو حملۂ سکندر کے وقت ایک گنجان شہر کی حامل تھی اور اُس کے جانشینوں کے تحت ایک اہم یونانی باختری سلطنت کا مرکز بنی — جس کا ذکرِ خیر سنسکرت، چینی یونانی اور عربی ادب میں ہُوا، جسے سٹرابو، بطلیموس اور ایرین نے پہلی اور دوسری صدیوں میں بیان کیا، جس کے بُدھ سٹوپے پانچویں صدی میں فاہین، چھٹی میں سُنگ یُن اور ساتویں میں ہیون سانگ کی آمد پر دُور دُور تک مشہور تھے اور جو دسویں اور گیارھویں صدی میں عرب جغرافیہ نگاروں، المسعودی اور ابوریحان کا موضوع بنی اور پھر سولھویں صدی میں مُغل بابر کا مرکزِ توجہ رہی؛ جہاں چندربنسیوں کے وُرثا (خدا معلوم اِن کے درمیان کتنی قرون گذریں!) سکندر کے خلاف صف آرا ہُوئے جن کو اُس نے آساکینی پکارا، جس کی چٹانوں پر عظیم بُدھ بادشاہ اشوک نے دو ہزار سال سے بھی زیادہ پہلے اپنے کتبات کھدوائے،

پُراسرار الفاظ میں، اور جو ہندو، مسلمان اور سِکھ کے لئے اب بھی ایک معمّہ ہے اور جسے ہنوز نہیں پڑھا جا سکا! اور جہاں مختلف خاندان یکے بعد دیگرے برسرِاقتدار آئے جن میں پُشیامترا جیسے برہمن، یُوکرے ٹائیڈز یا منینڈر جیسے یونانی باختری، کیڈفائسس یا کنِرکی جیسے سیتھی، کبھی بُدھ، کبھی ہندو، مسلمان اور سکھ حتیٰ کہ یہ سِلسلۂ نامدار برطانوی ڈپٹی کمشنروں تک پہنچا!

لیکن وادی میں موجودہ متمکن قبائل کے روابط کا اندازہ لگانا اور ان کے گِرد پہاڑیوں کے حیرت انگیز نیم دائرے کو سمجھنا ان کے ماضی اور آبادکاری کے حوالے کے بغیر آسان نہیں۔ پٹھان یہاں پہلی دفعہ ساتویں صدی کے اواخر یا آٹھویں کے اوائل میں نمودار ہوئے اور لاہور کے ایک ہندو راجہ سے کہستان (یعنی وہ پہاڑی علاقہ جو دریائے سندھ کے مغرب اور دریائے کابل کے جنوب میں ہے) چھین لیا جہاں اب بھی اصلی بنگش، اورکزئی، آفریدی اور خٹک قبائل کے باقیات کی صورت میں وہ موجود ہیں۔ یہ غالباً غور کے جنگجو افغان تھے اور کوہستان نمک کے گکھڑوں کے ساتھ مِل کر انہوں نے یہ سرزمین اِس شرط پر سنبھالی کہ وہ سرحد کے محافظ ہوں گے۔ وادئ پشاور اور اُس کی ماورا پہاڑیاں اُس وقت ایسے قبائل کے ہاتھ میں تھیں جو ہندوستان سے مربوط تھے۔ سوات والوں نے نویں صدی کے شروع میں چتوڑ کے راجپوتوں کی مدد کے لئے ایک دستہ بھیجا۔ اُس وقت پشاور حاکمِ دہلی، اننگا کے تحت لاہور اور کانگڑہ کا ہم مرتبہ تھا۔ لیکن غزنویوں، سبکتگین اور محمود کے حملوں نے نہ صرف شمالی ہند کے ہندوؤں کی طاقت کا جنازہ نکال دیا بلکہ وادی کا نقشہ ہی بدل دیا۔ ۱۰۰۱ء میں نوشہرہ میں جے پال کی آخری

شکست اور ۱۰۰۰ء میں پشاور میں انگ پال کی شکست کے بعد محمود نے
ان قبائل کو فوری سزائیں دیں جنہوں نے دشمن کی مدد کی تھی اور جو شاید پٹھان
لیکن اکثر و بیشتر غالباً مسلمان تھے۔ وہ سب کو راہِ اسلام پر لالیا اور ملک کو
تہ و بالا کر دیا۔ بعد کے حملوں میں اس نے پشاور اور اس کے نواحیات کو اسلحہ خانہ
اور مرکزِ توجہ بنالیا۔ یہ اس سے پہلے کتنا بھی مہذّب اور گنجان آباد ہو اس
کے حملوں نے بقول بیلیو اسے ایک ویرانہ بنادیا جہاں شیر اور گینڈے دندنانے
لگے اور ارد گرد کے شبانی قبائل یہاں کبھی کبھار اپنے جانوروں کو چرانے لگے۔
"انہی لوگوں نے اسے بتدریج دوبارہ آباد کیا، ادھر کاشت کاری شروع
کی اور پھر ہوتے ہوتے دیگر زراعت کار بھی آگئے اور میدانوں پر بس گئے
جہاں وہ آج بھی ہیں۔ لیکن علاقہ دوبارہ اپنی خوشحالی حاصل نہیں کر سکا۔ سابقہ
قصبوں اور شہروں کے کھنڈرات پر جھونپڑیاں اور چھپّر کھڑے ہیں اور
کھنڈرات میں سے بھاری بھرکم پتھر کی سابقہ دیواریں جھانکتی ہیں۔" محمود نے
گیارھویں صدی میں اپنے جنگی کتے یہاں چھوڑ دیئے اور ایسی تباہی مچی کہ بابر
یہاں گینڈے کے شکار سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

اِن اوّلیں آبادکاروں کا ایک قبیلہ دلازک تھا جو شاید پٹھان تھے لیکن
غیر مُسلموں کے ساتھ رشتے ناطے اور دیگر رسومات کی قبولیت سے اپنے
قومی خصائص کھو بیٹھے۔ آج کا افغان اُنہیں کافر سمجھتا ہے لیکن غوریوں نے
غزنویوں کو دبالیا اور مُغلوں نے غوریوں کو، مگر دلازک پوری وادی پر چھائے
رہے۔ دریں اثنا دو پٹھان قبیلے خاخائی اور غوریہ خیل (دو بھائیوں کے نام سے

موسوم ہو) جو مدتوں پہلے قندھار میں آباد ہوئے تھے، پھلتے پھولتے اور تعداد میں بڑھتے رہے اور پھر اوّل الذکر نے عثمان خیل اور محمد زئی قبائل کے ساتھ مل کر نئی سرزمینوں کا رُخ کیا اور کابل میں جم گئے۔ ۱۳۹۷ء میں ہندوستان پر حملۂ تیموری کے وقت خاخانی بہت زور پکڑ گئے تھے اور اِتنے کثیر التعداد ہو گئے تھے کہ یوسفزئیوں، گگیانیوں اور ترکلانیوں میں بٹ گئے تھے۔ کابل میں وہ خُوب پھلے بڑھے اور اپنی لڑائیوں، شورش پسندی اور ہمسایوں کے مویشی چُرانے کی وجہ سے بدنام ہو گئے۔ وہ تیمور کے پوتے، اُلغ بیگ کے لیے مفید ثابت ہُوئے اور ۱۴۷۰ء میں اُسے حاکمِ کابل بننے میں مدد دی لیکن پھر وہ اِتنے مُنہ زور ہُوئے کہ اُس نے موقع ملتے ہی اُن کے ستّر معتبرین مار ڈالے اور باقیوں کو اِس شرط پر چھوڑ دیا کہ وہ کابل سے نکل جائیں۔ وہ بسول اور جلال آباد چلے گئے، جو اُس وقت آدینہ پور اور لغمان کہلاتے تھے۔ تھوڑا عرصہ بعد یوسفزئی، محمدزئی اور گگیانی تارتارا راستے سے پشاور آ گئے اور دلازاکوں سے دوآبہ میں بسنے کی اجازت چاہی۔ پاؤں جمے تو وہ مویشی چوری پر اُتر آئے جو ان کی دیرینہ عادت تھی اور اُلٹا دلازاکوں کو بدنام کرنے لگے۔ وعدہ شکنی کی وجہ سے دریائے سوات پر جنگ ہوئی جس میں دلازاک شکست کھا گئے۔ بہت سے کام آئے اور بہت سے سندھ پار آ گئے اور میدان جارحین کے ہاتھ رہا۔ گگیانی کابل اور سوات کے زرخیز اور پُر اشجار دوآبہ پر قابض ہو گئے، محمدزئیوں کو علاقہ ہشت نگر ملا جو دریائے سوات کے مغرب میں تیرہ میل چوڑا علاقہ ہے اور یوسفزئیوں کو

دریائے کابل کے شمال کا کھلا میدان ہلا جس میں گھاٹیاں ہیں اور پرانے لوگوں کی عمارات کی ڈھیریاں ہیں۔ کچھ وقت بعد عثمان خیل دریائے سوات کے ارد گرد کی پہاڑیوں میں جاگزیں ہو گئے۔ ترکلانی کچھ لمغان میں رہے اور کچھ باجوڑ کے سلطان کو نکال کر یہاں آباد ہو گئے۔ ان پانچوں قبائل کے اخلاف اب بھی قریب قریب انہی علاقوں میں آباد ہیں۔

تھوڑا عرصہ بعد یوسفزئی سوات پر قابض ہو گئے۔ دامن کوہ میں پہنچ کر انہوں نے ایک چال سے سواتیوں پر اچانک حملہ کیا اور زیریں وادی پر تسلط جما لیا۔ پندرھویں صدی کے آخر میں انہوں نے بنیر اور چملہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد ان کے دو حصے ہو گئے۔ یوسفزئی اور دوسرا مندان زئی (یوسف زئی کے بھتیجے کے نام پر)۔ اول الذکر دیر، سوات، بنیر اور بالائی سندھ کی پہاڑیوں میں متمکن ہوئے اور موخر الذکر یوسفزئی میدان اور بنیر اور سندھ کی درمیانی وادیوں میں۔ دریائے سوات سے سندھ تک کا سارا علاقہ یعنی موجودہ سرحد کا اندرونی اور بیرونی علاقہ یکے بعد دیگرے کسی نہ کسی یوسفزئی قبیلہ کے قبضہ میں رہا لیکن وہ سب یوسفزئی ہی کہلاتے رہے۔ اصلی سواتی جو کبھی وقت طاقتور تھے اور بقول ایلفنسٹن جہلم سے جلال آباد تک محیط تھے، سندھ کے مشرق کی طرف آ گئے اور وادی ہزارہ کے ایک حصہ میں مقیم ہو گئے جہاں وہ اب بھی موجود ہیں۔ پس ماندگان کو غلام بنا لیا گیا اور ان میں سے بعض بعد میں مشہور ولی کے تحت ہجرت کر آئے اور اب ان کا اصلی وطن سے یا اس کے لوگوں سے کوئی تعلق نہیں۔ یوسفزئیوں سے

بچا ہوا ایک چھوٹا سا کونہ یعنی وادئ پشاور کے جنوب مشرق میں کوہ مہابن کی جنوبی ڈھلان اور برخے از ہزارہ جدونوں یا گدونوں کے پاس ہے۔ وہ یوسفزئیوں سے غیر متعلق ہیں اور ان کی تاریخ مختصر اور مشکوک ہے۔

رفتہ رفتہ غوریہ خیل (مشتمل بر مہمند، خلیل اور داؤد زئی) بھی افغانستان سے نکلے اور لسول، جلال آباد اور لغمان پر قابض ہو گئے۔ مہمند اپنی موجودہ پہاڑیوں (لالپورہ اور پشاور کے درمیان) میں آ گئے۔ ۱۵۰۴ء میں بابر نے کابل وغزنی پر قبضہ کر لیا اور اگلے سال پورے سرحدی علاقے کا دورہ کیا۔ وہ درّہ خیبر سے پشاور آیا اور پھر پھرا کر درّہ کمی سرور اور لوری وادی کے راستے غزنی گیا۔ اس وقت پٹھان آباد کار لغمان، کُنڑ، پشاور، سوات اور باجوڑ میں جم چکے تھے اور کچھ اصلی باشندے اپنے موروثی سرداروں کے تحت ہنوز نبرد آزما تھے۔ اگلے پچیس سال میں بابر کو ان کے خلاف اور اپنی رعایا کو بچانے کے لئے کئی معرکے لڑنے پڑے اور وہ ان کو تتر بتر کرتا رہا، اور ان کی خواتین اور مویشیوں کو لے جاتا رہا لیکن قبائل بھی ڈٹے رہے۔ دلازاک کی رہنمائی میں اس نے باجوڑ پر حملہ کیا اور قلعہ سلطان پر توپخانہ کی مدد سے اور دیواریں پھلانگ کر قبضہ کر لیا۔ توپخانہ سے دشمن خوفزدہ ہو گیا۔ ترکلانیوں کی طاقت بڑھ گئی اور جنگجو یوسفزئیوں کے ساتھ اس نے موقعہ شناسی سے کام لیا، حملے سے گریز کیا اور ایک ملک زادی کو اپنے حرم میں داخل کر لیا۔

اس کے دو نوں بیٹے، مضطرب کامران اور متحمل ہمایوں تاریخ وادی

میں اہم ہیں۔ کامران دریائے کنڑ پر واقع پشت میں غوریہ خیلوں کے ہاں پناہ گزین رہا اور ہمایوں اس کے تعاقب میں قبیلہ بہ قبیلہ سزائیں دیتا پھرتا رہا لیکن کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ ۱۵۵۴ء کے قریب ہمایوں چلا گیا تو غوریہ خیل قبائل، داؤد زئی، خلیل اور مہمند میدان پشاور میں داخل ہوئے اور دلازاک کو بھگا کر قابض ہو گئے جہاں وہ آج بھی ہیں۔ داؤد زئی مچنی سے مشرق کی طرف سوات کی ادی زئی شاخوں اور بڈنی ندی کے درمیان اکبرپورہ تک، خلیل مچنی سے جنوب کی طرف دامن خیبر کے ساتھ پشاور تک اور مشرق کی طرف گھوم کر چلو زئی تک اور مہمند مچنی قلعہ کی پہاڑیوں میں اور دریائے بارہ کے پار آفریدی پہاڑیوں تک جو ایک زرخیز، سیراب اور پیداوار علاقہ ہے لیکن جرائم پیشہ علاقہ ہے بچے کھچے دلازاک سندھ پار کر آئے اور اب اُن کے صرف ایک دو گاؤں ہیں اس کے مغرب میں ہیں اور چند مشرق کی طرف ہزارہ میں ہیں۔

پشاور کے جنوب مشرق میں نوشہرہ سے سندھ تک، اٹک کے پاس سے اکوڑہ پہاڑیوں سے کوہاٹ تک اور ضلع کوہاٹ کے پورے جنوب اور مشرق میں خٹک قابض ہیں جو ہماری سرحد کے بہترین قبائل سے ہیں اور قریباً ہماری سرحد کے اندر واقع ہیں۔ ان کا اصلی وطن غالباً سلیمان کی شمالی ڈھلانیں تھیں اور وہ بھی تیرھویں صدی کے قریب مشرق کی طرف رُخ کرنے لگے براستہ بنوں اور کوہاٹ حتیٰ کہ پندرھویں صدی کے اواخر میں اُنہوں نے کوہاٹ کا بیشتر حصہ بنگش کے ساتھ مل کر تقسیم کر لیا تھا۔ سولھویں صدی کے قریباً وسط میں

وہ وادئ پشاور میں نمودار ہوئے کیونکہ اکبر شہنشاہ نے خیرآباد سے نوشہرو تک کا میدان اُن کے سردار ملک اکوڑ کو اُس کی خدمات کے بدلے عطا کر دیا تھا۔ وہ اکبر کے جانشینوں کے تحت پھلتے پھولتے رہے اور کبھی کبھار اپنے مہمند خلیل اور مندڑ ہمسایوں پر دست درازی بھی کرتے رہے اور غالباً کسی کمزور حکومت سے وہ وادی کا مزید حصّہ بھی لے لیتے۔ ان میں سے اکثر قبائل کی تاریخ اپنے آپ کو دُہراتی ہے بلکہ بالکل سپاٹ بن جاتی ہے۔ خٹک اُس وقت سے روزافزوں ہیں اور اب دو حصّوں میں بٹ چکے ہیں۔ پہلے کا صدر مقام دریائے کابل پر اکوڑہ ہے اور دوسرا جنوب مغربی کوہاٹ میں تیری پر مرکوز ہے۔

خٹکوں کے سوا، غوریہ خیل کی آبادکاری نے سرحد پشاور کے حواشی کے قبائل کا محلِ وقوع قریباً مکمل کر دیا۔ اگرچہ معمولی تغیر و تبدل تو ہُوا تاہم بعد میں کوئی خاص ہجرت نہیں ہُوئی۔ سابقہ تین صدیوں میں وہ سرحد کے دیگر قبائل سے تاریخی طور پر زیادہ اہم رہے ہیں لیکن حکومت ہائے بالا کے ساتھ ان کے روابط قریباً یکساں رہے ہیں۔ اکبر نے انہیں مطیع تو کر لیا لیکن اُس کی گرفت بھی جزوی ہی تھی۔ اُس کا ایک مشہور جرنیل' بیربل یوسفزئیوں کی نذر ہُوا اور اُس کی فوج بھی ختم ہو گئی۔ ممتاز رہنما جیسے ٹوڈرمل اور راجہ مان سنگھ کو وادی میں مستقلاً مورچے سنبھالنے پڑے تاکہ قبائل اس سے دُور رہیں۔ بعد کے مغلوں کے تحت وہ قدرے بے لگام ہو گئے اور چند سالوں کی کشمکش کے بعد اورنگزیب نے ایسی شرائط مان لیں جو سراسر پٹھانوں کے حق میں تھیں۔ ابتدائی درانیوں نے ان پر گرفت مضبوط کی اور رشتوں ناطوں کے ذریعے اتحاد بھی کیا لیکن کابل کی گرفت

برائے نام ہی رہی۔ اس صدی کے شروع میں سکھ نمودار ہوئے جنہوں نے رنجیت سنگھ کے دور میں وادی اور گرد و پیش کی پہاڑیوں پر قبضہ کر لیا جہاں سابقہ حکمرانوں نے کوڑے استعمال کئے تھے وہاں انہوں نے کیل دار چابک استعمال کئے۔ انہوں نے پٹھانوں پر صرف طاقت ہی نہیں بلکہ وحشیانہ طاقت استعمال کی۔ جب ایک گاؤں یا قبیلہ اُن کے تصرف میں آتا تو وہ سخت ترین اقدامات کرتے اور بلا امتیاز ظلم و ستم کرتے جیسے رُوسی بیچارے ترکمانوں پر کرتے ہیں۔ پٹھان سب سے زیادہ ہری سنگھ سے نفرت کرتا ہے اور اسے بدترین ظالم گردانتا ہے گو اس کی بہادری اور داؤ پیچ کا معترف بھی ہے۔ پٹھان مائیں اپنے خود سر بچوں کو اس کا نام لے کر ڈراتی ہیں اور سفید ریش اُن پہاڑیوں کی طرف اشارے کرتے ہیں جہاں شیر بھیڑوں کا پیچھا کرتا تھا۔ لیکن اس تمام داروگیر، جُرمانوں اور سزاؤں کے باوجود، قبائل نے اپنے مقامی ادارے، رسم و رواج، آزادی اور پہاڑی مساکن قائم رکھے ہیں اور غالباً انہوں نے ان تمام حملوں سے اتنا نقصان نہیں اٹھایا جتنا اپنی باہمی غیر مختتم چپقلشوں اور جدال و قتال سے۔

چھبیسواں باب

دورِ حاضرہ کا پشاوری پٹھان

سرحدی پٹھانوں کے مختلف شعوب وقبائل میں بھی بعض باتوں میں سخت اختلافات پائے جاتے ہیں خواہ وہ وادیٔ پشاور کے ارد گرد ہی کیوں نہ آباد ہوں اور ایسی تعمیمات اخذ کرنا خطرناک ہوگا جن کا ہم سب پر اندھا دھند اطلاق کرتے رہیں۔ لیکن ان جزئیاتی اور فروعی اختلافات کے باوجود ان میں ایک مسلّم خاندانی مشابہت ضرور ہے اور پیشتر اس کے کہ ہم ان کے حریف گھرانوں کا تذکرہ کریں بہتر ہوگا کہ ہم ان کی چند اہم، مشترکہ خصوصیات پر غور کرلیں۔ وادی میں اُن کی آبادکاری کے انداز کا جائزہ لیا جا چکا ہے اور اُس وقت سے گردشِ لیل ونہار کے باوجود یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی آدمی کے ماتحت نہیں رہے۔ کم ازکم چند صدیوں سے اُنہوں نے اپنے رواج کے سوا کسی قانون کو تسلیم نہیں کیا اور وہ سرحدی سلسلہ ہائے کوہ کے سنگلاخ قلعوں میں وحشیانہ، آزاد، چاق وچوبند بلکہ بے آئین زندگی گذارتے رہے ہیں اور آزادی کا ایسا چسکا حاصل کر چکے ہیں جو ہندوستان میں کمیاب اور تاریخِ مشرق میں غیر معمولی ہے۔ ایک قبائلی کا اندازِ راب رائے

(ایک سکاچستانی قزاق، اصلی نام رابرٹ میک گریگر، قبیلہ میک گریگر کا سردار اور بہت سی داستانوں کا ہیرو جو سٹوارٹ خاندان سے متعلق ہیں ۱۶۷۱ء تا ۱۷۳۴ء۔ مترجم) کے انداز سے مشابہ ہے۔ "میرا قدم میرے اپنے جنگل (سرزمین) میں ہے۔" اور "کیا میں پٹھان نہیں ہوں"؟ جب وہ اپنے بن سے چلا بھی جاتا ہے تو بھی اُس کا انداز اُس کے ساتھ جاتا ہے۔ وہ پہاڑوں سے نیچے اُترتا ہے تو بارُعب وجیہہ شہدہ ہے جس کے انداز بے باک و بے تکلف ہیں، خط و خال یہودیانہ ہیں، بال لمبے لمبے اور تیل میں خوب بھیگے ہوئے اور ایک بھاری بھرکم پگڑی سے دبے ہوئے، ڈھیلی ڈھالی، نیلی قمیص (تاکہ غلاظت چھپی رہے) جو بہت لمبی ہوتی ہے (اور وہ بالعموم لمبے کپڑے ہی پہنتا ہے)، پھولی ہوئی شلوار، کندھوں پر لُنگی یا چادر، گھاس پھوس کے سینڈل، بھیڑ کی کھال کا کوٹ جس کے اندر کی طرف بال ہوتے ہیں اور اُس کی جیبیں خوب بھری ہوئی، ایک لمبا بھاری چاقو اور ایک رائفل بشرطیکہ اُسے کوئی رکھنے دے! وہ غلیظ ہوتا ہے اور پیوند زدہ لیکن وہ وائسرائے کے دربار میں بھی نہایت تمکنت سے جائے گا اور ایسی بے نیازی سے جس پر ایک سیاست کار بھی رشک کر سکتا ہے! وہ دیگر ہندوستانی رعایا سے قطعاً مختلف ہے اور بسا اوقات اپنے سردار کے سامنے بھی نہیں جھکتا۔ زیادہ سے زیادہ سردار اُس کا ہمسر یا قبائلی مفادات کے لئے ایک مندوب ہے جسے معمولی سا مختصر اقتدار حاصل ہے ورنہ دیگر معاملات میں وہ ان کے عامی سے افضل نہیں۔ یہ ناگزیر خودی

اُس کا ایک طُغرائے اِمتیاز ہے اور "کیا میں ایک پٹھان نہیں ہوں؟" اُس کی نخوت و ناموس کا نچوڑ ہے۔ وہ ڈکیتی پر فخر کرتا ہے، کامیاب قتل پر دندناتا ہے، اپنی لالچ کا اعتراف کرتا ہے اور اپنی بے وفائی یا دغابازی یا حسد یا نفرت یا انتقام جوئی سے مُکرتا نہیں یا پھر وہ دن رات اپنے حسب نسب، قوت و وغا اور آزادی کے راگ الاپتا ہے لیکن اُس کی پٹھانیت اِن سب پر حاوی ہے۔

عزت و ناموس کے مغربی مفہوم سے وہ بے نیاز ہے لیکن اُس کا اپنا ضابطۂ اخلاق ہے جس کا وہ سختی سے پابند ہے اور اسے "ننگ پختانہ" کہہ کر فخر محسوس کرتا ہے۔ اس کے تحت وہ اپنے بدترین لیکن ملتجی دشمن کو بھی حقِ پناہ دیتا ہے، انتقام ضرور لیتا ہے یعنی آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت اور جان کے بدلے جان اور سب سے بڑھ کر فراخ دلانہ مہمان نوازی کا پابند ہے۔ اِس مہمان نوازی کے خلوص پر آرا مختلف ہیں۔ اکثر دینے کے لئے زیادہ نہیں ہوتا اور تھوڑا بہت جو ہوتا ہے وہ بھی سادہ ہوتا ہے اور کبھی کبھار بدترین طعنۂ بخل سے بچنے کے لئے دیا جاتا ہے لیکن جو لوگ قبائلی کا گہرا علم رکھتے ہیں وہ اِس میں اچھی رفاقت اور ملنساری کی خوبیوں کے معترف ہیں۔ تقریباتی اجتماع اکثر ہوتے ہیں اور مرد کسی زیارت یا حجرہ میں ملتے ہیں اور خوب ہاؤ ہو کرتے ہیں اور رمزے اُڑاتے ہیں۔ قبائلی مُلک قدامت پسند آئرستانی زمیندار یا بنگال کے کاشتی کارخانہ دار کی طرح اتنی خاطر مدارات کرتا ہے کہ مقروض ہو جاتا ہے اور مستورات کے لئے تکا فضیحتی کے

علیٰحدہ مواقع ہوتے ہیں۔ بہرحال پُر اشتیاق مسافر کو ایبٹ کی یہ کہاوت ضرور یاد رکھنی چاہیئے: "جو شیطان کے ساتھ کھانا کھاتا ہے اُس کا چمچہ بھی لمبا ہونا چاہیئے۔"

پٹھان کے نزدیک جوانمردی مہماں نوازی کی ہم پلّہ ہے اور یہ دو نو خوبیاں دُوسری صفات کا بھی کام کرتی ہیں۔ وہ ناعاقبت اندیشی کی حد تک بہادر ہے اور زندگی کی کوئی قیمت نہیں سمجھتا خواہ اپنی ہو یا دوسرے کی۔ جوانی سے بہادرانہ کارناموں کی تربیت اور تحمّل کی حیرت انگیز قوّت کی بدولت وہ اکثر انگریزوں کو پسند آجاتا ہے۔ ان میں سے بہتر قسم کے لوگوں میں ایک خاص طلسمیت ہے جس کی وجہ سے اکثر لوگ اُس کی دغابازی بھول جاتے ہیں اور اُس کی "بدی بھی طرزِ عمل سے باوقار ہو جاتی ہے۔" اُس کی جوانمردی بھی اکثر درشت اور وحشیانہ ہوتی ہے۔ وہ بلا تامّل دشمن سے ٹکراتا ہے اور اُسے مارتا ہے یا خود مر جاتا ہے لیکن اگر موقعہ ملے تو وہ اُس پر پیچھے سے وار کرتا ہے۔ سوتے میں اُس کے خنجر گھونپتا ہے اور برابر کی ٹکّر نہیں لیتا۔ مزید برآں پیدائشی جنگجو ہونے کے باوجود وہ بدنامی کی حد تک انتشار پسند ہے اور حملے میں بہت تیز ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ حملہ ناکام ہو جائے تو پھر وہ ہمّت ہار دیتا ہے اور پھر اسے سینہ سپر کرنا مشکل ہوتا ہے۔ وہ اپنی پہاڑیوں میں جان توڑ کر لڑتا ہے لیکن بغلی حملہ سے پریشان ہو جاتا ہے اور انقطاعِ مواصلات پر فوراً پسپائی اختیار کر لیتا ہے۔ وہ پرلے درجے کا غارتگر ہے۔ اِس لحاظ سے قبائل میں کوئی تمیز نہیں ہو سکتی

اور یہ کہنا تہمت نہیں ہے کہ بہت سوں کے لئے لوٹ مار اور ڈکیتی ہی کاروبارِ حیات ہے۔ ماں اپنے بچے کو کامیاب لٹیرا بننے کی دُعائیں دیتی ہے اور یہ شاید حیران کُن نہیں کیونکہ یہ صرف روزمرّہ کی روٹی کی دُعا ہے۔ ایک چگانہ کہانی ہے کہ ایک بچے نے اپنے اتالیق کے خنجر گھونپ دیا تو موخرالذکر سے التجا کی گئی کہ وہ اسے خاطر میں نہ لائے کیونکہ یہ بیچارے بچے کی پہلی کوشش تھی۔ یہ قصہ ایسا ہی ہے جیسے پنچ کی وہ تصویر جس میں شیفیلڈ کا باسی گھٹنوں پر جُھکا ہوا ہے اور بلڈاگ کا پلاّ اُس کا رُخسار چبا رہا ہے اور بچہ اپنے والد کو صبر کی تلقین کر رہا ہے تاکہ پلاّ صحیح معنوں میں بلڈاگ بن سکے۔ چاقو کا موثر استعمال پٹھانوں کی روایتی تعلیم کا حصّہ ہے۔ شکار کے گلے پر چاقو رکھ کر "دے دو ورنہ میں لے لوں گا" کہنا نسبتاً ایک مُعتدل سی التجا ہے۔ مغرب میں قزاق کا اصُول ہے "تمہارا روپیہ یا تمہاری جان" لیکن پٹھان پہلے جان لیتا ہے اور کسی کو اگر محض نقدی لے کر چھوڑ دیا جائے تو اُسے آپ کو انتہائی خوش قسمت سمجھنا چاہیئے۔

اُس کی توہّم پرستی لامحدُود ہے اور اس سلسلہ میں عورتیں مردوں سے بدتر ہیں۔ ملاّ، پیر، مُرید اور آوارہ گرد "حق کے متلاشی" اس کے لئے سب سینٹ پیٹرس ہیں جن کے ہاتھوں میں بہشت کی کُنجی ہے اور کسی نوع کے عربی نما الفاظ اُس کے لئے دشمن کی گولی کی گونج سے زیادہ خوف آور ہیں اور "ہوائی خنجر" اُس کے لئے قاتل کے چاقو سے زیادہ ہولناک ہیں۔ وہ معجزہ جادو اور شگون پر پُختہ ایمان رکھتا ہے، سلام کئے بغیر کسی زیارت

کے پاس سے نہیں گذرتا، کوئی فقرہ "انشاء اللہ" کے بغیر نہیں بولتا اور نماز کے بغیر کسی کا گلا نہیں کاٹتا لیکن وہ اپنے کاروبار، خواہشات اور جذبات کی تکمیل کے لئے دینِ محمدی اور اُس کے احکامات کو دخیل نہیں ہونے دیتا۔ "پل میں ولی اور پل میں شیطان" اُس کے متعلق ایک عام کہاوت ہے۔ وہ حقوقِ نسواں کا قائل نہیں۔ وہ اکثر اپنی زوجہ خریدتا ہے یا ایک کارندے کے ذریعے اُس کا انتخاب کرتا ہے لیکن ایک دفعہ وہ اسے حاصل کر لے تو پھر وہ اُس کی پُوری جائداد ہے جس میں اُس کی عزّت ملفوف ہے اور وہ سب سے زیادہ اسی کے متعلق خائف رہتا ہے۔ وہ غیر محرم سے بات کرے تو وہ مُشتعل ہو جاتا ہے اور اُس کا اعتبار نہیں کرتا، کسی اتفاقیہ گپ پر وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو سکتی ہے اور اُس کے ہمکلام سے دشمنی کی بُنیاد پڑ سکتی ہے لہٰذا اُدھالا (عورت کا فرار) عام ہے، ہر نوجوان سازباز سے اپنی شہرت قائم کرتا ہے اور بیویاں گلا کٹوانے سے فوری رضامندی کو ترجیح دیتی ہیں۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ پٹھان لالچی اور حریص ہے اور سونا (سونا تو اولیاء کو بھی کھینچ لیتا ہے اور کون اِس کی کشش سے مبرّا ہے؟) حبّ الوطنی، عزّت، دفاکیشی اور دوستی کو دبا لیتا ہے لیکن اِس سلسلے میں وہ کچھ زیادہ ہی موردِ تنقیص بنا لیا گیا ہے اور چند بدترین اجزا و افراد کو کُل پر محیط کر دیا گیا ہے۔ یہ معدودے چند واقعی بہت بُرے ہیں۔ اگر پشاور کے کسی جج یا افسر کے فوجداری مقدمات کو معیار بنا لیا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ اُس کی تصویر نہایت تاریک و مہیب معلوم ہوتی ہے۔ ایک وسیع التجربہ افسر نے

حال ہی میں "پشاور سرحد کے جرائم" کی بے حد گھناؤنی کہانی پیش کی ہے۔ سرحدی کمشنر اور جج کے پنجسالہ خوفناک تجربات کے متعلق مسٹر الیسمی نے کہا ہے کہ ذہنی کوفت کے لحاظ سے یہ اُس کی بقایا سازی ہندوستانی ملازمت کے مقابلے پر بھاری تھے۔ وہ کہتا ہے: "بدترین قسم کا جُرم یہاں روزمرہ کا دستور ہے، قتل اپنے تمام مراحل میں، مجمع کے سامنے دن دہاڑے بیدردانہ قتل، سکوتِ شب میں سوئے ہُوئے دشمن کا مکارانہ قتل، قاتلوں، بلوائیوں، زہر دینے والوں، لڑکوں اور عورتوں کا شمشیر بدست ہو کر قتل کرنا ــــ خون کا بدلہ خون، انتقام جوئی ایک صفتِ عالی جو ورثے میں باپ سے بیٹے کو ایک مقدس فرض کے طور پر منتقل ہوتی ہے"! قتل ایک دھندا جس کے لئے چند ٹکوں کے بدلے ایسے آدمی اتنی ہی آسانی سے مل جاتے ہیں جتنے ایک پارسل لے جانے کے لئے ہرکارے! ضلع پشاور پنجاب کا قریباً بتیسواں حصّہ ہے لیکن پُورے پنجاب میں ظہور پذیر ہونیوالے واقعات قتل کا ایک تہائی یہاں ہوتا ہے۔ پولیس کے مطابق پورے صوبہ میں ہر ۵۰۰۰ میں سے ایک قتل ہوتا ہے گویا ہر ۲۰۰۰ پٹھانوں میں سے ایک سالانہ قتل ہوتا ہے۔ اغوا کنندہ کی زیادتی، عورتوں اور لڑکیوں کے لئے آویزش اور لڑکوں کے لئے رقابتیں (جو غیر فطری بدفعلیوں کا شکار ہوتے ہیں) زیادہ تر کشت و خون اور انتقام کا موجب بنتی ہیں۔ بزبان مسٹر الیسمی "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وادی کے ہر باشندہ کے اندر قاتل کی رُوح موجود ہے۔"

اِس سے بھی بدتر یہ کہ رائے عامہ قاتل کو چھپاتی ہے۔ مُجرم کی شناخت

قریباً ناممکن ہے کیونکہ معتبرین اکثر و بیشتر بے گناہ لوگوں کے خلاف الزام تراشتے ہیں اور حیرت انگیز اور واقعاتی جھوٹی شہادتیں بھی پیدا کر لیتے ہیں تاکہ اصل مجرم بچ سکیں یا کوئی پرانی دشمنی چکائی جا سکے۔ ان جھوٹے الزامات اور اصل مجرموں کی پردہ داری سے انصاف ہکّا بکّا رہ جاتا ہے اکثر دیہات میں مجرم کی شناخت اور گرفت ممکن ہی نہیں اور شاید ہی کبھی پولیس کسی مجرم کو عدالت تک لا سکی ہو گی۔ لہٰذا خصوصی ضوابط ضروری ہوئے، سرحدی افسروں کو سرسری سماعت کے بعد فوری فیصلوں کے اختیارات دینے پڑے اور حال ہی میں بعض جرائم کے فیصلے جرگوں کے سپرد کرنے پڑے کیونکہ وہ اپنے دقیانوسی انداز میں اکثر ان کی مؤثر روک تھام کر لیتے ہیں۔

جرائم کی مزید تفصیل غیر ضروری ہے۔ یہ نیوگیٹ کیلنڈر کے برابر یا اس سے بھی بدتر ہے اور یہی حال دیگر مشرقی ممالک کا ہے۔ شہر پشاور قسطنطنیہ یا پورٹ سعید کا مقابلہ کر سکتا ہے یا بعض مغربی شہروں کا، لیکن اکثر شہروں یا لوگوں کا اندازہ پولیس رپورٹوں کی بناء پر خوفناک ہوتا ہے۔ وادی کا محلِ وقوع ایسا ہے کہ اس کے اپنے غنڈوں کے علاوہ ہر قسم کے قانون شکن غنڈے بھی یہاں آ دھمکتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے اپنے علاقوں میں زندگی اجیرن کر دی ہے اور وہ برطانوی حفاظت میں سکون سے بھی رہتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ یہاں کے قبائل کی مجرم پناہی بھی ان کے لئے بڑی کشش ہے۔ بہرحال یہ غیر اغلب ہے

کہ ماورائے سرحد کا قبائلی ورائے سرحد کے قبائلی سے زیادہ اچھا یا زیادہ بُرا ہے اور یہ اُمید کی جا سکتی ہے کہ اِن دونوں میں عدالتوں کے مقدمہ بازوں کی نسبت زیادہ خوبیاں ہیں۔

دیگر انسانوں کی نسبت یہ سرحدی پٹھان ایک مُستقل حالتِ جنگ میں رہتا ہے۔ اُس کے لئے زندگی کی ساری کشش اِسی میں ہے، صدیوں پُرانے ماحول نے اسے اِس کے جینے کی شرط بنا دیا ہے، اُس کا ہاتھ ہر ایک کے گریبان پر ہے اور وہ جھگتا ہی چھاپہ یا لُوٹ مار میں ہے۔ لڑکپن سے وہ زرخیز وادیوں اور میدانوں کی لُوٹ مار سے اپنی چٹیل پہاڑیوں کے وسائل میں اضافہ کرتا رہا ہے اور کون اسے روک سکتا ہے؟ صرف طاقتور اور چوکنے ہمسائے ہی سدِّ راہ ہو سکتے ہیں۔ قدرتی طور پر وہ اُس حکومت سے متنفّر ہے جو امن و امان قائم رکھتی ہے یا ہمسایہ داری پر زور دیتی ہے۔ وہ ایسی پابندیوں کو اپنے مقدس ترین حقوق (تاخت و تاراج اور مالیات کے حقوق) کی پامالی گردانتا ہے۔ سال ہا سال تک ہشت نگر اور یوسفزئی میدان سواتی ڈاکوؤں کی شکارگاہ تھے جو ہندو تاجر کو پکڑتے تھے اور فدیہ لے کر چھوڑتے تھے۔ ان کے پہاڑی قلعے ہماری حکومت کے ہر دشمن کی پناہ میں۔ مدتوں تک مہمند اوسطاً پچیس چھاپے سالانہ مارتے رہے تاکہ رشوت دے کر ہم ان کا ہاتھ روک سکیں۔ نہرِ سوات کا منصوبہ اُنہیں مشکوک و مشتبہ معلوم ہُوا تو اتمان خیل ایک رات سوئے ہُوئے قلیوں پر ٹوٹ پڑے اور اُنہیں خیموں میں ہی ایسے مَسل دیا جیسے پرندوں کو جال میں۔ حال ہی میں کوہاٹ کی شاہراہ پر سرحدی پولیس کے

ایک مینار کی تعمیر پر اکاخیل مشتعل ہو گئے کیونکہ اُن کی قدیم ڈکیتی کے راستے بند ہوجاتے لہٰذا اُنہوں نے معمار اغوا کر لئے۔ لیکن جیسے توسیع تہذیب جنگلی مغرب میں ریڈ انڈین کے مَن مانے راستے بند کر رہی ہے ایسے ہی سرحدی پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ قیامِ امن اندرونِ سرحد لوگوں کے لئے نعمت ثابت ہو رہا ہے اور ماورائے سرحد قبائل کا قافیہ حیات تنگ کرتا جا رہا ہے اور یوں پشاور کے فوجداری مقدمات بھی بالواسطہ طور پر زیادہ ہو گئے ہیں۔ جنگ کے تمام مواقع سے بتدریج محروم ہو کر ممکن ہے کہ سرحدی پٹھان بھی اوتھیلو کی طرح شکوہ کرے کہ اُس کا کاروبارِ حیات بھی ٹھپ ہو گیا! آیا وہ اِن تغیر پذیر حالات میں مطمئن ہو سکتا ہے یا مطمئن ہے اور آیا اِس کے لئے کوئی متبادل اور مناسب کاروبار تلاش کرنا چاہیئے ــــ ایک ایسا مسئلہ ہے جو قابلِ غور ہے!!

ستائیسواں باب

فٹز ہارڈی کا قاتل ـــ ایک گھریلو پیر جلدی

شاید شک و شبہ رفع کرنا بہتر ہوگا اور ہم باٹم کی طرح قاری محترم کی تخویف سے اجتناب ہی آغاز کریں گے۔ عنوان کے باوجود فٹز ہارڈی کو کچھ نہیں ہوگا اور اُس کا وفادار پٹھان معتمد (جسے سب واقفکار "قاتل" کہہ کر پکارتے ہیں) کسی بھی قاری کی کرسی کے پیچھے ایسے ہی بے ضرر طور پر انتظار کرتا جیسے لندن کا پیادہ سپاہی اور گو بلاشک و شبہ وہ شیر تھا تاہم اُس کی دھاڑ نغمۂ بلبل کی طرح تھی۔ وہ اپنے آقا کے مہمانوں کو خوش آمدید کہتا تھا، بہترین پشتو میں اُن کی خیریت دریافت کرتا تھا اور رخصت ہونے پر اُنہیں "خدائے پہ امان" کہتا تھا۔ بدقسمتی سے وہ رجمنٹ میں آیا تو قابلیت کا ٹیکہ بھی ساتھ لایا۔ وہ ایک وجیہہ، طویل القامت، راست اعضا، سڈول، اڑیل اور متمرد یوسفزئی پٹھان تھا جو دریائے سوات کے پاس کے بلند علاقہ رانی زئی سے آیا تھا۔ اُس کی ناک سیدھی، بال سیاہ، اور جلد قریباً سفید تھی۔ اُس کا انداز بے تکلف تھا اور وہ بھرتی ہونے کی وجہ برملا کہہ دیتا تھا۔ ایک ناگزیر کاروباری معاملے نے اُسے بعض ہم وطنوں کو مارنے پر مجبور کردیا اور

اُن کے ورثا اُس کی تاک میں تھے اور اُس کا وطن جانا ناممکن ہو گیا تھا۔ لہٰذا اُس نے ملکہ کی تنخواہ قبول کر لی اور اپنے نام خوشحال خان کے عین مطابق وہ خوشدلی سے ایک مقامی رجمنٹ میں سپاہی بھرتی ہو گیا۔

موقعہ ملا تو وہ فریزر ہارڈی کا اردلی بن گیا اور دونو مختلف علاقوں میں مصروف کارروائی رہے۔ کئی دفعہ سرحد کے قریب اُس کے قبیلے کے ساتھ بھی جھڑپیں ہوئیں لیکن کسی موقعہ پر اُس کی خلافِ معمول خون آشامی ظاہر نہ ہوئی۔ صرف ایک موقعہ پر یہ ضرور نمودار ہوئی۔ دیگر افسروں کی طرح فریزر بھی تنگدست تھا اور وہ کبھی کبھار سوچتے سوچتے اداس ہو جاتا تھا۔ اس اُداسی کو وفادار اردلی نے بھی محسوس کیا اور ایک دن صاحب سے پوچھا کہ کیا اُسے حالات کی بہتری کا کوئی طریقہ نہ سوجھتا تھا؟ کیا خاندان سے اُسے کوئی اُمید نہ تھی؟ کیا کوئی نہ تھا جو اُسے پیسہ دے دیتا؟ صاحب کو اپنی ایک ضعیف چچی کا خیال آیا جو شاید مرنے پر اُس کے لیے کچھ سرمایہ چھوڑ جائے لیکن اُس کی موت فی الحال دُور معلوم ہوتی تھی۔ خوشحال نے اِدھر اُدھر دیکھا اور میدان صاف پایا، سارے دروازے بند کیے اور چمکتی ہوئی آنکھوں اور چاقو ڈھونڈتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ اُس نے سرگوشی کی" صاحب! میں جاؤں گا اور اُسے مار دوں گا۔ شاید وہ مجھے پکڑ لیں اور پھانسی لگا دیں لیکن آپ کو تو روپیہ مل جائے گا!" پیشکش پُرخلوص تھی اور قاتل کو بے حد افسوس ہوا کہ اُس کے افسر میں دم خم کی اتنی کمی تھی کہ اُس نے اِسے ٹھکرا دیا۔

رفتہ رفتہ مالی حالت بہتر ہو گئی۔ فِٹز کو ایک انتظامی عہدہ ملا اور وہ ضلعی افسر بن گیا۔ اب خوشحال کو بھی ناموری کا شوق چرّایا اور وہ پنڈ آباد میں فِٹز کے بنگلہ اور اُس کے مشتملات و ملحقات کا جنرل منیجر بن گیا اور یوں خوشحال بھی دولت و شہرت سے ہمکنار رہُوا۔ اُس نے گھریلو معاملات کا کُلی انتظام سنبھال لیا۔ وہ اُس کے ملازموں کو بھرتی کرتا، اُس کے پڑاؤ کا بند و بست کرتا اور وہ فِٹز پر اتنا حاوی ہو گیا کہ وہ فِٹز کا 'قاتل' مشہور ہو گیا۔ قاتل کے فِٹز کا بیان شاید اِن دونو کے تعلقات کو صحیح طور پر نمایاں کر سکے گا۔ حُسنِ انتظام منصفانہ قانونِ اجارہ پر مبنی تھا۔ قاتل ہر چیز کا ٹھیکہ لیتا تھا — دیا سلائی، جوتوں کی سیاہ پالش، لیمپ کا تیل، خلال کا ماہانہ ٹھیکہ، لیکن اِس میں کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔ فِٹز کیپٹن تھا تو دیا سلائی کا ماہوار خرچ آٹھ آنے تھا لیکن میجر ہونے پر بارہ آنے ماہوار سے کم خرچ اُس کے شایانِ شان نہ تھا اور قاتل کے مطابق کوئی لیفٹننٹ کرنل ایک روپیہ ماہوار سے کم پر اپنا پائپ نہ سُلگا سکتا تھا۔ اُس کے خچر اور خیمے بھی ٹھیکے پر تھے۔ اگر لباس نہیں تو اُس کا رکھ رکھاؤ اِسی اصُول پر منحصر تھا اور قاتل مقررہ ماہانہ شرح پر اُس کی جرابوں کے سوراخ رفو کرتا تھا۔ اُس کی خوراک بھی ٹھیکہ پر تھی اور وہ اچھا خاصا خوش خوراک تھا، گو اس کا التزام و اہتمام ٹھیٹ پٹھان اصولوں پر کیا جاتا تھا۔ کبھی سخت نمکین گائے کا گوشت آتا اور کبھی خوب بھرمار ہوتی اور خوشحال اپنے آقا کے پاس کھڑا ہو کر رسیلے پارچہ گوشت کا صرف ایک اور چمچا لینے پر اصرار کرتا یہ موقعہ کھو کر فہرست طعام پھر نمکین گائے کے گوشت پر آ رہتی۔ اِس ٹھیکے

کی کہانی پنڈ آباد میں ایسے ہی مشہور تھی جیسے مارک ٹوین (سیموئیل لینگ ہارن کلیمز، قلمی نام مارک ٹوین ۱۸۳۵ء تا ۱۹۱۰ء۔ امریکی مزاح نگار۔ مترجم) کی۔ بے حد گرم دنوں میں بھی گائے کے نمکین گوشت کا مختلف شکلوں میں طویل دور دورہ ہوا تو فرٹز نے ڈانٹ ڈپٹ کی۔ اس پر ایک دو دن کے لئے بڑے چوزے آئے لیکن پھر وہی نمک زدہ گوشت کی قسطیں شروع ہو گئیں۔ فرٹز بیچارہ تنگ آیا لیکن قاتل نے برآمدہ کے کونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "صاحب! ادھر آئیے اور ان کنستروں کو دیکھیے۔ میں پوری ایک گائے لایا ہوں اور اسے نمک لگایا ہے اور اسے بہر حال کھانا ہے، میں کیا کروں؟" مجبوراً فرٹز کو تحمل کرنا پڑا اور آمدِ بہار کی طرح تجدیدِ اجارہ کا انتظار کرنا پڑا۔

فرٹز نے شادی نہیں کی۔ شاید وہ ٹھیکے کی چار دیواری میں نہ سما سکتی۔ لیکن ایک دن قاتل اُچھلتا کودتا آیا اور پچیس روپے پر ایک لڑکی لایا۔ یہ خوشی چار دن کی چاندنی تھی۔ ایک دن دونو کا جھگڑا ہو گیا اور رونے پیٹنے کی آواز آئی۔ نوجوان بیوی مالی سے باتیں کر رہی تھی اور وہ اُسے درست کر رہا تھا۔ حسنِ اتفاق کہ یہ عشق بازی برطانوی علاقہ میں ہوئی ورنہ ..... بہر حال اُس نے اگلے دن اُسے بیچ دیا اور فرٹز کو بتایا کہ سولہ روپے پر سودا کر لیا تھا۔

کبھی کبھار فرٹز سوچتا کہ یہ پٹھان شہدہ چھٹی مانگے اور وہ اشارتاً کہتا بھی رہا لیکن نہیں، وہ گھر نہ جا سکتا تھا اور شاکی بھی نہیں تھا۔ اُسے اپنی محفوظ جگہ اور مہربان آقا کا احساس تھا۔ بالآخر فرٹز نے طویل رخصت لے لی اور سوچا کہ بلا ٹل جائے گی اور وہ شاید اپنے وطن لوٹ جائے اور اس کے دوست اُسے

وہاں روک لیں۔ اگر ایک اینفیلڈ گولی یا پٹھان چاقو میں کوئی ترغیبی عنصر ہے تو وہ یقیناً اسے روک لیں گے۔ فنٹر دو سال گائے کے گوشت کے بغیر چھٹی پر رہا اور گلی کوچوں سے دیا سلائی خریدتا رہا لیکن بالآخر اُسے واپس آنا پڑا۔ واپسی پر اُسے سب سے پہلے ملنے والا آدمی خوشحال ہی تھا۔ خرانٹ قاتل بمبئی آیا تھا اور صاحب کے لئے ایک نذر (تحفہ) خریدی کیونکہ بڑے آدمی کے سامنے خالی ہاتھ پیش ہونا ہندوستان کی ریت نہ تھی۔ واٹسن ہوٹل میں اُس نے فنٹر کے لئے تحائف پھیلا دیئے جن میں ایک بر اعظمی ریلوے ٹائم ٹیبل تھا (گویا صاحب اِسے پڑھ کر لطف اندوز ہو گا) اور آدم خان کی قبر پر اُگنے والے درخت کی ایک مضراب جو یوسفزیوں کے مطابق ہر ایک کو بہترین رباب نواز بنا سکتی تھی، گو اُسے فنٹر کی رباب نوازی پر شبہ نہ تھا۔ تیسرا تحفہ دو نسلا پِلّا تھا جس کا اُس نے فوراً ٹھیکہ لے لیا۔ چوتھی حساب کے لئے ایک ڈائری تھی اور اِن تحائف کے ساتھ اُس نے "صاحب! السّلام علیکم" کہا۔

اِس کے بعد بھی کئی واقعات رُونما ہوئے، کئی جھٹکے ظہور میں آئے، فنٹر اور اُس کے پرانے قاتل کے درمیان؛ لیکن موخر الذکر اِن تعلقات و انتظامات کے توڑنے یا ٹوٹنے کا نام بھی نہ سنتا تھا۔ ایک دفعہ تو فنٹر نے اُسے پنشن دینے کی پیشکش بھی کی لیکن اُس نے کہا: "صاحب! اگر میں نے تمہاری ملازمت کے لئے اپنی رجمنٹ نہ چھوڑی ہوتی تو میں اب تک صوبیدار میجر ہو گیا ہوتا۔ تم جانتے ہو کہ میں رانی زئی نہیں جا سکتا۔ جب میں پوری تنخواہ اور الاؤنس پر کام کر سکتا ہوں تو پنشن کیوں لوں؟ صاحب! تم ایک اچھے آقا ہو اور میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گا، کبھی نہیں!"

اٹھائیسواں باب

پٹھان خواتین

پیشتر اس کے کہ میکس اوریل نے اُن کی غلط فہمیاں دُور کیں، ہمارے فرانسیسی ہمسائے یہی سمجھتے تھے کہ جان بُل سمتھ فیلڈ کی منڈی میں اپنی مستورات کی خرید و فروخت کرتا تھا۔ سرحدی پٹھان بھی اپنی مستورات ایسے ہی خریدتے ہیں۔ یہ رسم عام اور ہمہ گیر نہیں ہے تاہم پٹھان بعض اوقات اپنا روپیہ دعوتوں، دُلہن کے زیورات، دلالوں کی فیس یا تبادلۂ تحائف (جو شادی کی طے شدگی کا ایک مشرقی طریقہ ہے) اور خاطر مدارات پر پانی کی طرح بہاتا ہے تاکہ دُلہن کے ماں باپ اس کی حیثیت پر مطمئن ہو سکیں کہ دُلہن کسی قلاّش کے پلّے نہیں باندھی جا رہی۔ بعض (جیسے ڈیرہ اسمٰعیل خان کی سرحد کے شیرانی) تو جہیز بھی دیتے ہیں لیکن زیادہ تر اکثر قبائل میں مستورات جانوروں کی طرح خریدی اور بیچی جاتی ہیں اور فیصلہ خریدار کی استطاعت اور شے فروختہ کے حسن و شباب پر منحصر ہوتا ہے۔

اس فرانسیسی مبصّر کے مطابق انگلستان میں فرار عام ہیں: "ایک دوشیزہ صبح خط ڈالنے جاتی ہے اور واپسی پر اپنے والدین کو مطلع کرتی ہے کہ اس

نے شادی کر لی ہے۔" سکاٹ لینڈ میں یہ کاروبار اور بھی آسان ہے۔" "نوجوانوں کے لئے یہی کہہ دینا کافی ہے "میں تمہیں بیوی بناتا ہوں، میں تمہیں بحیثیت شوہر قبول کرتی ہوں، اور معاملہ طے ہو جاتا ہے۔" اس کے برعکس پٹھان شادی کے بکھیڑوں سے بچنے کی کوشش کے باوجود اُن میں اتنا اُلجھتا ہے کہ "جان بُل کی شادیاں" کا محترم مصنف ایک اور کتاب ترتیب دے سکتا ہے۔

وزیری تو اِس ضمن میں سب پر فائق ہیں۔ مثلاً جب کوئی وزیری لڑکا شادی کرنا چاہتا ہے تو وہ ایک معتبر سفید ریش کو لڑکی کے والدین کے پاس بھیجتا ہے۔ اگر وہ راضی ہوں تو کہتے ہیں" ہری لے آؤ" یعنی ۶۰ تا ۱۰۰ روپے۔ اِس پر لڑکا اپنے والد کو اپنے دوستوں کے ساتھ دعوت کے لئے ایک دو بھیڑیں دے کر روانہ کرتا ہے جو لڑکی کے گھر میں مطلوبہ رقم لاتے ہیں اور بھنے ہوئے گوشت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اِس کا مختصر سا حصہ بطور شگون واپس کر دیا جاتا ہے۔ یہ گویا منگنی ہے اور پھر جب بھی لڑکا اپنی منسوبہ کے ہاں جاتا ہے تو وہ چٹ پٹے کھانوں کا سامان لاتا ہے، منسوبہ پکاتی ہے اور سب کھاتے ہیں۔ وہ دو تین روپے رکابی میں رکھ دیتا ہے اور باپ بھی اُسے کوئی چھوٹا سا تحفہ دیتا ہے۔ گلوبند، جوتا یا کوئی سستی انگوٹھی! اِس رسم کو از راہِ مزاح 'خر بندی' کہتے ہیں۔ شادی کے دن دُولہا کے دوست، مرد اور عورتیں دُلہن کے گاؤں جاتے ہیں اور ایک لمبی چوڑی دعوت کرتے ہیں، شام کو برات آتی ہے اور چھڑیوں اور پتھروں کے ساتھ گاؤں پر ایک مصنوعی حملہ کر کے جشن میں شریک ہو جاتی ہے جو رات بھر جاری رہتا

ہے۔ سونے کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ چولھوں میں آگ جلتی ہے اور دروازے دھوئیں سے سیاہ ہوجاتے ہیں اور سردی میں بھی ان کا یہی دستور رہتا ہے۔ اگلی صبح دُلہن کو بیل یا گدھے پر بٹھا کر لے جاتے ہیں لیکن دُولہا اپنے ساس سُسر کو حوصلہ دینے کے لیے ایک دو روز ٹھہرتا ہے۔ چودہ روزہ ماہِ عروسی کے بعد دُلہن اپنے میکے آتی ہے اور اپنے تحائف لے جاتی ہے جو دُولہا برات میں تقسیم کرتا ہے۔ لیپ کے سال کی تقریبات تو شاید ہی وزیرستان میں معلوم ہوں لیکن کبھی کبھار خاتون اپنے گاؤں کے ڈھولچی کے ذریعے ایک رومال اپنے محبوب کی ٹوپی سے ضرور منسلک کرواتی ہے۔ ڈھولچی تاک میں رہتا ہے اور پھر منظرِ عام پر یہ کام کرتا ہے جب وہ اُس سے شادی پر آمادہ ہوجاتا ہے، بشرطیکہ وہ قیمت ادا کر سکے۔

یوسفزئی قبائل میں خواستگار کاروبارِ شادی کے لئے پیشہ ور دلالوں کی خدمات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ابتدائی مذاکرات کے بعد وہ اور اُس کا محرم راز ہونیوالے سُسر کے ساتھ تحائف کا فیصلہ کرتے ہیں اور بات پکی کرنے کے لئے اکٹھے شکر کا شربت پیتے ہیں۔ پھر منگنی کا اعلان کر دیا جاتا ہے اور پُرامید دُولہا جب چاہے اپنی منسوبہ کے لئے تحائف لے کر آسکتا ہے لیکن وہ اسے دیکھ نہیں سکتا۔ رُونمائی شادی کی تقریبات کے بعد ہی عمل میں آتی ہے جب دُلہن نئے گھر میں پہنچادی جاتی ہے اور وزیریوں کے برعکس اُس کی سہیلیاں اُس کے والدین کو تسلی دیتی ہیں۔ پھر بھی رُونمائی سے پہلے دُولہا کو تین دن اور دو راتوں تک اپنے دوستوں کی تواضع کرنا پڑتی ہے۔

کم از کم نظریہ یہی ہے۔ دونو اپنے دوستوں کے شادی کے تحالف کی قدر و قیمت اہلِ مغرب کی طرح کرتے ہیں لیکن دوستوں کی شادی پر ایسے ہی تحائف کی واپسی یوسفزئیوں کے ہاں بنائے فساد ہو سکتی ہے۔ دُولہا کو دو طرفہ اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں جو کبھی کبھی زیادہ گراں ہوتے ہیں۔ سستی شادی ۱۰۰ روپے، اوسط شادی غالباً ۲۵۰ روپے تک اور امیر یوسفزئی کی شادی کئی ہزار روپے تک ہوتی ہے۔ لہٰذا ایک ہی شادی کافی سمجھی جاتی ہے بمصداق " دو بیویاں موسم سرہانے آتی ہیں " بہت کھاتا پیتا خان ہی چار شرعی بیویوں کا مستحق ہو سکتا ہے۔

اکثر علاقوں میں پردے کا رواج نہیں ہے۔ عورتیں شہروں یا بڑے اجتماعات میں سرتا پا بُرقعہ میں ملبوس ہوتی ہیں جو نقاب دار ہوتا ہے لیکن اپنے خیموں اور دیہات میں بُرقعہ کے بغیر پھرتی ہیں، بے دھڑک لیکن مردوں سے باتیں کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ تاہم اصناف کے درمیان رابطہ قریبی ہوتا ہے لہٰذا شادیوں کے فیصلے باہمی کشش کی بناء پر ہوتے ہیں اور ابتدائی مذاکرات صرف رسمی اور برائے نام ہوتے ہیں لیکن قیمت پھر بھی دینا پڑتی ہے۔ کسی لڑکی کا اغواء بہت سے قبائل کے ہاں قتل کا درجہ رکھتا ہے اور اس کی سزا بھی ویسی ہی سفاکانہ ہوتی ہے۔

اکثر سرحدی پٹھانوں یا افاغنہ کے ہاں تقریبات میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ کبھی دُولہا سسرال کو دعوت دیتا ہے، کبھی جرگہ کو اور کبھی گاؤں کو ۔۔۔ مہمان نواز پٹھان دوسرے کا حقِ میزبانی بھی خوب پہچانتا ہے لیکن اکثریت

کے ہاں یہ ایک کاروباری معاملہ ہوتا ہے اور دعوتوں کے علاوہ 'وَلوَر' بھی دینا پڑتا ہے۔ تجارت گریز قبائل بھی وَلور لیتے اور دیتے ہیں۔ ہیری وزیریوں کے ہاں ۶۰ روپے اور محمد غلزئیوں کے ہاں ۱۰۰ روپے ہے۔ بنوں میں ۳۰ تا ۱۰۰ روپے ہے اور یہی خٹکوں کے ہاں رائج ہے لیکن کوہاٹ کی سرحد پر ۱۰۰ تا ۲۰۰ روپے تک ہے۔ میرانزئی میں نرخ بڑھ کر ۲۰۰ تا ۵۰۰ روپے ہو جاتا ہے۔ کوہاٹ اور پشاور سرحد کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تجارت ہوتی ہے۔ ٹکر کے مطابق ایک محنتی اور مفید آفریدی بیوی ۱۵۰ تا ۲۰۰ روپے تک بک سکتی ہے لیکن حسین و جمیل ۱۰۰۰ روپے یا اس سے بھی زیادہ پاتی ہے۔ بقول ٹکر "ایک عام پہاڑی عورت شکیل نہیں ہوتی لیکن وہ گدھے کی طرح کام کرتی ہے، گھاس کاٹتی ہے، ایندھن لاتی ہے، پانی بھرتی ہے، غریبانہ زندگی گذارتی ہے اور وادی کی نازپروردہ کے مقابلے پر دگنا کام کرتی ہے۔"

ماورائے سرحد قبائل نہ صرف اپنی رشتہ دار خواتین کو بیچتے ہیں بلکہ چند سال پہلے حکومت کی توجہ اس پر بھی مبذول کروائی گئی کہ سوات، باجوڑ اور دیگر وادیوں سے گاہے خریدہ اور گاہے دزدیدہ بیویوں کی تجارت بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ ہماری سرحد پر اسے روکنے کے اقدامات کیے گئے۔ دزدیدہ عورتیں خریداروں سے لے کر واپس گھروں کو بھیج دی جاتی تھیں لیکن ان کے رشتہ دار شاید شرم کے مارے ان سے بھی جان چھڑا لیتے تھے لیکن منڈی اب بھی فروختہ یا فروختنی مستورات سے بھری پڑی ہے اور ضلعی افسر کے سامنے ایسی کئی مثالیں آتی ہیں۔

ٹکڑ کی ایک مثال ہے ماورائے سرحد کی عورت کی زندگی اُجاگر ہو جاتی ہے اور درسِ عبرت ہے۔ سفید کوہ کی ڈھلانوں پر پیدا ہونے والی ایک ننگرہاری عورت لڑکپن میں یتیم الطرفین ہو گئی تو اس کے رشتہ داروں نے اُسے ایک زخاخیل آفریدی کے ہاتھ بیچ دیا جو ہمارے خلاف لڑتا ہوا خیبر میں مارا گیا۔ اُس کے سُسر نے بمعہ ایک بیٹی فوراً ۱۰۰ روپے کے بدلے ایک بزوٹی اورکزئی کے پاس بیچ دیا۔ اس نے اسے اتنا زدوکوب کیا کہ وہ ایک دو ماہ بعد اپنی بچی چھوڑ کر تیراہ میں مانی خیل علاقہ کو بھاگ گئی۔ یہاں دو تین ماہ ٹھہری اور پھر برطانوی علاقہ میں رہائش پذیر ایک برمحمد خیل اورکزئی کے ہاتھ ۱۲۰ روپے پر بیچ دی گئی۔ وہ تین سال تک ہنسی خوشی اُس کے ساتھ رہی لیکن پھر بزوٹی اُسے لینے کے لئے آ پہنچا۔ برمحمد نے ۱۰۰ روپیہ دیا اور یوں جان چھڑائی۔ یہ ہے اس حشر کا ہلکا سا خاکہ جو سرحد پر 'بیوہ اور شادی شدہ خاتون' کا ہوتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ عورت حسنِ سلوک کے باوجود (جو اُسے عموماً حاصل ہو جاتا ہے بوجہ تربیت) ایک بکاؤ مال ہے۔ وہ دوشیزہ ہو یا بیوہ یا مطلقہ، اپنے مرد رشتہ داروں کی مرضی کے بغیر شادی نہیں کر سکتی۔ شوہر بلاوجہ اُسے طلاق دے سکتا ہے لیکن بیوی قوی ترین وجوہات کے باوجود طلاق نہیں لے سکتی۔ نظریاتی طور پر اس پر ایک ہلکی سی ترچھی نظر بھی پٹھان چاقو کو حرکت میں لے آئے گی لیکن برک کے اندازے کے برعکس جذبۂ جانبازی سے نہیں۔ روزمرّہ زندگی میں خریدی ہوئی چیز کی

کوئی قدر نہیں جب تک خریدار اُس کی شکل وصورت یا محنت سے مطمئن ہے وہ اسے رکھتا ہے لیکن اگر وہ دلکش نہ رہے یا ساس، بہنوں وغیرہ کے ساتھ لڑ پڑے یا بُرے دن آ جائیں تو وہ اُسے بھی جانوروں کے ساتھ ہی بیچ دیتا ہے۔

ایک اور نظریہ ہے کہ نسوانی بے حرمتی کا بدلہ خون ہے اور زنا میں دونو کا خون واجب ہے لیکن پٹھان اکثر انتقام کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اکثر وہ اُس کی ممکنہ قیمت کا بھی سوچتا ہے اور اُس کا فدا کار بڑھ کر بولی دے دیتا ہے لہٰذا وہ انتقام چھوڑ کر فیصلہ کر لیتا ہے۔ بعض قبائل (جیسے جنوبی خٹک) میں زنا اتنا عام ہے کہ عموماً عورت ایک دفعہ ضرور اغوا ہوتی ہے۔ وہ پہلے ایک منتخب شوہر کے ہاتھ بکتی ہے اور اُس وقت تک اُس کے ساتھ رہتی ہے جب تک فدا کار نہیں ملتا یا اغوا کنندہ نہیں آتا۔ بعد میں روپے کا لین دین اتنا عام ہے کہ پٹھان نے اُس کے لئے ایک خصوصی اور معنی خیز اصطلاح "شرمونہ" وضع کی ہے۔ اگر ماں دوبارہ شادی کرلے تو بیٹے کو ملتا ہے۔ بیوہ یا معمر ناکتخدا کے چاہنے والے کو اُس کے مرد رشتہ داروں کو یہ ادا کرنا پڑتا ہے خواہ وہ شادی کرے یا نہ کرے اور بہت سے شوہروں کو اسی کے بدلے اپنی خفت مٹانا ہوتی ہے۔ ٹکر سے ایک اور ظالمانہ مثال دیتے ہیں۔ ایک آفریدی سپاہی پر سرحد پار عورت کے ساتھ زنا کا الزام لگایا گیا۔ رشتہ داروں نے زانیہ کو مار دیا اور زانی سے ۳۰۰ روپیہ طلب کیا۔ زانی کے رشتہ داروں نے ۴۰ روپے پر ایک ہندوستانی عورت خریدی، اُسے ان کے گاؤں لے گئے اور

جھوٹ موٹ بتایا کہ وہ ان میں سے ایک کی بیوی تھی اور زانیہ کے کسی عزیز کے ساتھ بھاگ گئی تھی اور پھر اسے مار دیا اور شرمونہ طلب کیا اور یوں دونو مطالبے منسوخ ہو گئے۔

یہ عورتوں سے بدسلوکی کی اِنتہائی مثال ہے لیکن اِس میں شک نہیں کہ زوجہ فروشی، صنفِ نازک کو محض کھلونا یا بردہ سمجھنا اور دیگر پٹھان بُرائیاں عورت کو اِنتہائی پست اور حقیر مقام دیتی ہیں لیکن یہ نہیں بھُولنا چاہیئے کہ منظرِ عام پر صرف بدترین مثالیں ہی آتی ہیں اور اوسط پٹھان بیویاں اپنے اپنے گاؤں میں بیاہی جاتی ہیں، اپنے ہی خاندانوں میں رہتی ہیں اور اُمید رکھنی چاہیئے کہ اُن کی گھریلو زندگیاں باقی دنیا کی طرح ہموار و خوشگوار گذرتی ہیں۔

اُنتیسواں باب

مہمند

پشاور سرحد کے پٹھان سے اُس کے گرد و پیش کی طرف دیکھنا مقابلتاً خوشگوار ہوگا۔ اگر اُس کا علاقہ قطعہ جنت نہیں تو اُس کی اپنی دلکشی اور جاذبیت ضرور ہے۔ عدالت اور بازار (جو قتل اور رُسوائی کے مرکز ہیں) سے نکل کر گورکھتری کی پُرانی کاروانسرائے کی چھت پر جانا خوش آئند ہے جسے روایات کنشک کے عظیم وہار کے پہلو سے منسوب کرتی ہیں اور جہاں ماہرین مخفیات بُدھ سادھو دھرم کی تعلیم دیتے تھے۔ ہندو جوگی کی پوتر جگہ افغان پناہگزینوں کی اقامت گاہ بن گئی ہے اور اُس کی چوٹی سے وہ عظیم، تصویر خیز منظر نظر آتا ہے جو خٹک سلسلہ کی پتھریلی ڈھلانوں سے دریائے سوات و کابل کے کناروں اور دلدلوں، اور یوسفزئی وادیوں کے پاس سے ہزارہ کی سیاہ چوٹیوں تک پھیلا ہُوا ہے اور ہندوکش اور سفید کوہ کی برف اس کا پس منظر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حُسن وادی کا بیان بے حد دلکش ہے۔ اُس کے ہرے بھرے کھیت اور بے شمار آبی گذرگاہیں، اس کے دیہات اور پنڈ، ڈورے شہتوتوں، اناروں، چناروں اور بید کے درختوں میں آدھے چھپے ہُوئے اور اُس کے

باغات اور باغیچے اور بارہ کے نفیس ترین گلاب کے پھول : ایک ایسا منظر جو اس نقطۂ نظر سے پیکارِ مسلسل کی بجائے ' امن کا گہوارۂ قدیم ' معلوم ہوتا ہے ۔ لیکن وادیٔ پشاور کے مناظر بہت سے فنکاروں کے موضوع بن چکے ہیں ، سرحد کے اندر ہمارا قیام کافی طویل ہو گیا ہے اور اب اس کے ماورا لوگوں پر توجہ مرکوز کرنا ضروری ہے ۔

دوآبہ کو عبور کریں اور دریائے کابل و سوات کے درمیان شمال مغربی میدان سے یک لخت بلند ہونیوالی ننگی ، پتھریلی اور بے ڈھب پہاڑیوں میں آئیں تو یہ آزاد مہمندوں کا علاقہ ہے جو کثیر التعداد اور اہم ہیں اور ماورائے سرحد کا واحد قبیلہ جو افغان امیر کا برائے نام اطاعت گذار ہے ۔ یہ پست ، ننگی پہاڑیاں (جو ہندوکش کی آخری بیرونی شاخیں ہیں) بلند ہو کر ان سلسلوں تک پہنچ جاتی ہیں جو مہمندوں کو شمال میں باجوڑ اور اتمان خیلوں اور مغرب میں وادیٔ کنار سے جدا کرتے ہیں ۔ جنوبی سرحد تھوڑا سا ملا گوری علاقہ اور کابل کا راستہ خیبر ہے جلال آباد تک ۔ علاقے کا عمومی منظر انتہائی چٹیل ، سنگلاخ اور بے شجر ہے اور وادیٔ پشاور کی طرف جنوب مشرقی پہاڑیاں بالخصوص قریباً ناقابلِ رسائی ہیں ۔ بہترین حصے مغرب میں بیزائی پہاڑیاں ہیں جو باجوڑ سے دریائے کابل تک ہیں اور اس کے کناروں کے ساتھ ساتھ جلال آباد سے لالپورہ تک زرخیز میدان ہیں ۔ حمل و نقل کی چونگی ہو یا آبپاشی ، مہمندوں کی دولت کا بڑا سرچشمہ یہی دریا ہے ۔ ہم اپنی سرحد سے تین وسیع ترین وادیوں میں پہنچ سکتے ہیں ، یعنی شلمان ، گنداؤ (بدبو دار پانی کی وادی) اور پنڈیالی جن کی حفاظت علی الترتیب

مچنی، شبقدر اور ابزئی قلعے کرتے ہیں۔ یہ سال کا بیشتر حصہ قریباً خشک ہوتی ہیں اور برسات میں طوفانی نالوں میں بدل جاتی ہیں جن کے کنکریلے پاٹوں سے چٹیل ڈھلانیں بلند ہو کر چٹانیں بن جاتی ہیں۔ شمال میں باجوڑ اور جنوب میں لالپورہ میں کھلنے والی وادیاں بہتر ہیں لیکن خشک گھاٹیوں اور بنجر چٹانی پہاڑیوں کے یکے بعد دیگرے متوازی سلسلے علاقے کا طغرائے امتیاز ہیں۔ نوک دار گھاس، جھاڑ جھنکار اور چھوٹی کھجور کے علاوہ اور کوئی سبزہ نہیں۔ گرمی بہت سخت ہوتی ہے اور اُس وقت نشیبی علاقے مُضر صحت ہو جاتے ہیں۔

دو تین سڑکوں کو ہم نے بہتر بنایا ہے جیسے شنگئی سے ڈھاکا براستہ وادی شلمان، اور مچنی سے شلمان براستہ تاملو تین لیکن مجموعی طور پر یہاں سڑکیں نہیں ہیں اور صرف پگڈنڈیاں ہی پہاڑیوں کے نشیب و فراز کو طے کرتی ہیں۔ سڑکیں اور پانی یہاں کی اشد ضرورت ہیں۔ گرمی میں پانی ہر جگہ کمیاب ہوتا ہے اور پینے کا پانی بھی دُور دُور سے لانا پڑتا ہے، ایسے چشموں سے جو خود بھی غیر یقینی ہیں یا ایسے نالابوں سے جو آب باراں جمع کرنے کے لئے بنائے گئے ہیں اور پانی ڈھونے کا کام سراسر مستورات کے سپرد ہے۔

ایسے مُلک کے وسائل معدودے چند ہی ہوتے ہیں۔ فصلیں بارشوں پر منحصر ہیں اور اگر بارش نہ ہو تو پِٹنا یقینی ہے۔ گاؤں چھوٹے اور غریب ہیں اور ان کے اِردگرد کاشت کاری محدود ہے۔ گھاس، ایندھن، کوئلہ، کھجور کی چٹائیاں اور کچھ جانور اور بیزائی پہاڑیوں کا کچھ شہد اُن کی برآمدات ہیں۔ مہذبانہ مصنوعات اُنہیں خریدنا پڑتی ہیں۔ کاروبار میں وہ حمال ہیں اور کاچی قبیلہ پشاور

اور کابل کے درمیان اِسی کاروبار پر زندہ ہے اور لالپورہ اور مچنی کے سردار دریائے کابل سے آنے والے سامان اور اس میں چلنے والے ڈونگوں سے کافی چونگی وصول کرتے ہیں۔ باجوڑ یا گنیر سے پشاور کو جانے والے قافلوں کا حفاظتانہ ایک اور ذریعۂ آمدنی ہے اور ایک دو قبیلے سوات، بنیر یا باجوڑ سے عورتیں چرا کر آفریدیوں اور اورکزئیوں کے ہاتھ بیچنے کے لئے بدنام ہیں۔ عام سالوں میں بھی کافی آبادی بے سہارا ہوتی ہے اور موقعہ ملتے ہی ضلع پشاور کو ہجرت کرتی رہتی ہے۔ کئی نے نہر سوات پر زمینیں لے لی ہیں اور بہت سے ان کو رشک سے دیکھتے ہیں۔ بُرے وقت میں بیچارہ مہمند قحط سالی سے تنگ آ کر اور ہمسایوں کو لوٹنے کی اُمید پر کبھی کبھار اپنے قابو میں نہیں رہتا۔

جسمانی لحاظ سے بعض مستثنیات کو چھوڑ کر وہ عموماً اردگرد کے پٹھانوں سے کمتر ہیں اور گو وہ کبھی کبھار ہمارے خلاف ڈٹ کر لڑے ہیں تاہم ان کی ہمّت و جوانمردی مشکوک ہے۔ اُن میں غرور و نخوت تو بہت ہے، ظلم و فریب میں بھی وہ کافی مشہور رہیں اور دیگر پٹھانوں کی طرح وہ اپنی عزت کے بھی ڈنکے بہت بجاتے ہیں جس کی قلعی ایک سرحدی کہاوت سے کُھل جاتی ہے: "اپنی آنکھ میں ایک روپیہ رکھو اور کسی بھی مہمند مرد یا عورت کو دیکھ لو۔" باجوڑ اور گنیر کے ہمسایوں سے ان کے تعلقات اچھے ہیں، آفریدیوں سے ٹکرانے سے وہ گریز کرتے ہیں لیکن شنواریوں کے ساتھ صدیوں سے اُن کی جنگ چاولی چل رہی ہے اور لنڈی کوتل سے بشبولک تک کی صحرائی پٹی اُن کے حملوں اور جوابی

حملوں کی تباہ کاریوں کا مُنہ بولتا ثبوت ہے۔ نجی خُونی جھگڑے عام ہیں اور
چوٹوں کے جُرمانہ کی شرح نسبتاً کم ہے۔ دیگر سماجی و خانگی تقریبات میں وہ
یوسفزیوں سے مشابہ ہیں لیکن اُن کے ہاں حُجرہ (جو پٹھان نژاد نو کے مطابق
انگریزی کلب کا نعم البدل ہے) نہیں ہے جس کے فقدان کو پٹھان معاشرے
میں قریباً حیوانیت سمجھا جاتا ہے۔ مزید برآں ان کا قبائلی ڈھانچہ بھی دیگر قبائل
کے برعکس اشرافیہ ہے۔ وہ اپنے موروثی خوانین کے تحت ہیں جو امیرِ کابل
مقرر کرتا ہے اور وہ انہیں موقوف بھی کر سکتا ہے۔ ان میں سے اہم ترین
مشرق میں خانِ لالپورہ اور مغرب میں گوشتہ کے بیزائی خان ہیں اور ان دونو
کی ننگراہار یا ضلع جلال آباد میں جاگیرات ہیں۔

قبیلہ چار بڑے حصّوں میں تقسیم ہے۔ بیزائی تعداد میں سب سے زیادہ
ہیں لیکن حلیم زئی اہم ترین ہیں کیونکہ وہ اہم دَرّوں پر قابض ہیں۔ مجموعی متحارب
آبادی سترہ یا اٹھارہ ہزار ہے لیکن میدانِ جنگ میں کبھی اتنی نہیں آئی۔
ابھی تک وہ ہماری فوج میں بھرتی ہونے کے مشتاق نہیں گو وہ امیر کے
عساکر اور مقامی خوانین کے لشکروں میں ضرور بھرتی ہوتے ہیں۔ انگریزی
حکومت سے ان کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار نہیں رہے۔ الحاق پنجاب
کے بعد وہ کئی سال تک دردِ سر بنے رہے۔ ۱۸۶۴ء تک وہ مسلسل
مصروفِ یلغار و بیگار رہے اور اِکا دُکا برطانوی افسروں کو مارتے رہے۔
۵۲-۱۸۵۱ء اور ۱۸۵۴ء میں ان کے خلاف فوج کشی کی گئی اور ۱۸۵۵ء
اور ۱۸۶۰ء کے درمیان انہوں نے لوٹ مار یا بہیمانہ قتل کے لئے ضلع پشاور

کو نشانہ بنائے رکھا۔ ۱۸۶۳ء میں اخوند سوات نے ایلچی بھیجے تو ۵۰۰۰ مہمند میدان میں نکل آئے لیکن شدید نقصانات اٹھا کر شکست کھا گئے۔ عین اسی وقت ابیلاخیل نے دیگر قبائل کو خوب سبق سکھایا اور اُس وقت سے مہمند تاریخ نسبتاً امن کی تاریخ ہے۔ پھر بھی اُنہوں نے ۱۸۷۳ء میں میجر میکڈانلڈ کو مچنی میں قتل کر دیا، شب قدر میں کیپٹن اینڈرسن کو مارنے کی ناکام کوشش کی، ۱۸۷۹ء میں ہماری سروے پارٹی پر حملہ کیا اور ۱۸۷۸ء اور ۱۸۸۰ء کے درمیان تین دفعہ ہم سے ٹکر لی لیکن ڈھاکا میں ان کی فوج قریباً نیست و نابود ہو گئی۔ آخری جنگِ افغان کے بعد سے درّہ خیبر سے ملحقہ وادی شلمان ہمارے سیاسی اثر کے تحت ہے اور قبیلہ کا کردار بہتر ہو گیا ہے۔ ۱۸۸۲ء میں اُنہوں نے سر اُٹھانے کی کوشش کی اور ہماری کوئی بھی آئندہ مشکل اُن کے لئے زرّیں موقعہ ہو سکتی ہے۔

اُن کی جو شاخ وادیٔ پشاور کے جنوب مغربی کونے میں دلا زاک کو مستقلاً خارج البلد کر کے آباد ہوئی وہ اب کاملاً اپنے پہاڑی وطن اور رفقاء سے کٹ چکی ہے۔ اُن کی زمینوں کو دریائے باڑا سیراب کرتا ہے اور وہ بہترین کسان ہیں اور دریائے باڑہ کے آب شریک خلیلوں سے بہت پیش رفتہ ہیں لیکن آفریدی پہاڑیوں کے قریبی دیہات تکلیف دہ ہیں اور حال ہی میں ہماری سرحد کے اندر اُنہوں نے ڈپٹی کمشنر سے رجوع کرنے کی بجائے خود ہتھیار اُٹھانا بہتر سمجھا۔ خلیلوں کے ساتھ ان کا تنازع کیا ب یعنی پانی پر جھگڑا ہوا جو گھمسان کی جنگ میں بدل گیا اور آٹھ آدمی کھیت رہے

اور بہت سے زخمی ہوئے لیکن آخری فیصلہ ڈویژنل جج کی عدالت میں ہوا جس نے ایک گروہ کو پھانسی دے دی اور بڑے گروہ کو جلاوطن کر دیا۔

چار حصّوں کے علاوہ اِن کے کچھ موالی قبائل بھی ہیں جن میں سے دو زرعی لیکن قلیل التعداد ہیں۔ یہ دو دے زئی اور اتمان زئی ہیں جو شمال میں باجوڑ اور مشرق میں اتمان خیل کے درمیان رہتے ہیں۔ جنوب میں ملاگوری ہیں اور مغرب میں صافی ہیں جو خاصی تعداد میں ہیں اور مختلف النسل ہیں۔ وہ جلال آباد کی شمالی پہاڑیوں اور دریائے کنڑ کی بعض وادیوں میں مقیم ہیں۔ جغرافیائی لحاظ سے صافی مہمندوں اور کافرستان کے درمیان ہیں اور نسلی لحاظ سے وہ اِن دونو متضاد لوگوں کے درمیان رشتۂ اتحاد ہیں۔ شکل و شباہت سُرخ سفید، آنکھیں اور بال بھُورے اور زبان مہمند پشتو سے دُور کا ہی تعلق رکھتی ہے البتہ کابل کی وادی لُغمان کے دہگانوں کی زبان سے ملتی جُلتی ہے اور صافی اور دہگان دونو کافروں سے ماخوذ یا کم از کم مخلوط ہوئے ہیں اور نسبتاً نو مُسلم ہیں۔

بابر کے وقت وہ کافر کہلاتے تھے لیکن نادر کے وقت صافی جو بقول ہیسن قبولِ اسلام کے بعد ناصاف بُت پرستوں سے ممیز کرنے کے لئے رائج ہُوا۔ اب وہ بھی کٹر مسلمان ہیں لیکن بعض رسمیں قدیم ہیں اور سابقہ فنون کے آثار بھی موجود ہیں۔ اِن کی پہاڑیوں میں انگور بہت ہوتا ہے اور وہ شراب، سرکہ اور شہد پیدا کرتے ہیں۔ صافی بہت بڑے مکھی پال ہیں اور نرگس کی بھی فراوانی ہے۔

سیاسی لحاظ سے یہ طاقتور مہمند وفاقیہ ہماری سرحد کا ایک غیر تسلی بخش عنصر ہے۔ وہ افغانستان کے برائے نام ماتحت سہی لیکن ان کے جرائم کے لیے دربارِ کابل نے ہی رجوع کرنا پڑتا ہے اور امیر خود اِن پر کوئی موثر گرفت نہیں رکھتا۔ وہ اپنا مالیہ بھی نہیں لے سکتا۔ پچھلے چند سالوں سے وہ پشاور سرحد پر ہم سے پُرامن روابط بڑھا رہے ہیں۔ اگر وہ کسی وقت کابل سے ہمارے رسل و رسائل میں خلل انداز ہوں تو ہمیں اُن کو نیچا دکھانے کا اہل ہونا چاہیئے لیکن دیگر قبائل کی طرح بعض اوقات اَور موسموں میں یہ اچھا خاصا دُشوار کام بھی ہو سکتا ہے ؂

تیسواں باب
قبائلی جرگے

ہر پٹھان قبیلہ اپنی اپنی جگہ ایک علیحدہ جمہوریہ ہے لیکن ایک ایسی جمہوریہ جس میں انفرادی مفاد سب پر فائق ہے، خیل کی فلاح وبہبود درجہ دوئم پر آتی ہے اور مشترکہ خطرہ یا انتہائی سنگین حالات میں عارضی وحدت کے سوا قبیلہ بحیثیت مجموعی درجہ سوئم پر آتا ہے۔ جیسا کہ ایک پرانے میاں خیل نے کہا، وہ بدنظمی سے مطمئن ہے، جنگ کے خدشات سے مطمئن ہے، خون سے مطمئن ہے لیکن کسی آقا سے نہ مطمئن ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ اس کا علم الحکومت صرف اتنا ہے کہ ہر شخص اپنا قانون آپ ہو اور اسے زیادہ سے زیادہ ذاتی (شہری یا قومی نہیں) آزادی ہو۔ اوسط درجے کے خان کی عظیم ترین خوشی اسی میں ہے کہ وہ اپنا انصاف خود کرے اور اپنا انتقام خود لے۔ اگر اصل مجرم مل سکے تو فبہا ورنہ اس کے بھائیوں، رشتہ داروں، دور کے عزیزوں یا خود قبیلہ کو ہی نشانۂ انتقام بنائے۔ پٹھان خاتون بھی اس سے یہی توقع رکھتی ہے اور سرحد پار خاتون بھی ریاست میں ایک اہم عنصر ہے۔ وہ مغربی خاتون سے صرف نظریۂ رسوائی میں ہی مختلف ہے اور کیا سرحد کے دونو طرف بلکہ کرۂ ارض کے

دونوطرف گردوپیش کا معاشرہ ہی رسم ورواج کو جنم نہیں دیتا؟ بزبان بیکن "انتقام ایک قسم کا وحشیانہ انصاف ہے"۔ اور کچھ زیادہ دُور کی بات نہیں کہ ایلفنسٹن نے کہا کہ دو آدمیوں کا مقابلہ "انتقام کی ایک فیاضانہ اور منضبط شکل ہے" یہ ناممکن ہے کہ پٹھان ہو اور اُس کا کوئی خونی جھگڑا نہ ہو یا وہ اُس کا بدلہ نہ لے: یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک فرانسیسی ایڈیٹر یا ایک جرمن طالب علم یکّگی نہ کرے یا ایک آئرستانی محبِ وطن کرایہ نہ دے؟ ایسے ہی پٹھان پختون ولی سے کیسے معرّا رہ سکتا ہے؟

تاہم ضرورت نے دیگر اقوام کی طرح پٹھان کو بھی کوئی نہ کوئی طرزِ حکومت اختیار کرنے پر مجبور کیا، کوئی ایسا نظام جو اُس کے رواجی قانون کو نافذ کر سکے اور کوئی ایسی قبائلی تنظیم جو آڑے وقت اس کی پُشت پناہ بن سکے اور اُس کا قبائلی جرگہ یہ سب فرائض انجام دیتا ہے بلکہ ان کے علاوہ بھی۔ خوانین، ملاؤں اور معتبرین پر مشتمل ہونے کی بدولت یہ دارالامرا، مذہبی قائدین اور مقننہ کا مجموعہ ہے۔ یہ تحتی عدالتوں، عدالتِ عالیہ، شعبۂ تجارت اور محکمۂ جنگ سب کے فرائض بجا لاتا ہے۔ یہ اُس کی اجتماعی جلسہ گاہ بھی ہے اور مقامی عدالت بھی۔ غرضیکہ اس کا دائرۂ کار اوپر سے نیچے تک ہے۔ دیہاتی معاشرے کو متاثر کرتی ہوئی قبائلی رسمیں اور مقامی سیاست کافی مصروفیت آفریں ہیں: قرض، دستاویز، رہن اور بیع کے معاملات الگ ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ شاید مہذب ترین لوگوں کی طرح وحشی ترین لوگوں میں بھی قانون شخص کے خلاف جرائم سے زیادہ ملکیت کے خلاف جرائم پر زیادہ سخت ہے۔ سرحدی شہد

اِس قسم کے قانونی دستاویزات کا بیحد احترام کرتا ہے اور زمینی ملکیت کا پابند ہے۔ ایسے ہی مغرب کا باسی تیتر پکڑنے یا بوٹ چُرانے کی نسبت کہیں زیادہ آسانی سے (اور نہایت ارزاں) اپنی بیوی کو ٹھوکریں مار مار کر ادھ مُوا کر سکتا ہے یا اپنے بچوں سے بدسلوکی کر سکتا ہے۔

گو جرگے کا قانونی کاروبار زیادہ تر دیوانی ہے تاہم اس کے فوجداری اختیارات بھی ہیں۔ آفریدی یا یوسفزئی کے لئے بھی زندگی ہمیشہ نائو نوش یا لہو و لعب نہیں۔ انتقامی کارروائی یا دشمن کشی کبھی کبھار نمائندے یا عدالت کے ذریعے ہی ضروری ہوتی ہے۔ جہاں خونی جھگڑے اتنے عام اور تلخ ہوں کہ سالہا سال پس منظر میں رہنے کے باوجود ایک مقدس امانت رہتے ہیں اور بالآخر چکانے ہی پڑتے ہیں وہاں ایک فرد شاید اتنے بہت سے انتقام نہ لے سکے۔ اُن کا ہمہ وقتی تردّد اور پیش بندی زندگی کو بارِ گراں بنا دیتے ہیں لہٰذا پٹھان گھر بار چھوڑ کر ہندوستان آ کر ملازمت کر لیتا ہے یا جرگہ کے ذریعے مصالحت چاہتا ہے۔ وہ اکثر ترکِ وطن کو ترجیح دیتا ہے اور اس میں مستورات کا بھی لازماً ہاتھ ہوتا ہے۔

مشترکہ خطرہ کے پیشِ نظر یا مشترکہ مذہب کے دفاع کے لئے جرگہ بھی وسیع ہو جاتا ہے۔ حریف گروہ، خیل اور قبیلے آپس میں شیر و شکر ہو جاتے ہیں اور چھوٹے جرگوں کے منتخب افراد نمائندہ جرگہ بن جاتے ہیں۔ آفریدی غالباً منتشر ترین لوگ ہیں اور وہ عجیب طریقہ سے صلح کرتے ہیں۔ ہر قبائلی ایک پتھر لیتا ہے اور ہمسائے کے پتھر پر رکھ کر حلف اٹھاتا ہے کہ جب تک مشترکہ

مقصد حاصل نہ ہو اور یہ پھر نہ ہٹائے جائیں اُس وقت تک باہمی جدال و قتال معطل رہے گا اور سب اِس پر کاربند رہتے ہیں۔ جرگہ ننگی زمین پر بیٹھتا ہے اور دُعا مانگتا ہے کہ مسبب الاسباب اور مدبر الامور اللہ تعالیٰ ہے لیکن انسان پر غور و فکر لازم ہے اور پھر مُہم کا منصوبہ بناتا ہے۔ ہر قبیلے کی متحارب نفری کا بلحاظِ تعداد اور ہر گاؤں کے اعتبار سے فیصلہ کرتا ہے۔ ہر غازی آٹے اور بارود سے ایک بھیڑ کی کھال لیتا ہے جو عموماً مُہم کی طوالت کے مطابق ہوتی ہے۔ جرگہ توشہ خانہ یا حمل و نقل کا اہل نہیں ہوتا۔ معاہدے کے سلسلے میں بھی وہ یک جان رہتے ہیں اور اِس کا ثبوت ۱۸۸۱ء کا آفریدیوں کے ساتھ معاہدہ درّہ خیبر ہے۔ بلوچ سرحد پر مذاکرات سردار کے ساتھ ہوتے ہیں لیکن پٹھانوں کے ضمن میں جرگے ہی واحد قابلِ اعتماد ادارے ہیں اور گو یہ ہمیشہ نمائندہ نہیں ہوتے کیونکہ اصل رہنما پیچھے رہ جاتے ہیں اور کم اہم لوگوں کو مختار بنا دیتے ہیں تاہم جرگہ کے کئے ہوئے معاہدات عموماً واجب العمل سمجھے جاتے ہیں۔ بعض قبائل جیسے بنیر وال کے ہاں "قولِ مرداں جان دارد" کے مصداق قول مہذب اقوام کے بہت سے معاہدات سے بھی زیادہ محکم ہوتا ہے۔

پچھلے چند سالوں سے جرگہ کے عدالتی اور سُراغرسانی کے امور ضلع پشاور کے عدالتی نظام کا باقاعدہ حصہ بنا دیئے گئے ہیں اور ڈپٹی کمشنر کو اختیار ہے کہ وہ ان کے فیصلے تسلیم کرے اور ان کے مطابق سزائیں دے دے۔ جہاں ہماری پولیس سرحدی جرم کے اسرار و غوامض کو پانے سے عاجز آجاتی ہے اور ہماری انتظامیہ مشہور و معروف مجرموں کو بھی کٹہرے میں نہیں لا سکتی اور سزا نہیں دے

سکتی کیونکہ شہادتیں میسر نہیں ہوتیں وہاں سماعت بذریعہ جرگہ (بربنائے اصول چوروں کا سرغنہ کوتوال) اکثر کامیاب رہتی ہے اور مجرموں کو قرار واقعی سزا مل جاتی ہے۔

کبھی کبھار یہ عمل عجیب وغریب ہوتا ہے کیونکہ پشاوری مجرم کے طریقہ کار کو پٹھان ذہن ہی سمجھ سکتا ہے اور اس کے انتقام یا حرص کے آئندہ خطوط کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ کبھی کبھار جرگہ کے فیصلے ملکۂ معظمہ کی عدالتوں کو بھی ورطۂ حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ ایک حالیہ مثال یہ ہے کہ ایک بدترین غنڈہ سخت وحشیانہ قتل کا مرتکب ہوا۔ ہر قسم کا قیاس اس کے خلاف تھا لیکن براہ راست شہادت کا فقدان تھا (بارسوخ غنڈے کے خلاف شہادت ہمیشہ محفوظ نہیں ہوتی) لہٰذا ڈپٹی کمشنر نے اسے جرگہ کے سپرد کر دیا۔ غور وخوض کے بعد پورا جرگہ آیا اور اس کی بے گناہی کی قسم کھائی لیکن جلاوطنی کی سفارش کی۔ ڈپٹی کمشنر نے اتفاق کرتے ہوئے اس کو ضلع بدر کر دیا۔ جرگے نے اس کا پیچھا کیا اور جونہی وہ برطانوی علاقے سے باہر نکلا اسے خود ہی ٹھکانے لگا دیا۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ اگر ہم اسے مجرم ثابت بھی کرتے تو بھی ڈی سی اسے زیادہ سے زیادہ سات سال قید کر سکتا تھا۔ لیکن اس سے مسئلہ حل نہ ہوتا مگر برطانوی علاقے سے نکلتے ہی اختیار کردہ طریقہ کہیں زیادہ تسلی بخش تھا، ایک ایسا طریقہ جو عدالتی تو نہ تھا بلکہ انصاف کا ایک بھونڈا تصور جو ایک پٹھان جرگہ کو مطمئن کرنے کے لئے کافی تھا۔ 'نہ رہے بانس نہ بجے بانسری'۔

اکتیسواں باب

بنی یوسف (یوسفزئی)

اپنی جمہوریت پسندی کے باوجود پٹھان بہت سی باتوں بالخصوص حسب و نسب کے بارے میں آرٹستانی ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا سرحدی قبیلہ بھی ماضی بعید کے کسی مورث (خواہ فرضی ہی ہو) کی اولاد ہونے پر فخر کرتا ہے۔ اپنے آپ کو بنی اسرائیل کہنا تو عام ہے اور سفید ریش تو اپنی تاریخ ابراہیمؑ، اسحاقؑ اور یعقوبؑ تک لے جاتے ہیں۔ یہ نظریۂ نسبت کتنا بھی دُور کا رانہ ہو، بیلیو نے تفصیلاً بتایا ہے کہ ان میں اسرائیلیت کے آثار ضرور موجود ہیں بالخصوص اب زیرِ تبصرہ آنے والوں کی اِسمی مشابہت، امازی، موآبی، حلّی یا امازئی، محب وال، ہوتی وال، کوہ موزہ، کوہ پیہر اور میدان گگلی (جلالہ) میں ملتے ہیں، وادیٔ سدوم میں عیدِ فصح مناتے ہوئے، گناہ و شکر کے نذرانے پیش کرتے ہوئے یا لوگوں کے گناہوں سے لدی ہوئی بھیڑ کو قربانگاہ کی طرف ہانکتے ہوئے۔ لہٰذا کسی طویل شجرۂ نسب کو زیادہ تاریخی اہمیت نہیں دینی چاہیئے اور نہ ہی لوگوں اور اُن کے نام نہاد مورّخین کے اندھا دُھند عقیدے کو!

یوسف (زلیخا کے مشکوک رومان کا ہیرو نہیں بلکہ خاخائی کا پوتا جس کی اولاد نے

چار صدیاں پیشتر دلآزاک کو وادیٔ پشاور سے نکال دیا) کا کم ازکم ایک بڑا بھائی عمر نامی تھا جو نہایت لائق و فائق تھا، ہندوستان آیا، ایک خاتون سے شادی کی اور ایک عمر زدہ بیوہ اور بیٹا، مندڑ چھوڑ کر چل بسا۔ یوسف نے ادائیگی فرض کے لئے اور خاتون کے عدم میلان کے باوجود اپنے بھائی کی بیوہ سے شادی کر لی اور اُس سے یا دیگر بیویوں سے اُس کے پانچ مشہور بیٹے ہوئے۔ اُریا، عیسٰی، موسٰی، ملی اور اکو۔ ان سے اور مندڑ سے یوسفزیوں کے بے شمار قبائل چلے اور دریائے سوات سے لے کر کوہ سیاہ تک، دریائے سندھ کی ہزارہ طرف کے ساتھ ساتھ، ہماری سرحد کے ورا و ماورا میں : یہ علاقہ پٹھان رسم کے مطابق اسی قبیلہ سے موسوم ہو گیا۔ مندڑ نے بموجب داستان اپنے سوتیلے باپ کی ایک بیٹی سے شادی کی جس سے عثمان اور اُتمان پیدا ہوئے اور کوئی نصف درجن بیٹے ایک داشتہ، رزائی سے پیدا ہوئے۔ تین نسبتاً غیر معروف قبیلے اُلازئی، کمازئی اور اکازئی سرحد پار کوہ مہابن کی مشرقی ڈھلان کے ساتھ ساتھ دائیں کنارے تک آباد ہیں۔ چوتھے کا خدو خیل حصہ یا سدازئی اسی پہاڑ کی مغربی ڈھلان پر گدونوں اور وادیٔ چملہ کے درمیان آباد ہے۔ بیشتر کا بقایا ضلع پشاور کے جنوب مشرقی اور ہزارہ کے جنوب مغربی کونوں میں آباد ہے۔ ان کے قبیلے اب مغرب میں صوابی سے لے کر مشرق میں ہری پور تک پھیلے ہوئے ہیں۔

عثمان کی اولاد ان سے بھی زیادہ اور اہم ہے۔ ان کے دو بڑے حصے ہیں کمالزئی اور اُمازئی اور ان کے دو دو مزید حصے ہیں۔ ابتداً یوسفزئی

سرحد پر مشہور شیخ مُلی کی ہدایت پر ہر حصہ نے کوہ و میدان میں سے اپنا اپنا حصّہ لیا اور وقفوں کے بعد اَدل بَدل کرتے رہے لیکن آہستہ آہستہ یہ رسم بالخصوص برطانوی قبضہ کے بعد متروک ہوگئی۔ اہلِ میدان کی پہاڑی ملکیت نہ رہی تو برطانوی پناہ میں وہ زرخیز تر زمینوں پر قابض رہے اور ملک مندڑ یا میدانِ یوسفزئی میں آباد آلِ عثمان کو آلِ یوسف سے بہتر زمینیں ملیں۔ کمالزئیوں کے بڑے بڑے قصبے تورُو، مردان اور ہوتی ہیں اور امازئیوں کے رُستم اور چارغولئی جو زرخیز لیکن عجیب وغریب طور پر سدوم نامی وادی میں واقع ہیں۔ امازئیوں کی ایک شاخ نے ماورائے سرحد کوہ مہابن کی شمال مشرقی ڈھلانوں کو اپنا نام دیا ہے اور گو اَب بھی ان کے میدانی بھائیوں کے ساتھ سماجی روابط ہیں تاہم وہ سیاسی لحاظ سے بنیر وال کے ساتھ منسلک ہیں اور ان کا قبائلی سردار چرورَ ے میں رہتا ہے۔ داشتہ کے نصف درجن بیٹوں نے ایک قبیلہ بن کر اپنے کو اپنی والدہ کے نام رزائی سے موسوم کر لیا ہے اور ثانوی حیثیت میں دیہات اسماعیلہ اور شیوا وغیرہ میں امازئیوں اور اتمان زئیوں کے درمیان ٹھکانہ بنا لیا ہے۔

کم وبیش (گو ایک انتظامی رپورٹ کے مطابق اور صرف روشن پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے) مندڑ قبائل نے ہماری سرحد کے اندر اپنی شمشیر آزمائی کو قلبہ رانی میں بدل دیا ہے اور بقول بیلیو "جو کاشت کار کندھے پر بندوق لٹکا کر اور پہلو میں تلوار لیکر ہل چلانے جاتا تھا یا دن رات مسلح ہو کر کھیتوں پر پہرہ دیتا تھا، اب گاؤں سے بہت دُور زمینوں میں بیج بوتا ہے اور کسی تردد یا آزار کا شکار نہیں ہوتا۔" اُس کے بچے مویشیوں کو دیکھتے ہیں اور ڈھیریوں پر

کھیلتے ہیں جو کسی وقت مورچے تھے اور بڑی بوڑھیاں (اور بوڑھے بھی) "اسلحہ ناآشنا نوجوانوں کو آبا و اجداد کے بہادرانہ کارناموں کے روح افزود قصّے سنا کر محظوظ کرتے ہیں"۔ یہ صحیح ہے کہ بنی یوسف اِن فوائد کی وجہ سے بہت سی باتوں میں ایک عمدہ اِنسان ہے، ایک پُرامن، باسلیقہ اور محنتی پٹھان اور جہاں اسے نہری پانی اور موزوں زمینی بندوبست نصیب ہو وہاں تو وہ امیر اور خوشحال بھی ہے۔ اب اُس کے چولھوں اور فصلوں کے لئے نقارۂ جنگ پر چوٹ نہیں پڑتی لیکن یہ غالباً اُس کی امن پسندانہ صفات کا صرف شاعرانہ تصوّر ہے۔ اُس کی گرج نغمۂ فاختہ سہی لیکن وہ اتنا نہیں بدلا جتنا نظر آتا ہے۔

بنی یوسف کا بیشتر حصّہ ماورائے سرحد ہے۔ اُریا المعروف بہ بادی (ہوائی بوجہ تُندمزاجی) اپنے باپ کی بیوہ سے لڑ پڑا اور ملعون ہُوا۔ خاتون نے بددُعا دی کہ اُس کی اولاد تیرہ سے نہ بڑھے اور روایات کے مطابق بادی خیل اِتنے ہی رہے اور معدوم ہو گئے۔ عیسیٰ کے بارہ بیٹے ہوئے جن میں سے نو مولیشی پور مُغلوں سے ایک معرکے میں مارے گئے۔ بقایا تینوں سے حسن زئی، اکازئی اور مداخیل چلے جو مہابن اور دُمہ پہاڑوں کی شاخوں پر سندھ کے دائیں کنارے اور زیادہ تعداد میں اُس کے بائیں کنارے کی اگرور پہاڑیوں میں آباد ہیں اور بعض دوسروں کے ساتھ مل کر کوہ سیاہ کے قبائل کہلاتے ہیں۔ دیگر اہم یوسفزئی حصّوں کے مقابلے پر یہ تھوڑے اور غیر اہم ہیں گو انہوں نے کئی سال تک دیگر مضبوط تر قبائل کی نسبت یہیں

زیادہ تنگ کیا۔ حسن زئی ۱۸۵۱ء میں دو نہتے کسٹم افسران، کارن اور ٹپ کو مار کر سرحدی بدقماشوں کی صفِ اوّل میں آ گئے اور یہ دیدہ دلیری حالیہ کوہ سیاہ کے المیہ کی طرح ورائے سرحد ہوئی۔ ان کے دس تحتی حصے ہیں اور ان کی کل متحارب نفری شاید ۲،۰۰۰ بھی نہ ہو۔ ان میں سے منٹی بھیر خان خیل بہت تکلیف دہ ہیں اور ان کا سردار اب عملاً علیسٰی زئیوں کا سردار بن گیا ہے۔ اکازئی حسن زئیوں سے آدھے بھی نہیں لیکن پچھلے دس سالوں سے دردِ سر بن رہے ہیں جو اغلباً خان اگرور کی ترغیب کا اثر ہے۔

دیگر یوسفزئی قبائل کی طرح ان کی بیشتر بدعنوانیاں بھی اشتعال پیشہ مذہبی قائدین کی وجہ سے ہوتی ہیں جو مدّتِ مدید سے کشت و خون کے ذمہ دار ہیں۔ پریاری سادات کی وجہ سے ہی میجر بٹی اور کیپٹن اُرمسن کی جانیں ضائع ہوئیں۔ یہ پریاری سید کوہ سیاہ کے مشرقی پہلو کی ایک حقیر سی بستی کے ہیں، اگرور کے شمال میں اور قلعہ ترنڈ کے قریب ہیں لیکن یہ پٹھان اور سواتی مفروروں کا اڈا ہے اور یہ سید بہت بااثر ہیں۔ کوہ سیاہ کے یہ قبائل باہمی نفاق کے باوجود ہمارے خلاف ایک ہیں اور ۱۸۶۸ء کی حسن زئی مہم اور حالیہ مہم زیرِ کمان جنرل میکوئین کے سوا سزا سے محفوظ رہے ہیں کیونکہ ان کا علاقہ ناقابلِ رسائی ہے اور وہ اتنے حقیر ہیں کہ حملے کا جواز نہیں بنتا۔ ان کو سیدھا کرنے کا موثر ترین طریقہ یہی ہے کہ کوہ سیاہ اور اس کے قبائل کا الحاق کر لیا جائے، عین سندھ کے کنارے تک اور دربند سے سڑک نکالی جائے۔ یہ علاقہ ہمارے مطبوعہ نقشوں میں ہنوز خطۂ نامحرم دکھایا جاتا ہے اور اسی حماقت و جہالت کی وجہ

سے جنرل گلبریتھ کے لشکر کے بہادر میجر ہیلی کام آئے۔

آمدم برسرِ مطلب۔ موسیٰ کے ایک بیٹا تھا الیاس، جس سے پانچ خیل' الیاس زئی چلے۔ ان میں سے چار سالار زئی، گدائے زئی، اشا زئی اور نسو زئی بنیر میں ہیں اور مخو زئی کوہِ دو سرہ کی مشرقی ڈھلان پر آباد ہیں۔ ملی کی دو بیویوں سے چار بیٹے ہوئے اور ان کے دو خیل، دولت زئی اور نورا زئی بنیر میں ہیں۔ تیسرا چگرزئی بنیر اور سندھ کے دائیں طرف کوہِ دُمہ اور کوہ سیاہ کی مغربی ڈھلان پر آباد ہے۔ پس بنیر وال یوسف کے بیٹوں، موسیٰ اور ملی کے موجودہ ابناء اخلاف ہیں۔ وہ غالباً پوری شمال مغربی سرحد کے بہترین لوگ ہیں اور اپنے خاندان یا نسل کے سرتاج۔ پٹھانوں کے تمام محاسن اور بعض معائب کے ساتھ وہ پٹھانوں کے صحیح نمائندے ہیں اور ہم سے بالکل الگ تھلگ رہے ہیں۔

یوسف کے آخری بیٹے، اکو کی اولاد بہت پھلی پھولی۔ دو بیویوں سے اُس کے نصف درجن بیٹے ہوئے اور اُن سے کئی اہم خیل چلے، جیسے (۱) خوازو زئی کے چھ تحتی قبیلے ہیں جو وادیٔ سوات کے دائیں حصہ، اس کے شمال میں دیر اور دیر کو چترال سے جُدا کرنے والے پہاڑوں تک آباد ہیں۔ قبیلۂ ملی زئی اپنے سردار خازن خان کے تحت دیر اور وادیٔ پنجکورہ تک قابض ہے یعنی کافرستان اور کشکر کی سرحدوں تک (۲) بزید زئی یا بیزئی کے سات حصّے مردان کے اوپر وادیٔ لنڈ خوڑ، سوات کا بایاں کنارہ، کوہِ دوسرا کی شمالی ڈھلان، سطح مرتفع مورہ بند، سندھ میں گرتی ہوئی وادیوں اور کوہستان

میں آباد ہیں جو یوسفزئی کو گلگت سے جدا کرتا ہے (۳) رانی زئی اتمان خیلوں کے ساتھ ہی وادئ سوات کے مغربی کنارے پر مقیم ہیں۔

یہ تھے بنو یوسف بموجب اخوند درویزہ جو اِن کا عالم اجل، مورخ اور ولی تھا اور یہ تھی سرحد پر ان کی تقسیم - اِدھر اُدھر دوسرے پٹھان قبیلے بھی ہیں اور ہندو، ہندکی، گوجر، کشمیری وغیرہم جو مجموعی طور پر یوسفزئیوں سے زیادہ ہیں۔ یہ اصلی باشندوں کی اولاد ہیں یا آبادکار ہیں اور جابجا اپنی مذہبی رسومات اور قومی خصائص کے مطابق اپنے علیحدہ معاشرے قائم کئے ہوئے ہیں۔ ہندو بالخصوص مرفہ الحال ہیں اور متعصب ترین مسلمانوں میں بھی وہی بیشتر تجارت پر قابض ہیں۔

اِن کے علاوہ مشرقی کونے میں گدون یا جدون یا بدون ہیں اور مغرب میں اتمان خیل ہیں جو یوسف زئیوں سے دُور کا نسلی تعلق بھی نہیں رکھتے لیکن اِنہی سے مربُوط ہیں اور اِنہی کے ضمن میں آ سکتے ہیں۔

بیلیو کے اندازہ کے مطابق یُوسفزئی کوئی ڈھائی لاکھ ہیں اور بیشتر حصّہ ہماری سرحد کے اندر ہے۔ ۳۰،۰۰۰ سرحد پار اور ۳۴،۰۰۰ اندرون سرحد متحارب ہیں گو اوّل الذکر وسیع علاقے پر پھیلے ہُوئے ہیں۔ تاجر کی بجائے کاشت کار وہ اپنے کھیتوں اور ریوڑوں پر گذر اوقات کرتے ہیں لیکن وہ اپنی شورش پسندی اور حکومت گریزی کے لئے ہمیشہ مشہور رہے ہیں۔ اُوپر بتایا گیا ہے کہ وہ ایک ہی رشتۂ حسب ونسب میں منسلک ہیں لیکن ان کے

مختلف قبائل اور خیل اپنے اپنے سرداروں کے تحت جدا جدا ادارے ہیں جن
کے مفادات مختلف ہیں اور باہمی حسد و رقابت میں مبتلا ہیں۔ باقاعدہ حکومت یا
قبائلی تنظیم سرے سے معدوم ہے۔ یوسف کا ہر صاحب مقدور بیٹا اپنے پاؤں
پر کھڑا ہے اور مخلوط آبادی سے جو کچھ ممکن ہو اینٹھتا ہے، بزگر سے ایک
تہائی یا ایک چوتھائی فصل لے لیتا ہے اور کسی آقا یا حکمران کو تسلیم نہیں کرتا البتہ
اخوند کا ضرور معتقد ہے۔ لیکن غیر ملکیوں کے خلاف وہ اپنے اختلافات مٹا دیتے
ہیں اور اغلب ہے کہ وہ حملہ آور کے خلاف ایک فردِ واحد کی طرح کھڑے ہونگے:

بتیسواں باب

سوات، پنجکورا اور بجوڑ

یوسفزئی علاقے کا جنوبی نصف برطانوی قبضہ میں ہے اور صرف وہی اہلِ یورپ کے لئے کھلا ہے۔ ماورائے سرحد علاقہ ہندو کو اور رہابن پہاڑوں کے شمال میں ہے اور اس کے متعلق معلومات محدود اور غیر یقینی ہیں اور ان کا بہترین حصہ بھی ڈاکٹر بیلیو کی رپورٹ میں ہے۔ مردان کے طویل قیام اور پشتو کے غیر معمولی علم نے اسے بہترین مقامی ماخذ تک رسائی بخشی اور ایک دلچسپ علاقے کے دلچسپ لوگوں کا فرحت بخش اور تصویر نمایاں ایک معیاری اور مستند کارنامہ بن گیا ہے۔ طبعی لحاظ سے یہ سرحد کے دشوار ترین علاقوں میں سے ہے۔ یہ ایک پیچیدہ مجمع الجبال پر مشتمل ہے جسے گہری لیکن زرخیز وادیاں کاٹتی ہیں اور باری باری سے مسلسل پھیلتی ہوئی پامیر یا سقفِ عالم، میں کھو جاتی ہیں جہاں سے ایشیا کے مشہور ترین کوہستانی سلسلے نکلتے ہیں۔ لہٰذا اِس کے گرد گھوم کر اور عقب سے اسے فتح کرنا براہِ راست حملے سے بھی زیادہ مشکل ہے۔

یہ طبعی دشوار رسی اور لوگوں کی انتہائی فطرت افسوسناک ہیں کیونکہ یہ علاقہ

دلچسپیوں کا مرقع ہے۔ بہشت تصور نہ سہی پھر بھی اس کی بہت سی وادیاں دودھ، شہد، اناج اور گھی کی نہریں ہیں۔ اس کی پہاڑی چوٹیاں قیمتی جنگلات سے مملو ہیں جو سیراب وادیوں میں پھلوں کے درخت بن جاتے ہیں۔ اس کی آب و ہوا گرمی میں بھی معتدل ہے اور امکانات وسیع ہیں۔ اس کے کئی حصے قدیم آثار سے بھرپور ہیں۔ سوات اور بجوڑ کے کھنڈرات یونانی، بدھ اور ہندو لوگوں کی سابقہ موجودگی کے مظہر ہیں اور یونانی اور پالی کی الواحِ مرقوم (جو سال بسال تعداد و قیمت میں کاہش پذیر ہیں) کا سائنسی مطالعہ اس حصہ کی قدیم تاریخ پر بہت روشنی ڈال سکتا ہے۔

اگرچہ مختلف وادیوں کے لوگ باہمی طور پر مختلف ہیں (اپنے محدود ماحول سے باہر کی دنیا سے برائے نام رابطہ اور اپنے ہی کنبہ تک محدود رشتوں ناطوں کی وجہ سے ان میں اتنا باہمی فرق ہے کہ وہ ہم نسل معلوم نہیں ہوتے) پھر بھی وادیاں ایک دوسرے سے بہت قدرتی مشابہت رکھتی ہیں اور ان میں سے ایک دو کا مختصر تذکرہ مفید ہوگا جو سرحد کے نقطۂ نظر سے نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں سے اہم ترین، وسیع ترین، زرخیز ترین اور مالا مال لیکن مضر ترین اور دشوار ترین وادی سوات ہے۔ دریائے سوات نے اسے یہ نام دیا ہے جو ایرین کا سُواستوس ہے۔ یہ قلعہ ابازئی کے قریب برطانوی علاقہ میں داخل ہوتا ہے اور پنجکورا (قدیم گرائوس) سے سنگم تک ایک تیز، گہرا نالہ ہے جو عمودی کناروں کے اندر بہتا ہے۔ ارد گرد کی پہاڑیاں صرف پیادہ کے لئے ہی بمشکل قابلِ گذر ہیں کیونکہ یہ اتمان خیلوں کے تصرف میں ہیں۔ پنجکورا سے سنگم کے بعد کوئی ستر میل شمال مشرق

تک وادئ سوات ہے جسے گھاٹیاں کاٹتی ہیں۔ یہ کہیں کہیں دس میل اور کہیں صرف چند سو گز چوڑی ہے اور یوں اس کے قدرتی خطے بنتے ہیں یعنی رانی زئی، سواتِ زیریں (زیریں سوات) اور بر سوات (بالائی سوات)۔ اس سے آگے کا شمال مشرقی علاقہ کوہستانِ سوات ہے اور ایک مختلف نسل کا گھر ہے جو یوسفزئیوں سے زیادہ یاسین، گلگت اور چترال کے لوگوں سے مشابہ ہے۔ برف پوش پہاڑوں کے سلسلے سوات کو محصور کئے ہوئے ہیں اور صرف چند قابلِ گذر دروں سے اس میں پہنچتے ہیں۔ ایک مہیب درہ موسومہ بہ لُونی اسے پنجکورا کی وادیوں کے جال سے علیحدہ کرتا ہے۔ کوہستانِ شمال مشرق میں برفزاروں اور گلیشیروں کے اُوپر ۲۰,۰۰۰ فٹ تک بلند چوٹیوں تک پہنچتا ہے۔ جنوب مشرق میں غوربند اور ایلم اس کے اور سندھ کی وادیوں کے درمیان رکاوٹ کو کاٹتے ہیں اور کوہ مورا اس کے اور برطانوی علاقہ کے درمیان واقع ہے۔ قابلِ گذر درے اسی کوہ مورا میں ہیں۔ ضلع پشاور سے رانی زئی علاقہ کے بیچ میں سے گذرتا ہوا درہ مالاکنڈ کافی آسان ہے، بیزئی علاقہ سے گذرنے والا درہ مورا نسبتاً مشکل ہے اور درہ شاہکوٹ مزید مشکل ہے!

یوسفزئیوں کے ذکر میں آ چکا ہے کہ سوات بھر میں آبادی اکوزئی حصہ کی ہے۔ خوازوزئی عموماً وادی کے شمال میں، رانی زئی معزولی بہرے پر اور بیزئی بائیں کنارے پر کافی دُور تک آباد ہیں۔ مؤخرالذکر دو نو سلسلۂ مورا کے جنوب میں لندخوڑ وادی کے پاس ہماری سرحد تک پھیل گئے ہیں اور وہاں سمہ (= اہلِ نشیب) بمقابلہ باز (= اہلِ فراز) کہلاتے ہیں لیکن وادئ سوات کے

قدرتی خطے چھوٹی سے چھوٹی گھاٹی تک مختلف قبائل کے مسکن ہیں اور اُن کے جتنے گاؤں ہیں اتنے ہی گروہ ہیں بلکہ ہر گروہ کے اندر بھی اپنے اپنے سردار کے تحت باہمی خلفشار بھی برپا ہے اور ہمسایوں کے ساتھ بھی پیکار و کارزار ہے۔

ساری وادی خوب مزروعہ اور گنجان آباد ہے، ہر وادی یا گھاٹی کا اپنا گاؤں ہے اور مجموعی آبادی ایک لاکھ سے کچھ ہی کم ہوگی۔ کھیت چبوترہ بر چبوترہ ہیں اور دریائی نالیوں یا قدرتی نالوں سے سیراب ہوتے ہیں۔ دریا کی گذرگاہ کے ساتھ ساتھ بھی وادی کے پہلو بہ پہلو بے شمار گاؤں، درختوں کے جھنڈ اور قریباً مسلسل کاشت کاری ہے۔ قبرستان بھی (جنہیں پٹھان اتنا مقدس سمجھتے ہیں) ہل کے پھالے کی زد میں آجاتے ہیں اور مُردوں کو غیر مزروعہ زمینوں میں دفنا دیتے ہیں۔ قابلِ کاشت زمین کا ایک گز بھی بمشکل ہی خالی ہوگا۔ گندم، اناج، نیشکر، لوسن، تمباکو، سبزیات کی خوب پیداوار ہے اور بالائی سوات میں عمدہ ترین پھل ہوتے ہیں۔ گرمی میں (جب وادی کا بیشتر حصہ سیراب ہو سکتا ہے) دریا کے قریب کی زمینیں دھان کی ایک چادر بن جاتی ہیں جس کی بھاپ وادی کو مضرِ صحت بنا دیتی ہے۔ یہ انتہائی تصویر خیز ہے: پہاڑوں کے بالائی حصے صنوبر یا دیودار کے جنگلات سے بھرے ہوئے ہیں اور نیچے دیدہ زیب، مخملیں گھاس کا فرش بچھا ہوا ہے اور تختہ ہائے کاشتہ ہیں جن کے آس پاس مکانات بھی ایستادہ ہیں، بے مایہ قسم کی جھونپڑیاں لیکن فنکارانہ طور پر چناروں کے جھنڈ میں نیم پوشیدہ؛ اور براق و شفاف ندیاں ہر جگہ تیز و تند اور شور ریلے سوات سے ملنے کے لئے بیقراری سے بڑھتی ہوئی اور اس کے چٹان آلود

پاٹ سے ٹکراتی ہوئی! لیکن اِس حُسن کا عیب ہے تو بس یہی غیر صحت بخشی! بلند سلسلوں میں محصور، یہاں سردی میدانوں کی نسبت معتدل ہے، کہر کم اور ہوا کمتر، قریباً بادِ نسیم سے بھی محروم، یہ پٹھان سطح مرتفع کا اُلٹ ہے اور موسم گرما مُسلسل بھی ہوتا ہے اور تکلیف دہ بھی! پہاڑیوں سے ٹکرانے والے طوفان گرم بھاپ کی فضا پیدا کرتے ہیں اور دھان کے ملیریا سے مل کر مختلف بخار لاتے ہیں جو سب باشندوں کو متاثر کرتے ہیں اور اُنہیں رنجور رکھتے ہیں۔ مرد بالخصوص کمزور، دُبلے اور لاغر ہیں اور ڈھانچے یا خدوخال میں پٹھان معلوم نہیں ہوتے بلکہ زیریں پنجاب کے گوجر کے پتلے معلوم ہوتے ہیں۔ اِس کے برعکس عورتیں کم متاثر ہوتی ہیں اور مضبوط، مُحکم اور گداز ہیں اور خوبصورت نہ ہونے کے باوجود وضع قطع میں پٹھان معلوم ہوتی ہیں۔ مزید برآں اُنہوں نے عام پٹھان معاشروں کے برعکس یہاں کا صنفی ڈھانچہ ہی بدل دیا ہے۔ وہ نہ صرف بے حجاب پھرتی ہیں اور زیادہ آزاد ہیں بلکہ وہ مردوں پر حکومت کرتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وادیٔ سوات کے مرد کافی حد تک محکوم زن ہیں۔

لیکن سوات بہت سوں میں سے صرف ایک دریا ہے جو بالآخر ایک اور دریا میں مدغم ہو جاتا ہے۔ پانچ ایسے بڑے دریا مل کر پنجکورا (یا پنجند) بناتے ہیں جو ایک ندی کا نام بھی ہے جو باجوڑ اور تالاش کو ملا کر سوات سے مل جاتی ہے۔ سب کم و بیش تنگ، پہاڑیوں میں محصور وادیاں بلکہ وادی در وادی ہیں اور ان کا رُخ شمال مشرق سے جنوب مغرب کو ہے۔ سوات کا بیان سب پر صادق آتا ہے۔ چبوترہ دار کاشت کے دیہات،

عقب میں سلسلۂ کوہ، سامنے ایک جوئے سیم رواں دواں جو برف پگھلنے پر ناقابلِ گذر ہو جاتی ہے، علاقہ بھی یکساں طور پر زرخیز اور کسان عمدہ تر، آب و ہوا بہتر، سردی سخت تر اور گرمی صحت بخش! بہبات کا علاقہ جہاں ایک روپے کی ۹۰ پاؤنڈ گندم ملتی ہے، تین روپے کی چربیلی بھیڑ، پندرہ روپے کی بھینس اور جہاں چربی کی کثرت کی وجہ سے صابن بنا لیا جاتا ہے جو پٹھانوں میں جنسِ نایاب ہے اور یوں لوگ اپنی ہی تہذیب کے مالک ہیں! ایک اور لحاظ سے بھی بے نظیر یعنی یہاں آنے والے تاجروں اور سیاحوں کے لئے لوگ چشم براہ رہتے ہیں۔ البتہ انہیں وہاں پہنچنے کا عزم چاہیئے کیونکہ یہاں سڑکیں نہیں ہیں، صرف کنارِ دریا کی عمودی ڈھلانوں کے ساتھ ساتھ پیچدار پگڈنڈیاں ہیں اور دریا صرف پیادہ کے لئے قابلِ گذر ہیں یا جانوروں کے قافلے کے لئے اور سیلاب یا برف کی صورت میں بالکل ناقابلِ گذر! تاہم سوات اور پنجکوڑا سے چترال کو ایک کاروانی راستہ ضرور جاتا ہے ترکستان تک جو تین ماہ کی مسافت ہے!

یوسفزئی کا شمالی سرا لاؤری سلسلہ کے دامن میں دیر کی وادی یا وادیاں ہیں جو بڑا قصبہ اور خان کی قیام گاہ ہے جو ملی زئی حصہ کا سردار ہے اور جس کا اختیار سوات سرحد سے مغرب میں کنڑ اور باجوڑ کو جانیوالے دروں تک محیط ہے اور یہ یوسفزیوں کی انتہائی حدود ہیں۔ قصبہ دیر میں قلعہ بھی ہے اور یہ بہت بڑی منڈی ہے جہاں شمال کی پیداوار چترالی لاتے ہیں اور جنوب کی پیداوار یوسفزئی اور خٹک لاتے ہیں اور اُن کا تبادلہ ہوتا ہے۔

چھوٹی وادیوں کو چھوڑ کر جیسے تالاکش (جو سوات کے ساتھ ساتھ اناج گھر ہے) یا یکساں طور پر پیداور براول کو نظر انداز کر کے، ایک راستہ میدان سے حدود یوسفزئی کو پار کر کے باجوڑ میں جاتا ہے جو مقابلتاً کھلا علاقہ ہے اور وادی کہیں کہیں پندرہ میل تک چوڑی اور کوئی چالیس میل لمبی ہے۔ یہاں بھی قدرت فیاض ہے، اناج کی تجارت زوروں پر ہے، جانوروں کی وسیع چراگاہ ہے لیکن زیادہ تر لوہے کے لئے مشہور ہے جو پشاور کو بھیجا جاتا ہے۔ یہ لوہا دریا آوردہ ریگ سیاہ سے نکالا جاتا ہے اور کوئلے سے ملا ہوا ہوتا ہے۔ یہ پشاور میں تین تا چھ روپے من یا ۸۰ پاؤنڈ بکتا ہے۔ پاس کی پہاڑیوں میں شاہ بلوط اور صنوبر کے جنگلات ہیں اور آب و ہوا کابل جیسی ہے۔ کچھ عرصے سے امیر اس پر قدرے ناخوشگوار توجہ دے رہا ہے تاکہ اسے اپنی گرفت میں لے آئے گو یہ اب تک آزاد ریاست رہا ہے اور صرف بامر مجبوری گاہے ماہے کابل کو خراج دیتا رہا ہے۔ غالب لوگ ترکولانی ہیں جن کے دس تا پندرہ ہزار جنگ آزما ہیں اور جن کا سردار 'باز' یا بادشاہ کہلاتا ہے۔ باز کو زندگی اور موت کے اختیارات حاصل ہیں، وہ جرگہ سے بالا ہے اور وہ واز مالیہ کا مالک ہے جو ہندکیوں پر ٹیکس اور رود باریوں (وادی کی کثیر التعداد دوغلی نسل جو غالباً اصلی باشندے ہیں اور اب ترکلانیوں کے تابع ہیں) سے خراج پر مشتمل ہے۔ یہ مطلق العنان حکومت یوسفزئیوں کی ریت کے خلاف ہے جن کے ساتھ یہ لوگ دیگر امور میں بے حد مشابہ ہیں۔

ان کے مغرب میں دریائے کنار اور کافرستان ہے اور بجوڑی کافروں سے

برسرِ پیکار رہتے ہیں اور موقعہ ملنے پر غلام بنا کر لے جاتے ہیں۔ مشرق میں بجوڑ اور ہماری سرحد کے درمیان اتمان خیل کی پہاڑیاں ہیں جو مہمندوں اور یوسفزیئوں کے درمیان واقع ہیں۔ ہماری سرحد سے کوہ مورا تک کا علاقہ لارمن یا دامن کہلاتا ہے اور بہت سے قبائل اس پہاڑ کی وادیوں میں مقیم ہیں۔ علاقہ انتہائی دشوار ہے۔ گھوڑوں کے لئے سڑکیں نہیں اور تیز و تند سوات کو پار کرنے کے لئے صرف چند رسے کے پُل ہیں۔ اتمان خیل کے جنگ آزما ۵٬۰۰۰ سے کم ہیں اور وہ غیر اہم بے اثر اور کمزور ہیں۔ علاقہ مہمندوں جیسا ہے، کاشت کم ہے اور لوگ پشاور میں مزدوری کر کے پیٹ پالتے ہیں لیکن وہ اِردگرد کے پٹھانوں (مہمند، بجوڑی، یوسفزئی) سے مختلف ہیں اور اتمان بابا کے پانچ بیٹوں کی اولاد کہلاتے ہیں جو محمود کے ساتھ آیا اور ۱۷۹۹ء کے قریب وادیٔ پشاور میں آباد ہوا۔ انگریزی قبضہ کے وقت وہ خاصے تکلیف دِہ رہے اور مفروروں کو پناہ دیتے رہے اور ۱۸۵۲ء میں سر کولن کیمپ بیل نے انہیں ناک چنے چبوائے۔ ۱۸۷۶ء میں نہرِ سوات کی تعمیر پر وہ ٹوٹ پڑے اور سٹھان قلیوں کو مار دیا لہٰذا ۱۸۷۸ء میں کاؤ گنڈی گائیڈز کا ایک دستہ لے گیا اور اچانک حملہ کر کے اُن کے سرغنے مار دیئے اور پورا انتقام لیا۔ اُس وقت سے وہ پُرامن ہیں۔ وہ سخت جان پہاڑی قزاق ہیں، طویل القامت، مضبوط، سرخ سفید، سنجیدہ اور محنتی، پٹھانوں کے برعکس کمر کے اوپر ننگے اور زیادہ مہذّب نہیں۔ وہ دیہات کی بجائے اطرافِ کوہ پر مکانات کے چھوٹے چھوٹے مجموعوں میں رہتے ہیں اور اپنی دشوار رسی میں مست و محفوظ ہیں!

تینتیسواں باب
بنیر اور بنیر وال

اگر سرحد کے کسی نقشے یا انڈیا آفس کے کسی مشہور جہازی نقشے کو بھی دیکھیں تو کافرستان اور کشمیر کے درمیان ہم صرف یوسفزئی چھپا ہوا دیکھ کر یہ کبھی نہیں سمجھ سکتے کہ سوات کے یوسفزئی اپنے بنیری رشتہ داروں سے سندھ میں گرنے والی وادیوں کے ذریعے جدا ہیں، ایک سلسلۂ کوہ جو کم از کم ۲۰ میل چوڑا ہے اور جس کی چوٹی ایلم نو ہزار فٹ اور دوسرا دس ہزار فٹ سے بلند تر ہے گو قابلِ گذر درے ضرور موجود ہیں۔ ممکن ہے ان کی بنیادی یگانگت ہنگامی ضروریات کے تحت انہیں متحد کر دیتی ہو لیکن بنیر اور اس کی وادیاں درحقیقت ایک علیحدہ علاقہ ہیں اور قبائل بنیر وال ہیں۔

جغرافیائی لحاظ سے سندھ پر تربیلا اور دائیں کنارے پر ہماری سرحد سے شروع ہو کر جدون علاقہ کوہ مہابن کی چوٹی بلکہ اُن چوٹیوں اور سلسلوں تک جاتا ہے جو سندھ سے ۷،۰۰۰ فٹ اونچے ہیں اور مورا یا ایلم کی شاخ کی حیثیت سے پچھلی طرف کو پھیلتے ہیں۔ یہ ایک کلاسیکی سرزمین ہے، ابتدائی آریوں کا عظیم جنگل، سنسکرت کا سینائی جہاں ارجن دیوتا دُن

سے لڑا اور یہودی یعقوب کی طرح شکست کھا کر بھی اپنا ناقابلِ تسخیر اور زادلے گیا۔ سرزمین اگر سکندر کا آرنوس نہ ہو تو بھی زیادہ دور افتادہ نہیں، جو ۶۳۰ء میں ہیون سانگ کی آمد پر اپنی خانقاہوں (مہاوُن) کے لئے مشہور تھی اور اب بھی کھنڈرات سے پٹی پڑی ہے۔

اِس پہاڑی کی جنوبی ڈھلان کے جدون یوسفزئی نہیں بلکہ ان سے دُور کا تعلق بھی نہیں رکھتے بلکہ ان کا نام ہندوستانی ماخذ کا مظہر ہے اور گو اغلباً وہ راجپوتوں کے باقیات ہیں تاہم وہ اپنے ہمسایوں کے دُکھ سُکھ کے ساجھی ہیں۔ مغرب کی طرف خدو خیل ہیں اور سلسلہ کے دُوسری طرف چملہ وادی ہے جس کا مشرقی سرا سندھ سے ملتا ہے اور امازئی علاقہ کہلاتا ہے۔ کوہ گُردُو کی شاخ چملہ وادی کو بنیر سے الگ کرتی ہے اور یُوں ایک بیضوی میدان بنتا ہے جس کے وسط میں برندُو ندی بہتی ہے۔ اِس سے پرے بھی تین چار تنگ، گہری اور پیچدار وادیاں ہیں جو اِتنے ہی سلسلوں کے درمیان واقع ہیں اور جن میں سندھ کے معاون بہتے ہیں۔ اِن میں سے بڑے بڑے پُوران، چکیسر، کانا اور غوربند ہیں۔ غوربند اِس کے سرے کے پہاڑے موسوم ہے اور یہ سب دشوار رس ہیں۔ یہ قبائل مجموعی طور پر بنیر وال کہلاتے ہیں، کثیر التعداد ہیں اور جیسا کہ پہلے ذکر ہُوا یوسف کے بیٹوں موسیٰ اور ملی کی اولاد سمجھے جاتے ہیں۔ امازئی اور خدوخیل مندڑ کے اخلاف ہونے کی وجہ سے ان کے دُور کے رشتہ دار ہیں لیکن سیاسی لحاظ سے سب بنیر کے زیرِ اثر ہیں۔ سوائے آب و ہوا کی خصوصیات بنیر میں بھی موجود ہیں گو موخر الذکر زیادہ کشادہ، زیادہ صحت بخش اور خزاں میں کم بخار زدہ ہوتا

ہوتا ہے۔ یہ بھی ویسا ہی زرخیز ہے لیکن مویشیوں میں امیر تر اور غلّے میں غریب تر ہے اور درآمد کرتا ہے۔ اس کے اردگرد کے سلسلے اور آمد و رفت خاصے مشکل ہیں اور صرف اُنیس بیس کا فرق ہوگا۔ دونوں میں برطانوی علاقے سے براہِ راست داخلہ آسان ہے۔ آسان ترین راستہ وادئ لندخوڑ کے سرے پر واقع غازی بالا سے بَیزئی میں ملی اور شیر خانہ کے پاس سے اور بازدرہ (جو مشکلات کا مظہر ہے) سے ہوکر بنیر کے ضلع سالارزئی میں جاتا ہے۔ دوسرا زیادہ تر تاجروں کے استعمال میں ہے اور وادی سدوم میں رستم سے درّہ ملندری کے ذریعے بنیر کے ضلع نورازئی میں جاتا ہے۔ تیسرا راستہ ابیلا (قدیم فارسی میں گینڈے کا درّہ) کا ہے براستہ وادئ چَلہ۔ ابیلا ۱۸۶۳ء میں میدانِ جنگ بنا رہا۔ آخری راستہ مشرق میں سندھ پار کرکے برندُو دریا کی گھاٹی کا مشکل راستہ ہے!

لوگ مردِ اہلِ سوات سے بہت بڑھیا ہیں بلکہ بنیروالوں سے بہتر پٹھان شاید ہی کہیں ہوں۔ سادہ، اعتدال پسند، سادہ اور مقوّی غذا یعنی اپنے جانوروں اور زمینوں کی پیداوار کھانے والے، بامروّت، پناہ مانگنے والے کے لئے مہمان نواز اور اس کے ساتھ دغابازی کو پورے قبیلہ کے لئے کلنک کا ٹیکہ سمجھنے والے! دغابازی کا واقعہ بہرے سے ملتا ہی نہیں! دشمنوں اور اجنبیوں کے ساتھ بھی معاملات میں کھرے لیکن ہمارے ساتھ ہمیشہ اُکھڑے اُکھڑے رہے ہیں اور گو چھیڑ چھاڑ کے خواہاں نہیں تاہم ابیلا مہم میں وہ ہمارے سخت ترین دشمنوں میں سے تھے۔

وہ حتی الوسع ہمارے افسروں سے گریز کرتے ہیں لیکن ہماری سرحد

کے اندر ڈکیتی اور بدعنوانی روکنے کے لئے متعاون نہیں۔ وہ چھاپہ مار ہیں اور کئی قانون شکنوں کو پناہ دینے کے باوجود وہ شاذو نادر ہی ان کی لوٹ مار میں شریک ہوتے ہیں۔ وہ محبِ وطن ہیں اور اپنے شبانی اور دہقانی انداز میں محنتی ہیں لیکن وہ تجارت کو کسرِ شان سمجھتے ہیں اور دکان یا کاروبار سے متنفر ہیں لہٰذا وہ غریب ہیں لیکن پھر بھی پٹھان وضعداری قائم رکھتے ہیں۔ وار برٹن کے مطابق ان کا قول بذریعہ جرگہ پتھر پر لکیر ہوتا ہے۔ وہ جہالت میں بھی ممتاز ہیں اور چونکہ جہالت عقیدت کی ماں ہے لہٰذا وہ انتہائی مذہبی ہیں اور ملاؤں، سیدوں اور پیروں کے سخت معتقد ہیں اور یہ سب طبقے اہم ترین اور امیر ترین ہو گئے ہیں۔ ان کو ورثے میں جو کلفت ملتی ہے وہ اسی کا نتیجہ ہے اور پورے یوسف زئی علاقہ میں جرائم زیادہ تر انہی کی ترغیب پر برپا ہوتے ہیں۔

یوسفزئی پاپا اور بادشاہ گر، محترم و محتشم اخوند سوات مرحوم (جس نے امبیلا مہم سے پہلے قبائل کو ہماری سرحد پر لوٹ مار کے لئے اکسایا تھا اور پھر اس سلسلے میں وہابیوں سے گٹھ جوڑ بھی کر لیا تھا جن سے وہ سخت نفرت کرتا تھا) سے لے کر ستانہ اور ملکا کے بدحال اور بدنیت جنونیوں تک (جو سید احمد بریلوی کے مجاہدین کے باقیات تھے) مذہبی جنونی یوسفزئی بدعنوانیوں کا سرچشمہ رہا ہے۔

ایسے قسمت آزماؤں نے اپنا الو سیدھا کرنے کے لئے سادہ لوح یوسفزئیوں کو بہکایا ہے، ان میں نفاق کے بیج بوئے ہیں، بغاوت کھڑی

کھڑی کی ہے اور : ہابیوں اور دیگر غیر مطمئن مسلمانوں کے ساتھ مل کر ہندوستان کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک ہلچل پیدا کر دی ہے۔ مُغل دَور سے لے کر آج تک پشاور اور ہزارہ سرحدات کی پہاڑی خلوتوں میں "اولیا" کے گہوارے " تو نہیں' جنونیوں کے اڈے ضرور رہے ہیں اور دونو طرف کے باغی یہاں سے شہ پاتے رہے ہیں۔ اِن میں سے چند ایسے ہیں جو ایسی حکومت کو برداشت نہیں کر سکتے جو سب عقائد کی متحمل ہو، لیکن زیادہ تر بڑے جاہل یا انتہائی شریر ہیں اور کئی مفرور، مقروض، اشتہاری مجرم، غدّار اور قاتل ہیں جن کو اور کہیں پناہ نہیں مل سکتی :

اس سرحد پر قبائل کے ساتھ تعلقات کی پیچیدگی اور کشیدگی انہی جنونیوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ستانہ سکھ دور سے بغاوت کا سوتا بنا رہا۔ ۱۸۵۰ء میں حسن زیئوں کی بے راہ روی انہی کا اثر تھا اور ۱۸۵۳ء میں ان کے خلاف مُہم ناگزیر ہُوئی۔ ۱۸۵۷ء میں اُنہوں نے ہمارے خلاف متحدہ محاذ بنا لیا لہٰذا ۱۸۵۸ء میں دوسری مُہم بھیجنا پڑی۔ انہیں ستانہ سے نکالا گیا لیکن وہ مہابن کی شمالی ڈھلان پر واقع مُلکا میں متمکن ہو گئے۔ دو سال بعد وہ بے حد زور پکڑ گئے۔ بقول ہنٹر " ہر قسم کے نمک حرام اِن بغاوت انگیزوں کے پاس جمع ہو گئے۔"

بالآخر ۱۸۶۳ء میں امبیلا مُہم ہوئی اور کوئی ۶۰۰۰ یوسفزئی اپنے قبائلی اتحادیوں کے ہمراہ میدان میں نکل آئے۔ وہاں اُنہیں خوب سبق سکھایا گیا، لیکن ہمارا بھی بہت مالی و جانی نقصان ہُوا اور قریباً ۹۰۰ آدمی مارے گئے یا زخمی ہوئے۔

اتحاد ٹوٹا تو قبائل نے اِن جرنیلوں سے خوب بدلہ لیا بالخصوص ہندوستانی تختۂ مشق بنے۔ لیکن ۱۸۶۸ء میں پھر یہی لوگ کوہِ سیاہ پر ایسا ہی محاذ بنانے والے تھے کہ بروقت اِقدامات (ناسازگار موسم کے باوجود) نے اِسے دبادیا۔

اِس فہرست کو طُول دینا صبر آزما ہوگا لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں نے مذہب کا لبادہ اوڑھ کر اضطراب و التہاب کی لہر کو سب سے زیادہ تقویت دی ہے اور آج بھی ہماری سرحد پر خطرے کا مہیب نشان بنے ہوئے ہیں، ایک ایسا خطرہ جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن جسے بعض اوقات درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔

چونتیسواں باب

ایک پاپائے سرحد

عبدالغفور بالائی سوات میں چرواہوں کے ایک گاؤں، جبری میں سابقہ صدی کے اواخر میں غریب اور گمنام والدین کے ہاں پیدا ہوا جو غالباً گوجر تھے (گو اُس کے مریدوں نے ان کے لئے بھی مذہبی ماخذ تلاش کرلیا) دیگر مشرقی مشاہیر کی طرح اُس نے بھی لڑکپن اپنے والد کا ریوڑ چراتے ہوئے گذارا اور دیگر بلند اختر نوجوانوں اور داستانوں کے ابتدائی اولیاء کی طرح اُس کے بچپن میں بھی ایسے محیرّ العقول واقعات سرزد ہوئے کہ لوگ انہیں عطیۂ خداوندی سمجھنے پر مجبور ہو گئے۔ وہ ایسے جانور کا دودھ نہ پیتا تھا جو ممنوعہ زمین سے گذرتا تھا۔ وہ سال ہا سال تک ایک ہی بھینس کا دودھ پیتا رہا جسے وہ گوجروں کی طرح سونٹے سے ہانکنے کی بجائے اُس کے گلے میں رسّی ڈال کر خود چراگاہ میں لے جاتا تھا۔ پھر اُس نے بکریوں کے منہ پر انہیں باہر لے جاتے ہوئے چھینکا چڑھانا شروع کردیا مبادا وہ ہمسایوں کی فصل کا کوئی بُوٹا چرالیں۔ عام گوجر خیالات کے برعکس ایسا طریقہ یقیناً اُس کے والدین کی زجر و توبیخ کا موجب بنا لہٰذا اٹھارہ سال کی عمر میں وہ

یہ سبق سیکھ گیا کہ دُنیا مفسد تھی اور اسے ترک کر کے اپنا جوہر مذہبی زندگی پر صرف کرنا چاہیئے۔

کسی نے اس کی تطہیر نہیں کی اور کسی ممتاز سلسلہ نے اُنہیں مُرید نہیں بنایا اور نہ ہی اہمیت دی۔ ریت کے مطابق وہ ایک بزرگ کا بیعت ہوا اور متلاشئ حق بن گیا۔ کچھ عرصے تک وہ زیارت سے مسجد، پیر سے مُلّا اور فقیر سے ولی تک پھرتا رہا (جن میں سے اکثر معرفت میں نامدار و نامور تھے) اور چاروں سلسلوں سے گذرا اور بالآخر سلسلۂ نقشبندیہ سے منسلک ہو گیا جو سکوت و صموت کا سلسلہ ہے اور جس کے تحت مُرید اپنا سر جھکا کر اور آنکھیں زمین پر گاڑ کر بیٹھتا ہے۔ مکمل یکسوئی کے لئے اس نے بیکا کو اپنا مستقر بنایا جو اٹک سے کوئی دس میل اُوپر سندھ کے کناروں پر ایک چٹیل، بنجر اور تنہا مقام ہے۔ یہاں اُس نے شتر خار کی ایک جھونپڑی بنالی اور جب عالم مغرب جنگِ واٹرلو لڑ رہا تھا تو یہ بیس سالہ نوجوان سخت زہد و ریاضت میں منہمک ہو گیا۔ بارہ سال تک وہ دُنیا سے قطع تعلق کر کے مطالعہ، غور و فکر اور عبادت میں مصروف رہا۔ عرصۂ ریاضت میں اُس کی خوراک تر بتر دھان کے کھیتوں میں بے محابا اُور خودرَو گھٹیا باجرہ کا بیج رہی۔

بعد کے سالوں میں پانی کی جگہ بھینس کے دُودھ نے لے لی لیکن آخر دم یعنی تراسی سال کی عمر تک اُس کی خوراک صرف سادہ رہی اور اس کی واحد بے اعتدالی چائے نوشی کی کثرت تھی جو شب زندہ داری کا ذریعہ

بنی۔ اُس کی فقیرانہ زندگی دُور دراز کے لوگوں کو بھی دُعا یا شفاعت کے لئے کھینچ لائی اور اُس کی شہرت کا آغاز اِسی دورِ نفس کشی میں ہُوا۔ وہ سندھ سے کرّم اور کرّم سے کابل تک "اخوند بیکا" مشہور ہو گیا اور پھر مشرقی افغانستان بلکہ ایران کے دُور افتادہ حصّے بھی اُس کے حلقۂ ارادت میں آ گئے۔

کشش، شاید دنیاوی اُمنگ اور شاید حب الوطنی کی کشش نے اُسے ۱۸۲۷ء میں خان ھنڈ اور سیّد احمد بریلوی سے ملا دیا۔ خان ابھی تھوڑا عرصہ پہلے ہی سیّد سے ملا تھا اور وہ غدّار ثابت ہُوا اور سیّد کے سب منصوبے رنجیت سنگھ کو بتا دیئے اور پھر خود بھی اِسی غدّاری کا شکار ہُوا اور مارا گیا۔ عبدالغفور کو اپنا مُستقر چھوڑ کر فرار ہونا پڑا، اُس کے وقار کو سخت دھچکا لگا اور اُس کی بحالی کے لئے اُسے کئی سال تک مارا مارا پھرنا پڑا۔ پھر وہ برطانوی یُوسفزئی علاقہ میں آیا اور زہد و ریاضت کے ساتھ ساتھ صاحبِ کشف و کرامات بھی ہُوا، تب وہ ولی اللہ اور اخوند بنا اور مرجعِ خاص و عام ہُوا۔ بعد میں بھی کم از کم دو دفعہ جذبۂ حب الوطنی اور ذوقِ جہاد نے اِس تارک الدنیا کو آ لیا۔ ۱۸۳۵ء میں افغان سکھوں سے برسرِ پیکار تھے اور پٹھان بھی اپنے قدرتی اور موروثی اعداُ کے خلاف متحد ہو رہے تھے۔ امیر دوست محمد خان نے اخوند کو بھی دعوتِ شرکت دی اور وہ مُریدانِ باصفا کے ساتھ اُس سے مل گیا لیکن ایک غیر منظم، برائے نام مسلح جمِ غفیر منضبط سکھ فوج کا کیا مقابلہ کرتا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی آمد پر ہی امیر خیبر کے راستے پسپا ہو گیا اور لشکر تتر بتر ہو گیا۔ مجاہد، غازی اور شہید نعرہ بازی تو کر سکتے تھے

لیکن سکھ فوج کا سامنا کیسے کرتے ؟ اخوند کو بنیر میں پناہ لینا پڑی ۔

۱۸۶۳ء میں امبیلا مہم سے پہلے اُسے ہمارے خلاف اعلانِ جہاد پر تیار کر لیا گیا اور تھوڑے عرصے کے لیے تو وہ اُن وہابیوں سے بھی مل گیا جو مسلسل اُس کا نشانۂ تنقید رہے تھے۔ اُس وقت وہ ستر سال کا تھا۔ پچھلے بیس سال سے وہ دُنیاوی معاملات سے الگ رہا تھا، امن کی تلقین کرتا رہا تھا اور قبائل کو انگریزوں سے عدم کشمکش کا درس دیتا رہا تھا۔ ۱۸۴۷ء میں اُس نے اہلِ سوات کو باغیانہ بازئی دیہات کی مدد سے باز رکھا جن کو ہم سزا دے رہے تھے۔ ۱۸۴۹ء میں اُس نے پلی لوگوں کو آمادہ کر لیا کہ وہ اپنے ڈاکوؤں سے دست کشی کریں اور چھاپے نہ ماریں۔ جب چھپنویں نیوٹو انفنٹری کے باغی نکلسن سے مفرور ہو کر سوات آئے تو اُس نے انہیں سندھ پار بھجوا دیا جہاں وہ سب ایک ایک کر کے مارے گئے اور ۱۸۵۷ء کے پُر آشوب دَور میں اُس کا رویّہ ہمارے ساتھ دوستانہ رہا جو یقیناً اُس کی دانشمندی اور دُور اندیشی کا مظہر ہے۔ ایک دو مواقع پر اُس نے ہندوستانی جنونیوں کے خیموں کے خلاف بھی اقدامات کئے اور اُنہیں کافر قرار دیا۔ اِسی لئے اُس کا مدِّ مقابل بننا حیران کُن ہے لیکن اُس پر بے حد دباؤ ڈالا گیا۔ بنیر اور دیگر قبائلی سردار، ملا، حتیٰ کہ مستورات نے بھی اُس پر زور دیا کہ وہ ان کی طرفداری کرے۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ اگر وہ شریک نہ ہوا تو کوئی اور رہنما اتنا مقبول ہو جائے گا کہ اُس کے اثر و رسوخ کے لئے مہلک ہوگا۔ پھر مقصد ذاتی نہ تھا بلکہ حب الوطنی تھا لہٰذا وہ ان باغیوں

کے ساتھ شریک ہوگیا۔

لیکن اُس نے شکست کو باوقار طور پر تسلیم کر لیا۔ مُہم کے بعد اُس نے اپنا سابقہ رویّہ اختیار کر لیا اور بقیہ زندگی سرحد کے شوریدہ سروں کو لگام دیتا رہا۔ امیر کابل نے بار بار حمایت کی التجا کی لیکن اپنی وفات (جنوری ۱۸۷۷ء) تک اُس نے ہماری حکومت سے دوستانہ مراسم رکھے جو پُرخلوص نہ ہوں تو بھی مدبّرانہ ضرور تھے۔ آخر عمر میں اُس نے جواکی چھاپہ ماروں کو کوہاٹ کے ہم مذہبوں کو لُوٹنے پر قزاق اور غنڈے قرار دیا اور ابازئی میں نہر سوات کے قتل وغارت کے ذمّہ دار لوگوں کو اپنے حلقۂ ارادت سے نکال دیا۔

سِکھوں سے شکست کے چند سال بعد اُسے سیدو میں یوسفزیوں نے زمین دے دی تاکہ وہ اور اُس کے مُرید اطمینان سے رہ سکیں۔ وہ یہیں آباد ہوگیا جہاں اُس کے مُرید حاضرِ خدمت رہتے تھے اور لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ اُس کی کرامات سے کھنچے چلے آتے تھے۔ لوگ اُسے گنجِ قارُون، الٰہ دین کا چراغ، مصری کاہنوں کے تریاق اور اکسیرِ حیات کا مالک وحامل سمجھتے تھے اور جوق در جوق آتے تھے۔ انہیں خوراک و پوشاک دیئے جاتے تھے، اُن کی مُرادیں بر آتی تھیں، ان کی ذہنی و جسمانی بلائیں دُور ہوتی تھیں اور مریض شفایاب ہوتے تھے۔ زائرین خواہ کتنے ہی ہوں اُن کی ضروریات پُورا کرنے کے وافر سامان تھے حالانکہ وہ خود غریبانہ زندگی گذارتا تھا، کوئی محصول نہ لیتا تھا اور نذر نیاز قبول نہ کرتا تھا۔ اُسے کل

کی کبھی فکر نہ ہوتی تھی ۔ اُس کی سادہ ضروریات بآسانی پوری ہو جاتی تھیں اور ہر صبح نماز سے فارغ ہونے پر اُسے جانماز کے نیچے سے اتنی رقم مل جاتی تھی جو روزمرّہ اخراجات کے لئے کافی ہوتی تھی ۔ اُس کے خزانے، لنگر اور توشہ خانہ کے منتظم لالچی لوگ تھے یا مُرید — اِس سے کیا فرق پڑتا ہے؟

اخوند سوات کی حیثیت سے اُس کا اثر و رسوخ بیکا کے تارک الدنیا کے مقابلے پر بے پناہ تھا۔ سرحد اور مشرقی افغانستان کے مسلمانوں پر اُس کا دبدبہ ایسا ہی تھا جیسا لوئیلا کا روم میں یا لوتھر کا سیکتی میں ۔ مذہبی اور دُنیاوی تقریبات پر اُس کے احکامات ایسے ہی ناگزیر تھے جیسے سپین میں پاپائی فرامین۔ جب سوات کے سرداروں کو برطانوی قبضہ کا خطرہ ہُوا اور اتحاد کی ضرورت محسوس ہُوئی تو وہ اسی کے پاس آئے کہ ان کا ایک بادشاہ منتخب کیا جائے ۔ اُس نے ستانہ کا ایک سیّد چُنا جنے چند سال تک پاپائے سرحد کی زیر سرپرستی باقاعدہ حکومت کی.

اُس کے متعلق ناقابلِ یقین کہانیوں کو ایک طرف رکھ کر بھی دیکھیں تو اُس کی زندگی عبادت، عجز و انکسار، پرہیز اور خیرات کی زندگی تھی۔ وہابیوں کے مقابلے پر اُس کی تعلیمات رواداری اور وسیع النظری پر مبنی تھیں ۔ دیگر مذہبی پیشواؤں کے معیار پر پرکھا جائے تو اُس نے اپنا اثر و رسوخ بہبودی، امن اور اخلاقِ فاضلہ کے لئے استعمال کیا، باہمی آویزش کو اُس نے روکا، لوگوں کو لُوٹ مار اور ہمسایوں کی ایذا رسانی سے باز رکھا اور جہاں تک پٹھانوں کی انمٹ رسموں نے اجازت دی اُس نے شریعت محمّدی کے قوانین نافذ کئے۔

وہ تجرّد کو مستحسن نہ سمجھتا تھا اور اُس نے اکوزئی خیل (یوسفزئی) کی ایک خاتون سے شادی کی اور اس سے دو بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئے۔ بڑا بیٹا، عبدالمنان، میاں گل اپنے والد ماجد کی وفات پر سوات پر بالادستی کے سلسلہ میں خان دیر سے الجھ گیا، ۱۸۸۳ء میں سردار باجوڑ کی پشت پناہی اور خود اُس کے والد کی نیک نامی کی بدولت تھوڑے عرصے کے لئے حکمران ہو گیا لیکن موت نے اُسے دینی و دنیاوی اقتدار کی مُہلت نہ دی۔ چھوٹا بیٹا، عبدالحق زندہ ہے، اپنے والد کی طرح ریاضت کرتا ہے اور تارک الدنیا ہے لیکن اثر و رسُوخ میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں اور وادی کے باہر اُسے کوئی جانتا بھی نہیں۔ سرحد کی پیشوائی ایسے ہی موروثی نہیں ہو سکتی جیسے وحی یا پیغمبری اور سرحد میں کوئی ایسا دینی پیشوا نہیں ہوا جو عظمت مآب، عبدالغفور، اخوند سوات کا خلا پورا کر سکے؟

پینتیسواں باب

داعیانِ بغاوت

پٹھان کے صوری و مرئی ایمان اور اس کے اولیا، مقابر، انبیا، ملا، نمازوں اور زیارتوں پر اعتقاد کو ذہن میں رکھیں تو یہ اچھا خاصا حیران کن ہے کہ ان تمام چیزوں کے کٹر مخالف مذہبی مصلحین کبھی کبھار سرحد پر اتنے بارسوخ ہو گئے۔ یہ رواداری کا نتیجہ نہیں کیونکہ سنّی شیعہ مذہبی افتراق اور گار اور سامل سیاسی اختلاف سے زیادہ تلخ آویزش شاید ہی کہیں اور ہوئی ہو۔ اصحابِ اربعہ کو ماننے والوں اور حضرت علیؓ کو ماننے والوں کے درمیان اختلافات یقیناً اتنے شدید نہیں جتنے رسم پرست پٹھان اور رسم شکن وہابیوں میں۔ مزید برآں موخر الذکر قابلِ نفرت ہندوستانی ہوتے ہیں۔ لیکن اس طویل فتنہ و فساد کے باوجود ان لوگوں اور اسی قبیل کے دیگر لوگوں کی بستیاں محفوظ رہی ہیں اور جب تک وہ پٹھان ریت میں مداخلت نہ کریں اُن کی پاسداری بلکہ دلداری کی گئی ہے۔ تین صدیاں پہلے بھی ان کی ریشہ دوانیوں کی پیدا کردہ الجھنیں ایسے ہی بدنام تھیں جیسے اب ہیں لیکن ہمیں دق کرنے کے سوا پلوسی اور میدان کے جنوبی گرد و پیش

کے قبائل سے الگ تھلگ اور دُور دُور ہی رہے ہیں۔ قبائلیوں کے لئے وہ ایسے ہی گمراہ کُن ہیں جیسے فاؤسٹ کے لئے میفسٹوفلیس تھا اور تقریباً اسی بناء پر کیونکہ انہوں نے سرحدی پٹھان کے سامنے اُس کی عزیز ترین کشش رکھی ہے، تاخت و تاراج کی کشش! مزید برآں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آل قیس میں جو خطرناک بدعات گھر کر گئی ہیں وہ سب ہندوستان سے آئی ہیں اور ایک دفعہ جب وہ اِس موزوں زمین میں جڑ پکڑ گئی ہیں تو پیداوار مع سود واپس ہوئی ہے جنون کے کانٹوں کی صورت میں جو ہر حکومتِ وقت کے پہلو میں چبھتے رہے ہیں خواہ وہ مغل ہو یا سکھ یا انگریز!

سولھویں صدی کے وسط میں یہ فصلِ خار 'پیرِ روشن' یا بموجب مخالفین 'پیرِ تاریک' سے پیدا ہوئی۔ اُس کا پورا نام بایزید انصاری تھا اور وہ ایک عابد و زاہد ملّا کا بیٹا تھا جو محسود وزیری صدر مقام کنی گورم میں رہتا تھا اور جہاں اب بھی سازشی سادات کی ایک بستی قائم و دائم ہے۔ مذہبی تربیت کی وجہ سے اُس کا عنفوانِ شباب پُر رنگ تھا لیکن وہ گھر سے چلا گیا، آوارہ پھرتا رہا، بُری صحبت میں اُلجھ گیا اور جوگیوں وغیرہ کی رفاقت میں رہا اور انہوں نے اِس ملّا زادے کو کچھ زیادہ ہی سکھا دیا۔ اُس نے صوفیوں سے کچھ فلسفہ پڑھا، ہندو عقائد جیسے تناسخ اخذ کر لئے اور اُس پر اپنے نظریئے استوار کر لئے اور پھر واپس انہی کی تلقین کے لئے آیا اور اپنے باپ کو قبل از وقت سفید ریش کر دیا۔ ملّا اتنا برافروختہ ہوا کہ اُس نے اُس کے عقائد اور بایزید کی زندگی کو چاقو سے ختم کرنے کا سوچا۔ مؤخر الذکر نے دیکھا کہ اپنے علاقے میں

اُس کے لئے کوئی موقعہ نہ تھا لہٰذا وہ گھر چھوڑ گیا اور چند سال سرد و گرم روزگار چکھنے کے بعد پشاور سرحد پر مرتکز ہو گیا جہاں اُس نے بدعات کے علاوہ حکومت کے خلاف بغاوت کا درس دینا بھی شروع کیا۔ اُس نے قرآن حکیم، مقابر، کرامات وغیرہ کو بالائے طاق رکھا اور دعوےٰ کیا کہ الوہیت نیک انسانوں میں حلول کر جاتی تھی اور وہ خود اُس کا مظہر تھا۔ بہشت کا واحد راستہ پیر کامل کی شفاعت تھی۔ وہ اِتنا ذہین و فطین تھا کہ کامیاب ہونے کے لئے اُس نے اپنا مذہب وحشی سرحدیوں کے مطابق بنا دیا اور ضبط کو نسبتاً ڈھیلا کر دیا۔ منکرین فرقہ کو مُردہ سمجھا جاتا تھا اور اُن کی جائداد زندوں یا نام نہاد ورثاء کے لئے حلال کر دی گئی۔ جو موقعہ ملتے ہی اس پر قابض ہو سکتے تھے۔ عورتوں کے ساتھ آزادیٔ اختلاط اور ملکیت (بالخصوص ملکیتِ دیگراں) کے سلسلہ میں ایک قسم کی سماجی اشتراکیت نے ایک ایسا نظام برپا کیا جو آفریدیوں، اورکزئیوں اور وادیٔ پشاور کے قانون شکن قبائل کو بہت بھایا۔ یوسفزئیوں اور بالخصوص اخوند درویزہ نے اِس کی شدید مخالفت کی۔ پھر بھی کافی قبائلیوں نے اُسے قائد بنا لیا اور اُس نے ایک بڑا لشکر جمع کر کے، مغل شہنشاہ کے خلاف جنگِ چھاپہ مار شروع کر لی۔ وہ اور اُس کے پیرو اکبر کے لئے ایسے ہی دردِ سر بنے جیسے وہابی سکھوں کے لیے اور ہندوستانی جنونی انگریزوں کے لئے۔ وہ پشاور سے کابل تک لوٹ مار کرنے لگے اور مان سنگھ اور اکبر کے دوسرے عظیم جرنیلوں کی کارروائیوں کے باوجود رسل و رسائل کے سلسلے درہم برہم بلکہ منقطع ہو گئے!

بالآخر پیر کامل کو ایک شبخون میں پکڑ لیا گیا اور وہ تھوڑا عرصہ بعد

ہشت نگر میں چل بسا لیکن اُس کے پانچوں بیٹوں نے اپنے اپنے گروہوں کے ساتھ یورشیں و یلغار جاری رکھی تھیں کہ مغلوں کے نظریۂ تادیب کے مطابق وہ کچلے گئے، جلائے گئے، ڈبوئے گئے یا موت کے گھاٹ اُتار دیئے گئے۔ ان میں سے دو کی یاد خطرناک ترین چٹانوں کے جوڑے، کمالیہ اور جلالیہ میں محفوظ ہے جو سندھ پر اٹک پتن کے مقابل ہیں۔ اکبر نے ان کا یہ نام رکھا کیونکہ یہ شاہی بیڑے کے لئے ایسی ہی تکلیف دہ اور ضرر رساں تھیں جیسے پیر تاریک کے دو بیٹے اُس کی فوجوں کے لئے! آہستہ آہستہ بدعت ختم ہوگئی لیکن اُس کا ایک پوتا، احداد کافی عرصہ تک ایک گروہ کی تیراہ میں قیادت کرتا رہا اور لوٹ مار اور ہمسایہ کشی کی حوصلہ افزائی ہوتی رہی۔

وہابیوں نے پیروں کی پابوسی، سجدۂ قبور، مجاوروں کی خاطر تواضع وغیرہ (جو پٹھانوں کا دستور ہیں) کو سخت طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا ہے لیکن حیرت ہے کہ سید احمد بریلوی پھر بھی شمال مغربی سرحدِ ہند پر خطرناک ترین داعیٔ بغاوت بن گئے۔ ان کی بنا کردہ بستیاں اب بھی موجود ہیں اور ان کے جوشِ جنوں کا تازہ ترین مظاہرہ کوہ سیاہ کی مہم میں ہوا جب دو سُو کوٹ کے میں موت سے ٹکرا گئے۔ ان کے حالاتِ زندگی ہندوستان میں اُن کے پیروؤں پر سرکاری مقدمہ کے دوران منظرِ عام پر آئے اور ہنٹر نے انہیں اپنی کتاب "ہندوستانی مسلمان" میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا ہے۔ ایک پنڈارے ڈاکو کے تحت رسالے کا سپاہی، علمائے دہلی سے عربی پڑھنے والا، مکہ معظمہ کا مخلص زائر، اسلام کا ایک پُرجوش مصلح، سکھوں سے جنہیں

تک کفر کو ختم کرنے کا علمبردار ، اُس کی عظیم کامیابی یوسفزئی پہاڑوں میں ظہور پذیر ہوئی - قبائل کو اُس کی اصلاحات سے دلچسپی نہ تھی اور وقت آنے پر اُنہوں نے اُنہیں ٹھکرا دیا - اُنہوں نے اُس کے رفقاء کو ٹھکانے لگا دیا اور خود اُس محافظِ دین کی جان کے لاگو ہو گئے جب اُس نے رسوماتِ شادی کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا - وہ زن فروشی اور کرامت پرستی پر ہی ڈٹے رہے لیکن پنجاب کے امیرانہ سکھ شہروں کے خلاف جہاد میں وہ اُس کے پُرجوش حامی بن گئے - ہندوؤں کو لُوٹنے کی خوشی ایک نعمتِ غیر مترقبہ تھی - جو مرے وہ شہید اور جو بچے وہ غازی اور مالِ غنیمت سے مالا مال !

سکھ کفار کے خلاف جہاد ۱۸۲۶ء میں شروع ہُوا - پیروؤں نے حملوں کے ساتھ ساتھ آتش زنی اور کشت و خون بھی روا رکھے اور کچھ عرصے کے لئے تو وہ ناقابلِ مزاحمت بن گئے - ۱۸۳۰ء میں پشاور پر قبضہ ان کا نقطۂ معراج تھا - سکھوں نے جوابی مہمات شروع کیں جو تادیب سے زیادہ نسل کُشی کے لئے تھیں - دیہاتیوں نے مفروروں کو پہاڑوں کی طرف بھگا دیا اور اُنہیں وحوش کی طرح ختم کیا - تاریخ وقت نفرت کی بدترین تاریخ ہے - روایات بے رحمانہ مظالم سے بھرپور رہیں - ہنٹر نے ایک مثال دی ہے کہ زمینی ملکیت خون سے خریدی جاتی تھی - ایک گاؤں کی زمینیں ہندوؤں کو اس شرط پر دی گئیں کہ وہ سکھ معطیوں کو سالانہ ایک سو حسن خیلوں کے سر پیش کریں گے - سید احمد نے پٹھان رسوماتِ شادی کی اصلاح کی کوشش کی تو اُن کے نام کو بٹہ لگا کیونکہ وہ اِس طرح اپنے ہندوستانی پیروؤں کو بیویاں مہیا کرنا چاہتے تھے -

اہلِ کوہ کے مخصوص اشارات دیئے گئے اور اُن کے رفقاء کے قتل کا فیصلہ کیا گیا اور نمازِ مغرب کے وقت ایک گھنٹے میں قبائلیوں نے اُنہیں چن چن کر مار دیا۔ ۱۸۳۱ء میں خالصہ فوج نے شیر سنگھ کے تحت اُن کو بھی ٹھکانے لگا دیا۔ وہ اور اُن کے ساتھی تقریباً ختم ہو گئے۔ ۱۶۰۰ میں سے صرف ۳۰۰ زندہ بچ سکے اور سکھوں نے ان کی جانشینی تقریباً ناممکن بنا دی۔

تاہم سید احمد کے نائبین کی قائم کردہ بستیاں (جو ہندوستان کے غیر مطمئن افراد اور سرحد کے قانون شکنوں سے آباد ہوئیں) برطانوی حکومت کو ورثے میں ملیں اور الحاقِ پنجاب سے منسلک یہ غالباً نہایت تکلیف دہ ورثہ تھیں۔

اتمان زئیوں میں ستانہ، مہابن کی ڈھلانوں پر ملکا، بنیر میں زرکاتہ کے مقامات پر یہ بستیاں کوہ سیاہ میں ایستادہ ہیں اور سندھ کے دو طرفہ قبائل کے درمیان ان کی وجہ سے مہمات کا ایک سلسلہ قائم ہوا اور بے پناہ مالی و جانی نقصان ہوتا رہا۔ جہاں وہ کھل کر سامنے نہیں آئے وہاں تمام قبائلی پیچیدگیوں کے سرچشمہ ضرور بنے رہے ہیں۔ ان کا مقصد انگریزوں، ہندوؤں یا ہر قسم کے کفار کے خلاف جہاد رہا ہے اور وہ ہمیشہ نفرت و کدورت ابھارتے رہے ہیں۔ وہ سرکش و متمرد خان یا قبیلہ سے ملے ہیں جو پہل کر سکے۔ اخوند سوات نے اُنہیں بنیر سے نکلوایا تو پلوسی اور میدان کی بستیاں وجود میں آئیں اور ۱۸۶۸ء کی کوہ سیاہ مہم سے ۱۸۸۸ء کی مہم تک وہ مسلسل قبائل کو برانگیختہ کرتے رہے اور اِس کا مزہ بھی ان قبائل نے خوب چکھا ہے۔ پچھلے چند سالوں سے وہ اتنے منظرِ عام پر نہیں آئے تاہم وہ فتنہ انگیزی سے باز نہیں آئے۔ ۱۸۸۵ء

میں وہ بنیر کی بے چینی میں بنیروال سے ملنے کے لئے تیار تھے اور ان کے مبلّغین ہندوستان میں پیشگی چندہ کی مہم چلا رہے تھے۔ اسی سال ان کے قائد، مولوئی میدان نے ڈی سی ہزارہ سے ۵،۰۰۰ روپے چندہ مانگا اور بصورت عدم ادائیگی انتقامی کارروائی کی دھمکی دی۔ اگر حالیہ کوہ سیاہ کی مہم کی تحقیق کی جائے تو زیادہ تر واقعات کے پیچھے پلوسی کی بستی اور پریاری سادات کی سازشیں نظر آئیں گی۔ موخرالذکر میں سے ایک کے حامیوں نے ہی ۱۸۸۴ء میں ہمارے دیہات پر آتش باری کی، بگریان پر حملہ کیا، ۱۸۸۸ء میں امن پسند دیہاتیوں کو مار گرایا اور ۱۸۸۹ء تک کئی دوسروں کو اغواء کرتے رہے اور ایک بدنام قانون شکن ہاشم علی خان کے حامی بھی زیادہ تر پلوسی بستی سے ہی ماخوذ تھے اور اُس نے حالیہ فسادات سرحد میں بہت نمایاں حصّہ لیا۔

یہ دیکھنا باقی ہے کہ آیا قبائلی سرجان میک کوئین کی سنگین تادیبی کارروائی کے بعد ان امن شکنوں کو وہاں سے نکالتے ہیں یا نہیں لیکن یہ امر یقینی ہے کہ سرحد پر دائمی امن کے لیے ایسے داعیانِ بغاوت کا فوری اخراج ضروری ہے۔

چھتیسواں باب

سرحدی رومان ـــــ پٹھان رومیو جولیٹ

اگرچہ ایک لحاظ سے شادی شدہ سرحدی جوان کی جائداد میں ایک دو بیویاں شامل ہوتی ہیں جنہیں وہ رائج الوقت قیمت پر خریدتا ہے اور گو عورت ذات کی حیثیت دیگر مویشیوں سے اکثر کمتر ہو سکتی ہے (کیونکہ وہ اُس کے لئے لکڑی کاٹتی ہیں اور پانی ڈھوتی ہیں اور عام پالتو گدھوں سے زیادہ زیر بار ہوتی ہیں) تاہم یہ فرض نہیں کر لینا چاہیئے کہ پٹھان مردانہ دیوتا، کیوپڈ کے تیر سے گھائل نہیں ہوتے یا سرحدی دیہات، صحنوں، خیموں اور مجمع الاشجار میں جنگ بازیا فرشتہ سیرت دامِ محبت میں نہیں اُلجھتے جو ہر جگہ کارگر ہے۔ نغمہ ورقص کی محبت تو ایک عام خصوصیت ہے۔ مشہور خٹک ناچ سے تو نووارد بھی مانوس ہیں۔ بڑا الاؤ، براق شمشیریں اور ایک وحشیانہ نغمے کی دُھن پر رقاص پُراسرار گردش سے گھومتے اور ناچتے ہُوئے؛ خٹک بالنسریاں پنجاب کی سرحد پر اتنی ہی تھرتھری آور ہیں جتنی سکاٹ لینڈ میں بلکہ اِس سے بھی کچھ زیادہ ہی دلدوز؛ خوشی کی تقریبات پوری سرحد پر ہوتی ہیں اور جہاں مُلّاؤں کی پابندی نہ ہو وہاں رقص و موسیقی دونو اصناف کی بہترین تفریح ہیں۔ سُرنا، ڈھول اور رباب بجانے والے ہر جگہ

حاضرین و سامعین کو کھینچ لیتے ہیں بالخصوص اگر وہ کسی جنگجو قبائلی کے بہادرانہ کارناموں یا عشق تے سے لبریز گیت بھی گائیں ۔ میراثی کبھی کبھار تھوڑی سی اداکاری اور تمسخر کا بھی اضافہ کر دیتا ہے اور اگر وہ گاہے ماہے اُسے سوقیانہ رنگ بھی دے دے تو حاضرین عش عش کر اُٹھتے ہیں ۔

رباب کی تاروں کو ہاتھ یا چھوٹے سے مضراب سے بجاتے ہیں اور یہ گٹار سے زیادہ مشابہ ہے اور اِسے بجانا نہ صلیبی سُورما کے لئے باعثِ شرم تھا اور نہ پٹھان کے لئے ہے ، اور وہ کبھی کبھی بر سرِ راہے اپنی رائفل کو چھوڑ کر اِسے بجاتا ہے اور میراثی سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتا ہے اور بہت اُونچی لیکن مترنم و موزوں آواز میں کوئی پسندیدہ پٹھان قصہ بھی گاتا ہے ۔ اسی طرح پٹھان مزدور بھی دن بھر کی محنتِ شاقہ کے بعد اکٹھے ہو کر کھانے کے بعد آدھی رات تک کورس گانا پسند کرتے ہیں ۔

دیگر دنیا کی طرح پٹھانوں میں بھی رُومان ہوتا ہے بلکہ اُس کے ہندوستانی ہمسایوں سے زیادہ ہی ہوتا ہے ۔ الفنسٹن کا تو یہاں تک خیال ہے کہ افغان اور پٹھان کے سوا شاید ہی اہلِ مشرق مغربی نظریہ کے مطابق جذبۂ عشق کو سمجھتے ہوں ۔ سرحد کی بہت سی چاہتیں ضابطہ کے مطابق نہیں ہوتیں اور اکثر عشق بازی دلالوں کے بغیر ہوتی ہے ۔ ایک پُر اشتیاق خان ہمیشہ ہری کے انتظام کا انتظار نہیں کر سکتا ۔ اگر اُسے لڑائی کی پرواہ نہ ہو تو وہ اپنے والدین کی مرضی کے بغیر بھی ایک محبوبہ حاصل کر سکتا ہے اُس کی زلف چرا کر یا اُس کا بُرقعہ اتار کر یا اس سے بھی آسان اسے اغوا کر کے ۔ نہ ہی یوسفزئی اتنا

کہ ذہن ہے کہ شادی کی تقریبات ختم ہونے سے پہلے اپنی دُلہن کو نہ دیکھنے کے دستور پر ہی عمل کرے۔ وہ تاریکیٔ شب میں اُس کے گھر جاتا ہے اور ساس کے ساتھ خفیہ معاہدے کے ذریعے دلہن سے ملتا ہے جبکہ ساس سُسر کو مصروف رکھتی ہے کیونکہ وہ تو ایسی ملاقات کو سنگین ترین سمجھے گا اور یہ چوری چُھپے کا راز و نیاز (جسے پشتو میں ہونیوالے جوڑے کی کھیل کُود کہتے ہیں) بقایا رسومات کی تکمیل میں تاخیر کی تلافی کر دیتا ہے۔

لیکن اغواء اور اُدھالا کے علاوہ دیگر خطرات جو پٹھان راہِ عشق میں مُول لے لیتے ہیں (اور یہاں ایلفنسٹن کا مغرب سے مقابلہ بہت برمحل ہے) رومانوی وابستگیوں کی بے شمار مثالیں ہیں جن میں نوجوان لڑکے لڑکیاں عشق کرتے ہیں، عہد و پیمان کرتے ہیں لیکن والدین سخت ہیں اور زمین اور گوشت کی صورت میں ٹھوس یقین دہانی چاہتے ہیں لہٰذا اُنہیں جُدا ہونا پڑتا ہے، ایک کام کرتا ہے اور دوسرا اِنتظار کرتا ہے جیسے مغربی کہانیاں ہیں۔

مزید برآں ان کے قصے، گیت اور افسانے عشق و جنگ کا ہی ڈھرا مائی اظہار کرتے ہیں۔ سرحد کا کوئی شیکسپیئر نہیں لیکن مقبول ترین سرحدی نظمیں اور کہانیاں رومیو جولیٹ کی کہانی پر مبنی ہیں۔ یہ خاص طور پر یوسفزئی علاقے میں مشہور ہے اور نہایت جاندار پشتو میں آدم خان اور دُرخانی کا دردانگیز قصۂ عشق بتاتی ہے، سرحدی لوک ادب کا نمایاں ترین نمونہ ہے اور سرحدی زندگی کے خوشگوار ترین پہلو کی تصویر کشی ہے۔

کہانی ایلفنسٹن سے لے کر بہت سوں نے فارسی اور پشتو دونو

سے لکھی ہے لیکن آنجہانی میجر پلاؤڈن نے اسے مولوی احمد تنگی کے پشتو ایڈیشن سے مکمل ترین انداز میں لکھا ۔ یہ ان دنوں کی یادگار ہے جب سوات کے یوسفزئی ہر گرمی میں پہاڑوں سے وادیٔ پشاور میں آتے تھے ۔ ابھی مشہور شیخ ملی نے کوہ و میدان قبائل میں تقسیم نہیں کیے تھے ۔ ابھی تیر کمان ہی آلاتِ جنگ تھے اور بابر نے ابھی توپیں زیرِ استعمال نہیں لائی تھیں اور اباخیل کا متھاخیل حصہ دریائے سوات کے کناروں پر واقع بری کوٹ میں اپنا صدر مقام بنائے ہوئے تھے ۔ انہی میں حسن خان کا بیٹا آدم خان تھا جو اپنے زورِ بازو ، وضع قطع اور بانکپن کے لئے قبیلے کی آنکھ کا تارا تھا ۔ وہ ایک اعلیٰ شکاری اور ماہر موسیقار تھا اور رباب نوازی میں تو اس کا کوئی ثانی نہ تھا اور دلدادہ احباب اُسے اپنا سردار مانتے تھے ۔ دُرخانی اسی قبیلے کے خاصی خیل حصہ کے امیر سردار طاؤس خان کی بیٹی تھی جو قریب ہی غلگان گاؤں میں رہتا تھا ۔ وہ حسین ترین لڑکی سمجھی جاتی تھی ۔ "ہر جگہ اس کے حسن ، تلطف اور صلاحیتوں کا شہرہ تھا اور کوئی اس کا ثانی نہ تھا ۔"

ان عاشقانِ دل باختہ کی پہلی ملاقات سوات کے برفیلے پانیوں یا بازدرہ کے چشمہ کے پاس ہوئی جب قبائلی میدانوں کا رُخ کر رہے تھے اور دُرخانی وہاں پانی لینے کے لیے آئی ۔ یہاں ایک دو نیم چٹان ان کی ملاقات گاہ بنی ۔ درہ مالاکنڈ کے راستے پر لوہار کی ایک دُکان میں بھی اُن کی ملاقات ہوتی رہی جہاں آدم خان اپنے گھوڑے کے نعل لگوانے آتا تھا اور دُرخانی اپنا تکلا سیدھا کروانے آتی تھی ۔ "آنکھیں ملیں اور وہ ایک دوسرے پر فدا ہو

گئے، ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا اور اب بھی ایک درخت کا بتایا جاتا ہے جس کے ساتھ آدم خان ایک میخ گاڑ کر اپنا گھوڑا باندھا کرتا تھا۔

لیکن متّھا خیلوں اور رخاصی خیلوں کے درمیان ایک دیرینہ عداوت تھی لہٰذا درخانی کی منگنی قبیلہ کے تیسرے حصّہ، بابو زئی کے طاقتور کردار، پارس یا پائیوائی سے کر دی گئی۔ محبّت خفیہ رہی اور دُرخانی اتنی خلوت گزیں ہوئی کہ سماجی تقریبات میں بھی (جب پابندیاں نرم ہوتی ہیں) کوئی اُس کا چہرہ نہ دیکھ سکتا تھا۔ بڑی مشکل سے اُسے اپنے چچازاد بھائی لسا کی شادی میں جانے پر رضامند کیا جاتا ہے اور ایک پرانی سہیلی کے ساتھ اِس شرط پر بھیجا جاتا ہے کہ وہ سرتا پا بُرقعہ میں ملبوس رہے گی۔ مردم گریزی کی قسم اٹھا کر وہ اپنی سہیلی کے ساتھ روانہ ہو گئی (جو جولیٹ کی نرس کا کام کر رہی تھی) لیکن وہ ہر موقعہ ملتے ہی اُس کے عاشق کی تعریفیں اُس کے گوش گذار کرتی رہی۔ چچازاد بھائی بچپن کی کھیل کود کے واقعات سُنا سُنا کر محظوظ ہوتے ہیں لیکن اُس کی جھلک بھی نہیں دیکھ سکتے۔ گائیک بڑھ چڑھ کر اُس کے گُن گاتے ہیں اور ایسے شعر پڑھتے ہیں "جو روتوں کو ہنسا دیں اور ہنستوں کو رُلا دیں"۔ وہ قطعے اور ٹپّے گاتے گاتے تھک جاتے ہیں لیکن کوئی اثر نہیں ہوتا، دُرخانی اپنا نقاب نہیں اٹھاتی:

پھر آدم خان آتا ہے اور وہ اُس کے دو حواری صحن کے باہر نغمۂ فراق گاتے ہیں (یہ نغمہ نظم کا بیشتر حصّہ ہے)۔ دُرخانی بے تاب ہو کر سہیلی سے گویّے کا پوچھتی ہے۔ وہ کہتی ہے۔" وہ ایک سبز طوطا ہے (طوطا مردانہ حُسن کا ایک نمونہ ہے جیسے بلبل گیت کا) جو موزوں لباس پہنے ہوئے

ہے اور اُس کے دو دوست اس کے پَر ہیں۔ اگر تو اُسے دیکھنا چاہتی ہے
تو یہی وقت ہے۔ وہ فوراً ہی اُڑ جائے گا اور تُو غم سے نڈھال ہو جائے گی
کیونکہ وہ آدم خان ہے۔" ایک ساتھی اُس کی زُلفِ پریشاں اور دوسرا اُس
کے سڈول بازوؤں کی تعریف کرتا ہے جنہوں نے ایک تیز دھار کی طرح
آدم خان کے دل کو دو نیم کر دیا ہے اور وہ خود اُس کے حُسنِ صورت کا گیت
گاتا ہے، اپنا حالِ زار بیان کرتا ہے اور بن باس کا ارادہ ظاہر کرتا ہے —
درخانی آواز پہچانتی ہے، دلِ پاسبانِ عقل کو رد کر دیتا ہے اور سہیلی کی
فہمائش کے باوجود وہ شرابِ محبت میں مخمور بے نقاب ہو کر اُسے ملنے کے
لئے باہر دوڑتی ہے اور بے ہوش ہو کر گر پڑتی ہے۔" شرم و حیا بلکہ عقل بھی
اس کا دامن چھوڑ دیتے ہیں اور وہ کتابِ مقدس کے اصول بھی بھول
جاتی ہے۔" اس کے رشتہ دار اس بے حجابی پر اُسے کوستے ہیں، اُسے
جادو زدہ قرار دیتے ہیں اور نظرِ بد سے بچانے کے لئے اسے جنگلی اسپند
کی دُھونی دیتے ہیں۔ وہ جواب دیتی ہے: "اچھی بچی! میں سحر زدہ نہیں ہوں
بلکہ شعلۂ عشق میں جلی ہوئی ہوں لہٰذا مجھے آگ سے نہ جلاؤ۔ اگر میرا علاج
چاہتے ہو تو مجھے آدم کے ساتھ جانے دو۔" راز طشت از بام ہو جاتا ہے
اور اس کے بعد چاروں طرف سے رُسوائیوں کے سانپ لپکتے ہیں۔

پھر مولوی احمد کے ہاں ایک منظر ایسا آتا ہے جو بالکونی کے منظر کے
مشابہ ہے۔ درخانی اور اُس کی سہیلیاں زیریں باز درّہ میں اپنے سرائی گھروں
میں چلی جا رہی ہیں اور دونوں عاشقوں کو راستے پر اپنے محبوب چشموں پر ملاتا ہے۔

آدم اپنے رفقا میرو اور بالو کے ساتھ جھٹ پٹے میں طاؤس خان کے مکان پر آتا ہے اور جھولے کے بنے ہوئے زینے سے چڑھ کر صحن میں آتا ہے۔ بالو اس کا گھوڑا، مجنوں تھامتا ہے اور میرو پہرہ دیتا ہے۔ ملازم مُجاکو روپے دے کر چُپ کرا دیا جاتا ہے اور پردۂ شب میں عشق کے ڈرامائی لمحات گذرتے ہیں۔

غمِ فراق آتا ہے کہ درخانی اسے جانے نہیں دیتی لیکن وہ جانتی ہے کہ "اگر دن چڑھا اور اس کے باپ کو آدم کا پتہ چل گیا تو وہ شاید اُسے تو کچھ نہ کہے لیکن وہ آدم کو مار دے گا اور اس کا دل پاش پاش ہو جائے گا۔

" دیواریں بلند ہیں اور اُن پر چڑھنا مشکل ہے

اور تو آغوشِ مرگ میں جا سکتا ہے

اگر کسی عزیز کو تیری موجودگی کا پتہ چل جائے"!

یہ مصرعے تو گویا پشتو گویے نے چُرا لئے ہیں۔

پھر نسیمِ سحر چلتی ہے۔ سہیلی بیقرار ہوتی ہے کیونکہ "مرغ اذانیں دے رہے ہیں" لیکن آدم خان کہتا ہے: "ابھی تو رات باقی ہے، مُرغ بہت پہلے نغمہ بار ہو گئے ہیں!" وہ ابھی قسمیں ہی کھا رہے ہیں کہ مسجد سے اذان بلند ہوتی ہے۔ میرو مداخلت کرتا ہے اور سہیل آدم کی ناعاقبت اندیشی اور جلد بازی سے فائدہ اٹھا کر پہرہ دار کو ہٹوا دیتی ہے۔

آدم کی حالتِ زار سب پر منکشف ہو جاتی ہے۔ باپ کہتا ہے: "وہ درخانی کی محبت میں گرفتار ہے۔" چھوٹی بہن کہتی ہے "میرا پیارا ویر آتا ادھر کیوں ہے"؟ درخانی اپنی دل شکستگی کا اظہار کرتی ہے۔ منگیتر پائیوائی شکار سے واپس

آتا ہے اور حالات سُن کر حسد کے مارے جلد از جلد شادی پر اصرار کرتا ہے ۔

درخانی کو سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا ہے لیکن وہ اسے کہتی ہے۔ "میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں صرف سات دن کی مہمان ہوں لیکن اگر میں بچ گئی تو پھر میں تیری ہوں۔" پائیوائی مان جاتا ہے ۔ پھر پیر صالح آتا ہے اور سہیلی کے ساتھ طے کرتا ہے کہ پائیوائی کے ساتھ شادی کے روز درخانی کو بزور اُٹھا لے جائیں گے ۔ مزید برآں آدم سردار میر بامی کے پاس تنوات لے کر جاتا ہے جو تین سو مسلح آدمیوں اور پناہ کا وعدہ کر لیتا ہے ۔ ان کے علاوہ سو آدمی اُس کے اپنے بھی ہیں اور اُس دستے کی مدد سے میرو اور وہ ایک وقت مقررہ پر درخانی اور اُس کی سہیلی کو اُٹھا لیتے ہیں اور نہایت تیز رفتاری سے میر بامی کے گھر پہنچ جاتے ہیں پیشتر اس کے کہ پائیوائی کی فوج حرکت میں آجائے ۔

اب المیہ کے واقعات تیزی سے آگے بڑھتے ہیں ۔ میر بامی کو پائیوائی بھاری رشوت دیتا ہے کہ وہ درخانی پر لات مار دے، ایک ایسی دغابازی جو پٹھان معیار سے ناقابلِ معافی کمینگی ہے ۔ لہٰذا میر بامی کا بیٹا، گوہر خان (جو آدم کا دوست ہے) اپنے باپ پر حملہ کرتا ہے اور پیچھا کرتے کرتے وہ یعنی باپ لقمۂ اجل ہو جاتا ہے لیکن موت ہی کلنک کا یہ ٹیکہ دُور نہیں کر سکتی، سردار کا پورا قبیلہ جذام زدہ ہو کر نیست و نابود ہو جاتا ہے اور پھر بھی میر (یا پیر) بامی کا نام پرلے درجے کی غداری کی اصطلاح بن جاتا ہے ۔

گوہر خان اور آدم کی فوجیں متحد ہو جاتی ہیں لیکن پائیوائی کے پھندے میں پھنس جاتی ہیں اور گروہ ہار جاتا ہے تاہم بالو مارا جاتا ہے اور آدم زخمی ہو جاتا

ہے۔ دریں اثناء درخانی آدم کے اِنتظار میں دن رات آنسو بہاتی ہے اور باغ میں دو پھولوں کی آبیاری کر کے دِل بہلاتی ہے، ایک موسوم درخانی اور دوسرا موسوم آدم۔ گھات کے دن آدم نامی پھول مُرجھانا شروع کرتا ہے اور وہ اِسے بغور دیکھ رہی ہے کہ پائیوائی بے نیام تلوار کے ساتھ داخل ہوتا ہے اور ڈینگ مارتا ہے کہ یہ آدم کے خون سے تر ہے۔ یہ چال اُلٹی پڑتی ہے۔ "غم واندوہ میں ڈُوب کر دُرخانی بے ہوش ہو کر زمین پر گر جاتی ہے اور جان دے دیتی ہے۔ اُس کے ہاتھ اور لباس پھُولوں سے بھرے ہُوئے ہیں۔" آدم کو یہ خبر گاؤں میں ملتی ہے جہاں اُس کے زخم بندھے ہُوئے ہیں اور اُس کے عزیز و اقارب ایک حسین دوشیزہ "گل نیزا" سے اس کے دِل بہلاوے کی کوششوں میں معروف ہیں۔ گل نیزا بھی اس کی طرف بڑھتی ہے لیکن وہ اسے آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا اور کہتا ہے کہ "اگر دنیا بھر کی حسینائیں بھی اکٹھی ہو جائیں تو دُرخانی کے ایک ناخن کے بھی برابر نہیں۔" وہ یہ خبر سُنتے ہی چونک اُٹھتا ہے، اُس کے زخم کُھل جاتے ہیں اور وہ بھی درخانی، درخانی پکارتا ہُوا ختم ہو جاتا ہے۔

دوسرے بیان کے مطابق آدم پہلے مرتا ہے اور دُرخانی کو وفادار میرو سے یہ پتہ چلتا ہے جو ایک آوارہ مطرب کا بھیس بدلے ہُوئے اپنے آقا کا رباب بجاتا ہُوا ملتا ہے۔ وہ یہ خبر سُن کر تڑپ تڑپ کر مر جاتی ہے اور پائیوائی کو بھی آخر کار عاشقانِ صادق کی مَوت پر پشیمانی ہوتی ہے!

دیگر چربے اور انجام بھی ہیں لیکن سب اِس پر متفق ہیں کہ دونو علیحدہ علیحدہ لونہر (دریائے کابل) کے قریب اپنے اپنے احاطوں میں مدفون ہیں لیکن ایک آدمی

قبر سے اپنی گمشدہ لُنگی لینے گیا تو دونو اُسے ایک ہی قبر میں ملے۔ دو دفعہ قبائلی جنگ کی وجہ سے انہیں علیحدہ علیحدہ دفن کیا گیا لیکن دونو دفعہ محبت بالادست رہی اور وہ قبر میں اکٹھے ہو گئے۔ بالآخر قبائلیوں نے ایک مردِ پارسا کے کہنے پر اِس حقیقت کو تسلیم کر لیا اور اپنے اختلافات بھی اُسی آخری قبر میں دفن کر دیئے جس میں آدم و دُرخانی کو دفن کیا گیا تھا۔ جن کے متعلق اُن کی دیگر شبیہوں کی مانند یہ کہا جا سکتا ہے:

"ہم ستارہ عاشقوں کا جوڑا

جسے تیرہ بختی پھاڑ دیتی ہے

اپنی موت سے بزرگوں کے اختلافات مٹا دیتے ہیں"

مردان کے پاس دو پہاڑیاں ہیں طاؤس درے اور حسن درے جہاں متقابل خاندانوں نے اپنے خیمے گاڑے تھے اور جہاں بموجب روایات یہ المیہ پھوٹا، پروان چڑھا اور منتشر ہو گیا۔ نوشہرہ کے قریب ہی دریائے کابل کے کنارے واقع زِرہ مینہ پر دونو کی قبر ہے جس پر دو کیکر کے درخت ہیں جن کی شاخیں باہم پیوست ہیں۔ ان سے جو نوجوان اپنے رباب کے لئے مضراب (ناخن) بناتا ہے وہ آدم کی طرح بہترین موسیقار ہو جاتا ہے لیکن عنفوانِ شباب میں ہی موت کا خطرہ مول لے لیتا ہے۔

اور مردان کے قریب توُرُو سے ملحقہ گاؤں میں پیر صالح کی قبر ہے جو بالوزئیوں کا مست قلندر تھا اور جس کا روضہ اتنا ہی مشہور ہے جتنی آدم خان کی یاد ہر یوسفزئی کو عزیز ہے!

سینتیسواں باب
پٹھان شاعری

غالباً ہم پٹھان بلکہ افغان شاعری کو رنگین اور لبا اوقات جذبات انگیز فارسی شاعری اور عربوں کی قدیم سادہ شاعری کے درمیان رکھ سکتے ہیں - اول الذکر کی طرح یہ کسی حد تک تصوّف سے متاثر ہے، اوزان و بحُور اور تصور سے مالا مال لیکن یہ عشقِ حقیقی کا دعوٰے کرتے ہوئے محض عشقِ مجازی میں اُلجھ کر رہ جاتی ہے، جس کے اِستعارات دُور از کار اور نا ممکنات میں سے ہیں، ایک ایسا جوش و اِلتہاب جو سفلی فسق و فجور کو مذہبی تمثیل کا رنگ دے دیتا ہے جیسے درویش کا مخملیں خرقہ رُوحانی ریاضت کا مظہر ہونے کے باوجود نفسانی لذائذ کو نہیں چُھپا سکتا! ان دُور از کار اِصطلاحات کے لیے ایک مخصوص لُغت تراشنا ہو گی اور بادِ صبا کا مطلب بارانِ رحمت و وصل ہو گا، شراب کا معنی اعتکاف ہو گا، میکدہ معبد بن جائے گا، ساقی سالک کا کام دے گا اور مستی مذہبی تفکّر میں بدل جائے گی. حُسن کی انتہائی تعریف اللہ تعالٰی کی کاملیّت کو ظاہر کرے گی، زلفیں اور گیسُو اسمائے عظمت ہوں گے، لب ہائے شیریں اس کے جوہر کے اسرارِ مخفی ہیں اور بوس و کنار تقدّس کا وجد ہیں:

لیکن پٹھان بانسری سے برآمد ہونیوالا نغمۂ عشق کافی حد تک انسانی ہے اور جنگجو اہلِ کوہ ہونے کی وجہ سے (جن کی اُمیدیں قلیل اور وسائل صرف زندہ رہنے کے ہی مختار رہیں) ان کے تشبیہات و استعارات سادہ ہیں لیکن ان کی پوری شاعری میں آزادی اور حب الوطنی سرایت کئے ہوئے ہے!

بعض شعرائے ریاضت و تقدس کی زندگی گذاری اور بعض صاحب قلم بھی تھے اور صاحب سیف بھی بلکہ سیف میں قلم سے بہتر تھے لہٰذا اُن کے جذبات مردانہ و بہادرانہ تھے، جو صنف نازک سے زیادہ میلان رکھتے تھے اور وہ صوفیانہ سے زیادہ عاشقانہ تھے۔ کم از کم سرحد پر ایسے شعر زیادہ مقبول ہوتے ہیں جو "عمل روحانی" سے زیادہ "عمل جسمانی" سے متعلق ہیں خواہ شاعر کے الفاظ و تراکیب کتنے بھی ماورائی کیوں نہ ہوں۔

اہل یوروپ کے لئے یہ قومی شاعری راورٹی نے دریافت کی اور اس نے اور پھر بلاؤ ڈن نے بہترین شعرا کے انتخابات کے ترجمے کئے۔ ان میں سے دو مقبول ترین مہمند ملا عبدالرحمٰن اور عبدالحمید (پٹھانوں کے شیخ سعدی) تھے جو سابقہ صدی کے اوائل میں پشاور سرحد (شمال) میں ہوئے۔ اوّل الذکر نے مذہبی نظمیں بھی لکھیں اور عشقیہ غزلیات بھی اور موخر الذکر کی دو کتابوں کے تو نام ہی بہت معنی خیز ہیں۔ "کشش عشق" اور "موتیوں اور مونگوں کا مجموعہ (یا ہلک مروارید و مرجان)"۔ قریباً اتنا ہی ہر دلعزیز لیکن مشہور تر جنگجو شاعر خوشحال خان خٹک تھا جو سردار تیری (جنوبی خٹک) خان سر خوابہ محمد کا مورث تھا اور جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اس نے شاعری اور تاریخ کے علاوہ کئی موضوعات پر قلم اٹھایا اور بیدپائے

کی بلند پایہ کہانیوں کا فارسی سے ترجمہ کیا۔ شاعری اور جنگ بازی اِس خاندان کا طُغرہ ہائے اِمتیاز تھے۔ اُس کا بڑا بیٹا اشرف "ہجری" (ہجرت) کے قلمی نام کے تحت لکھتا تھا اور بعد میں اورنگزیب کے قابو آگیا۔ ایک اور بیٹا عبدالقادر اپنے دس بھائیوں کے ہمراہ کئی بچوں سمیت ایک ہی دن ایک فریب کار بھتیجے کی تلوار کی نذر ہوئے اور ایک ہی قبر میں دفن کر دیئے گئے۔ وہ بھی مذاقِ علمی کا مالک تھا۔ پوتا کاظم خان شیدا بھی ادیب و مورّخ تھا۔ مرزا خان انصاری (پیر روشن کی اولاد میں سے) ڈھائی سو سال پہلے معروفِ تخلیق رہا اور اُس کے اخلاف اب بھی میاں خیل کے اہلِ کوہ میں موجود ہیں اور یوسفزئی اسے اپنا سمجھتے ہیں۔ اسی طرح یوسفزئی، بنگش، درّانی اور آفریدیوں کے بھی اپنے اپنے شعراء ہیں جن کے رشحاتِ قلم کسی نہ کسی شکل میں محفوظ ہیں۔

حُسن اناسریون سے لے کر مُور یا فردوسی سے لے کر ٹسّو تک شعراء کا موضوع رہا ہے اور وہ پشتو شعرا کا بھی پسندیدہ مضمون ہے۔ مشرق ہو یا مغرب، افضل ترین موضوعات ایک ہی ہیں اور گو مشرقی معیارِ حُسن و زیبائی و تشبیہہ و اِستعارہ کسی حد تک مغربی سے مختلف ہو سکتے ہیں تاہم پشتو میں فارسی کی طرح فطرت کی چاشنی موجود ہے جو اہلِ مغرب کو اتنی مالوف ہے۔ کیا ایک مغربی عاشق ابروئے یار پر ایک غمناک گیت گاتا ہُوا بھٹی کی طرح آہیں نہیں بھرتا؟ عبدالقادر کہتا ہے: "اُس کی نظر شعلہ گوں ہے۔ اُس کی آنکھیں آتش پارے ہیں جو عاشقوں کے دِل جلا ڈالتے ہیں۔ اُس نے اپنی قندیلِ حُسن روشن کی ہے اور چاہنے والے پروانوں کی طرح اُس پر فِدا ہو رہے ہیں۔ اُس کی آنکھیں کنول ہیں، پُتلیاں سیاہ مکھیاں

ہیں لیکن اُن کی قوتِ دید چشمِ غزال کی مانند ہے۔ اُس کے ابرُو کمان ہیں، پلکیں تیر ہیں اور وُہ انہیں اُٹھاتی ہے تو قیامت ڈھاتی ہے۔"

عبدالرحمٰن کہتا ہے: "محبوبہ کی پلکیں میرے لئے علیؓ کی ذوالفقار ہیں۔۔۔۔ اُس کا چہرۂ حسین سیاہ زُلفوں میں چھپا ہُوا ہے جیسے آبِ حیات ظلمات میں۔"

"تیری زلفوں، لبِ لعلیں اور چہرے سے
رات، شفق اور طلوعِ صبح پیدا ہوتے ہیں
کیا یہ تیرے دہنِ شیریں کے برّاق دانت ہیں
یا شگوفوں پر جگمگاتے ہُوئے قطراتِ شبنم ہیں؟"

رومیو جولیئٹ کے لبوں سے ایک ابدی راحت چُراتا ہے لیکن ایک خٹک شاعر کہتا ہے:

"کوئی اُن کی شیرینی کی تعریف و توجیہہ نہیں کر سکتا
اُس کے لب فردوس کے آبِ حیات کا سرچشمہ ہیں"
"محبوب کے ساتھ ایک لمحہ کے لئے لب بہ لب رہنا
شہد، شیر اور مربّوں کو بُھلا دیتا ہے۔"

مربّہ ایک رومانوی اصطلاح نہ سہی لیکن یہ ایسے ہی ہے جیسے موجودہ زبان نے 'اصلی مربّا' کی اصطلاح وضع کی ہے۔ ایک اور رنگ کی طویل غزل میں رحمان کہتا ہے:

"چہرۂ نگار، آفتاب اور ماہتاب تینوں ایک ہیں
اُس کا قد، سرو اور شمشاد تینوں ایک ہیں

شہد، شکر اور اُس کے لب تینوں ایک ہیں
باغ، فردوس اور کاشانۂ محبوب تینوں ایک ہیں
مجھ جیسے مہجور کے لیے آگ اور ننگی زمین ایک ہی جیسی ہیں۔"

اور پھر کہتا ہے:

"یہ مسجود ہے، وہ حریف	یہ گُل ہے، وہ خار
یہ محبوب ہے، وہ محافظ	یہ خزانہ ہے، وہ ناگ
یہ دانش ہے، وہ عشق	یہ کوفت ہے، وہ تسکین
یہ فراق ہے، وہ وصل	یہ خزاں ہے، وہ بہارِ نو بنو
یہ عبادت ہے، وہ گناہ	یہ نُور ہے، وہ نار
یہ رحمان ہے، وہ مسجود	یہ علت ہے، وہ طبیب!"

مندرجہ ذیل اشعار میں شگفتگی تو ہے لیکن شاید اتنی تابش نہیں:-

"جب میں تیرے چہرے کو دیکھتا ہوں تو میں اللہ کی بے نیازی پر حیران رہ جاتا ہوں جس نے تجھے اس کی شہابی دہک سے محفوظ رکھا ہے۔"

پوپ کے مطابق "حُسن میں ایک تنہا بال سے بھی کھینچ لیتا ہے"۔ اور رحمان کو "صرف اتنی آزادی درکار ہے کہ مجھے زلفِ محبوبہ کی زنجیر سے باندھ دیا جائے" اور درجِ ذیل کے بعض خیالات واضح طور پر اچھوتے بھی ہیں اور شاعرانہ بھی:

"نہ جانے میری محبوبہ اس خوبصورت گڑھے سے کتنے یوسف نکالے گی
اگر وہ چاہِ ذقن میں اپنی زلفہائے دراز کی رسّی پھینکے!"

اگر وہ اُس کے لب ہائے لعلیں دیکھ لیں تو مرآت یمن کے نیلم کی تلاش ترک کر دیں۔

اگر میری محبوبہ کنجِ گلستان میں چلی جائے تو گلِ باغ اپنے دعوائے حُسن سے دستبردار ہو جائے۔

"یوم حشر و نشر میں بھی کامگار (اپنی محبوبہ کا) دامن نہ چھوڑے گا!"

"وہ اُن داغوں کا مذاق اُڑاتا ہے جنہوں نے کبھی زخم محسوس نہیں کیا" کو کوہستان میں رحمٰن نے یوں بیان کیا ہے:

"اگر تو چٹانِ عشق سے گر جائے تو تیرے دانت ڈھیلے پڑ جائیں گے۔ تو، جو انہیں غصّے سے میرے اُوپر پیستی رہتی ہے"

خوشحال خان خٹک کے بعض اشعار مُور کی یاد دلاتے ہیں:

"جہاں تو آرام کرتی ہے وہاں روشِ گُل ابھر آتی ہے۔ تو چمن میں سیر و گشت کرتی ہے تو دلِ لالہ داغدار ہو جاتا ہے۔ جب بادِ نسیم تیری سیاہ زُلفوں کو صبیح چہرے پر بکھیر دیتی ہے تو چار سُو بُوئے مُشک و عنبر پھیل جاتی ہے۔"

چونکہ تیری زلفوں میں میرا دِل گُم ہے اِس لئے اپنا چہرہ دکھاؤ کیونکہ تاریکیٔ شب میں ہم نُورِ چراغ سے ہی دفینے تلاش کرتے ہیں۔"

"میری دلربا محبوبہ کے حُسنِ صورت نے ظاہر کیا کہ رویئں رویئں میں شعلۂ عشق سوزاں ہے۔

"جب مَیں اُس کی چشمِ نیم باز دیکھتا ہوں تو ساغرِ دل شرابِ سرور

سے چھلک اُٹھتا ہے۔"

"تیرے مارِ زُلف کا ڈسا ہُوا کبھی صحت یاب نہیں ہوتا۔ نہ زیارتیں سُودمند رہتی ہیں اور نہ جادُو لیکن غم و اندوہ کافور ہو گئے ہیں اور میرے ہاتھ میں آج جامِ مسرت ہے۔

تیرے ہونٹوں کے امرت نے کوثر کو بھی شرما دیا ہے، جُوئے فردوس کو بھی اور روضۂ اقدس کے چشمے کو بھی۔"

"جس نے اُس کی بارگاہ میں قدم رکھا وہ در و دیوارِ فردوس کو بھُول گیا۔ بہشت آئندہ زاہد و عابد کی اُمید ہے لیکن خوشحال تجھے ملتے ہی جنت پا لیتا ہے۔"

کبھی کبھار محبوبہ شرمیلی ہوتی ہے اور اشرف خان کو شکوہ ہے:

"وہ وعدۂ وصل ہمیشہ کل پر ٹالتی رہتی ہے۔ بھلا دلِ زار کو اِس سے کیا تسکین ہو سکتی ہے؟"

بقول راورٹی خوشحال خان کے ستاون بیٹے تھے لیکن وہ آفریدی خواتین کا ذکر آتے ہی بے خود ہو جاتا تھا:

"آدم خیل آفریدی دوشیزائیں حسین و دلرُبا ہیں۔ غزالی آنکھیں، پلکیں لمبی لمبی اور جُھکی جُھکی، ابرو محرابی، لب شہد آگیں، رخسار گلابی اور چہرے ماہ گوں۔ دہن تنگ شگوفہ آسا، دانت سفید اور موزوں، سر گول اور سیاہ، معنبر زلفوں سے ڈھکے ہُوئے۔ پاؤں چھوٹے، ایڑیاں مدوّر اور کُولہے نمایاں، معدہ نازک، سینہ چوڑا اور کمر پتلی۔ الف قامت اور سفید رُو۔

میں باز کی طرح پہاڑوں پر پھرا ہوں اور بہت سے گداز تیز میرے فتراک میں آئے ہیں؛

خار اکثر گل سے پیوست ہوتے ہیں اور رحمان کہتا ہے :

" جب تک سینکڑوں کانٹے اُس کے دل میں نہ چبھیں، بلبل کیسے گل تک راہ پا سکتا ہے ؟[1]"

عبدالحمید اسی تخیل کو زیادہ نفاست سے بیان کرتا ہے :

" جیسے گل جتنا زیادہ چھپا ہوا ہو اُس کی خوشبو اتنی ہی زیادہ اُمنڈتی ہے ایسے ہی غم عشق صبر و تحمل سے ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔"

ماضی میں خٹک جام شراب سے دل بہلاتے تھے اور خوشحال کئی جگہ پر اس کے گُن گاتا ہے :

" اے ساقی : شفاف نیلی صُراحی سے مجھے اِس مئے حیات آور کا ایک جام بھر کر دو جو غم کا مداوا ہے اور اندوہ کا درماں ۔

" مجھے ثروت دُنیا سے کیا ؟ وہ تو ایک جام شراب کے برابر بھی نہیں !

" ساقی سے ایک جام لو کیونکہ اِس میں سرور فراواں اور نور جاوداں ہے۔"

---

[1] . بلبل کی وابستگی اپنی "سلطانہ، گلاب" سے ایک مستقل مشرقی تخیل ہے :

" وہ بانکی جس کے لئے وہ نغمہ ہائے شیریں
اور ہزاروں گیت بلندیوں سے گاتا ہے !" (بائرن)

اس کی غزلیات کا میدان دوسرے پٹھان شعرا کے مقابلے پر وسیع تر اور متنوّع ہے ۔ وہ بہار کے گیت بھی گاتا ہے جو روئے زمین کو گل و گلزار بنا دیتی ہے، "جس کی ہوائیں قبائلیوں کے لئے شراب سے بھی زیادہ مخمور کُن ہیں جب دوشیزائیں اپنی چھاتیوں پر اور نوجوان اپنی پگڑیوں میں گلدستے رکھ لیتے ہیں" پھر وہ ان نوجوانوں کو بیان کرتا ہے جنہوں نے "اپنی چمکدار تلواروں کو خونِ دشمن سے لالہ گوں کر لیا ہے جیسے لالہ (دل کا گلِ داغدار) گرمی میں کھلتا ہے، 'وادیٔ خیبر کو سُرخ کر دیا ہے اور کرّپہ سے باجوہ تک جنگ کی افراتفری پھیلا دی ہے۔' وہ کہتا ہے" تلوار کے بغیر نجات کہاں"؟ وہ اپنے آباد اجداد کے کارناموں پر فخر کرتا ہے جو 'پیار اور تلوار' ہمت اور مروّت کے دھنی تھے، جن کے رفقاء مردانِ حُر تھے جو اپنی زندگیوں سے کھیلتے تھے، جو اپنے معاملات میں کھرے تھے اور خون میں نہا کر دفن ہوتے تھے، وہ ایسے ہی جانباز تھے"۔ اُس کے لئے وطن سے بڑھ کر کوئی مقام نہیں۔ 'یہ خطۂ بہشت ہے' اور وہ اللہ تعالیٰ اور اپنے آباؤ اجداد کا ممنون ہے کہ انہوں نے اُسے 'سیاہ پہاڑی سلسلوں اور سندھ کے نیلے پانیوں میں چُنا' کون بتا سکتا ہے کہ یہ بارش کے بعد بہار میں کتنا دلربا ہو جاتا ہے؟ کالا پانی کے جنگلوں میں شکاری کتّوں کے ہمراہ باز اور شکرہ کا شکار کتنا من موہن ہے؟ کیا اس کی پہاڑیاں سیدھی آسمان تک نہیں جاتیں اور ان پر چڑھ کر ہم اپنی فکر بھی سے نجات نہیں پاتے؟" "کیا اس کے جوان تندرست اور تنومند، چُست اور چاق و چوبند، خوش نظر، سُرخ و سفید اور بلند و بالا نہیں ہیں"؟ "کیا دریائے کابل اور باڑہ ندی کے پانی شربت سے زیادہ شیریں اور

لذیذ نہیں؟" یہ اُس کے لئے کوثر و تسنیم ہیں اور وہ مغلوں کی قید میں اِنہی کا سوچتا ہے جہاں اُسے ہندوستان کے پانی پینے پڑے جو اُس کی وحشت خیز آب و ہوا سے بھی بدتر ہیں:

" اے بادِ صبا! اگر تو خیر آباد کے پاس سے گزرے،
کنارِ سندھ یا اکوڑہ خٹک کے پاس سے،
تو میرا سلام محبت و اُلفت پہنچا دو، صدبار
اباسین کو گنجیلی آواز سے پکارو لیکن لنڈے (دریائے کابل) سے
سرگوشی کرو اور کہو شاید میں ایک دفعہ پھر تیرے پانی کو نوش کر سکوں"۔

خدا کا شکر ہے کہ اِس جانباز جنگجو شاعر کو واپس جانا اور اپنی چاہیتی ندی کے بہت سے جام ہائے آب پینا نصیب ہُوا اور وہ بہت سے گیت لکھ سکا جو قبائلیوں کے قلب و صدر میں ہر وقت مچلتے ہیں:

نوٹ: ایک پشاوری جامِ مئے کے کناروں پر یہ اشعار مرقوم ہیں:

ساقیا برخیز و درده جام را
خاک بر سر کُن گردشِ ایّام را
ساغرِ مئے بر کفم نہہ تا ز سر
بر کشم ایں دلق ازرق فام را

اڑتیسواں باب

کوہِ سیاہ

شرقی سندھ میں سنگلاخ پہاڑ کی ایک چھوٹی سی پٹی ہے جو اِس دریا اور برطانوی ضلع ہزارہ سے بننے والے جنوب مغربی کونے پر محیط ہے اور اس کے ذکر کے بغیر یوسفزئی قبائل کا کوئی بیان مکمل نہیں ہو سکتا۔ میجر بٹی اور کیپٹن اُرمسٹن کے قتل اور تادیبی مہم نے اِس کی دلچسپی کو تلخ بنادیا ہے ورنہ بلحاظ وسعت یا بلحاظِ آبادی یہ کسی اہمیت کا حامل نہیں۔ قبائل نہ کثیر التعداد ہیں نہ جنگجو بلکہ بیحد غریب ہیں لیکن وہ خود اور ان کی پناہ میں آئے ہوئے مجسم فتنے، کافی مدت سے دردِ سر بنے رہے ہیں اور جیسے اچھی کاشت کاری کے لئے بعض اوقات باغ کے کیڑے مکوڑوں کا استیصال ضروری ہوتا ہے ایسے ہی اچھی حکومت کے لئے ایک اور نوع کے کیڑوں کا سدِّ باب بھی ضروری ہوتا ہے تاکہ ہمارے دیہات نذرِ آتش نہ ہوں، دیہاتی اغوا نہ ہوں، ان کے جانور چوری نہ ہوں اور ہمارے افسر قتل نہ ہوں!

ایک طویل، تنگ گرنیائیٹ کی پہاڑی جو تیز نہیں بلکہ گول ہے اور ۲۵ تا ۳۰ میل لمبی ہے اور شملہ یا ڈلہوزی کی نسبت مری یا ٹھنڈیانہ سے زیادہ مشابہ

ہے جس کی اوسط بلندی ۸۰۰۰ فٹ ہے اور بعض چوٹیاں ۱۰۰۰۰ فٹ تک بلند ہیں، بہت سی عمودی اور چٹانی شاخیں پہلوؤں سے ہر طرف آگے کو بڑھی ہوئی ہیں اور جس کی تنگ وادیوں کے درمیان قبائلی گاؤں ہیں۔ ان شاخوں کے ساتھ ساتھ (جن کی چوٹیاں کہیں کہیں سطوحِ مرتفع بن جاتی ہیں) ایسی کشادہ جگہیں ہیں جہاں بڑے لشکر جمع ہو سکتے ہیں۔ ان کے پاس قابلِ عبور درّے ہیں اور گاؤں پر قدرت حاصل کی جا سکتی ہے۔ انہی کے راستے ہماری فوج ۱۸۵۲ء، ۱۸۶۸ء اور ۱۸۸۹ء میں بڑھ کر بلند ترین چوٹیوں پر قابض ہوئی۔ زیریں ڈھلانوں پر جنگلی پودے اور ببول اُگے ہیں لیکن بلندیوں پر ہمالوی سرو سیمیں کے جنگلات ہیں جن کے تیرہ و تار سائے نے اس پہاڑ کو کوہ سیاہ کا نام دیا ہے۔ ایک ایسا سایہ جس میں کہیں کہیں شاہ بلوط، انجیر اور موترا کی ہریالی اور ہرے بھرے جنگلی راستوں نے تنوع پیدا کر دیا ہے۔ یہ سارا علاقہ خوب سیراب ہے۔ ڈھلانوں میں بہت سے چشمے ہیں اور سندھ میں گرنے والی بعض ندیاں خوب وسیع و عریض ہیں۔ زیادہ حصہ چٹانی اور پتھریلا ہے لیکن کئی جگہیں موسم پر گندم، باجرہ، سرسوں اور چارے وغیرہ سے لہلہاتی ہیں۔ یہاں کی آب و ہوا، بہار، گرمی اور خزاں میں اعلیٰ ترین ہے لیکن سردیوں میں کبھی کبھار برفباری آمد و رفت کو معطل کر دیتی ہے۔ یہ سب کوہ سیاہ ہے جو مری سے بہتر صحت افزا مقام ہو سکتا ہے لیکن افسوس کہ یہاں روحِ آدم ملکوتی نہیں ہے۔

اِس کی ڈھلانوں کے زیادہ تر باشندے فرشتہ سیرت نہیں لیکن وہ سب کے سب خطاوار بھی نہیں اور شاید وہ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ اُن کی بداعمالیاں بُری اور مفسدانہ صحبت کا نتیجہ ہیں۔ مغربی رُخ کے قبائل عیسیٰ کے اخلاف حسن زئی اور اکازئی ہیں اور ملّی کے اخلاف چگرزئی ہیں جو سب یوسفزئی ہیں۔ اکازئی کمزور ہیں لیکن بہترین جنگجو ہیں اور حسن زئی کے خان خیل کے ساتھ مل کر حالیہ دَور میں بہت تکلیف دِہ ثابت ہوئے ہیں۔ چگرزئی تعداد میں زیادہ ہیں لیکن تجارت و زراعت کے رسیا ہیں اور ان کی دولت ان کے جانور ہیں۔ ایک دفعہ وہ امبیلا میں کریگ چوکی تک آئے لیکن گرماگرم استقبال سے فوراً اپنے گھروں کو واپس اُتر گئے۔ حسن زئیوں نے کارنے اور ٹپ کو قتل کیا اور غالباً ان تینوں قبائل نے سادات اور ان کے حواریوں کے زیرِ اثر بٹی اور اُرمسٹن کو مارا لیکن اِن میں سے کوئی بھی مغربی یا ماورائے سندھ قبائل کے اوصاف کا مالک نہیں۔ دیگر تمام اطراف پران کے ہمسایہ قبائل قطعاً مختلف ہیں اور نسلاً بھی جُدا ہیں۔ جنوب میں تناول ہے، ہزارہ کا وحشی ترین حصّہ، ہمارے باجگزار نواب امب کا محکوم اور تناولی سرے سے پٹھان نہیں ہیں۔ ملحقہ علاقہ اگرور ایک اور باجگزار خان کے تحت ہے اور لوگ زیادہ تر سواتی اور گوجر ہیں۔ مشرق کی طرف کوہ سیاہ اور ضلع ہزارہ کے درمیان ٹکری، نندہار، دلیشی اور الاّئی کی وادیاں ہیں جن کے سب لوگ سواتی ہیں۔ یہ لوگ سوات کے نہیں بلکہ وادی کے قدیم باشندے تھے لیکن دلازاک نے انہیں پہاڑوں میں دھکیل دیا اور پھر یوسفزئیوں نے انہیں سوات اور بنیر سے نکال باہر

گیا اور یہ مجبوراً ہزارہ اور کسی حد تک کافرستان میں منتقل ہو گئے۔ جن وادیوں میں اب یہ مقیم ہیں اور اکثریت میں ہیں وہاں اصطلاح سواتی کے تحت قدیم النسل آریہ یونانی عنصر بھی ہے اور ہندوؤں، ترکوں، پٹھانوں اور گوجروں کی آمیزش بھی۔ گو اب وہ اکثر و بیشتر اپنے کو پٹھان کہتے ہیں تاہم پٹھان اِن سے بے پناہ نفرت و حقارت سے پیش آتے ہیں۔ پٹھان کی برائیوں اور سنی کٹرپن کے سوا ان میں کوئی چیز مشترک نہیں۔ قد و قامت اور ہمت میں پٹھان سے گھٹیا، وہ جبلی طور پر حریص اور قاتل ہیں اور سب انہیں بزدل، دھوکہ باز، ظالم، لالچی اور کاہل بتاتے ہیں۔ "پٹھان کا بے خوف و بے تکلف انداز مضروب پلے کی بے کسی میں بدل جاتا ہے۔" جرم کرنے یا کم از کم کسی آلۂ کار کے ذریعے جرم کروانے پر ہر وقت کمر بستہ۔ لیکن اتنے بڑے علاقے پر پھیلے ہوئے پورے قبیلہ کے متعلق فیصلہ صادر کرنا درست نہیں جبکہ اُس کے متعلق معلومات محدود ہوں۔ ہماری معلومات و مہمات کے مطابق وہ صرف دھوکہ اور غداری میں ہی قابل ہو کر دشمن ہو سکتے ہیں۔ اندرونی اور پٹھانوں کے ساتھ منافقت کی وجہ سے وہ ہمارے خلاف صرف انتقام سے بچنے کے لئے ہی اکٹھے ہو سکتے ہیں اور ہمیں سواتیوں کو مستقلاً قابو میں رکھنے کے لئے کوہِ سیاہ پر مضبوط اور دائمی مورچہ بنا لینا چاہیئے۔

پہاڑی وادیوں میں سادات اور دیگر شر پسند عناصر کی بھی کئی بستیاں ہیں۔ مشرقی ڈھلان کی دو وادیوں میں (جو بلند ترین چوٹی مُچھی سے ترنڈ کے

دلیشی قلعہ تک پھیلی ہوئی ہیں) پر یاری سید مقیم ہیں۔ مغربی رُخ پر حسن زئیوں کے درمیان ڈلّی کے سادات ہیں اور ایک دو بستیاں چگرزئی علاقے میں بھی ہیں۔ شمال مغربی کونے میں اخوند خیل کی زبردست جمعیت سندھ تک پھیلی ہُوئی ہے۔ وہ تعداد میں کم ہیں لیکن دریا پار سے انہیں کمک مل سکتی ہے۔ سابقہ مُہم میں اگر کارروائی فوری نہ کی جاتی تو یہ بستیاں شورشوں کے گڑھ بن جاتیں اور متصل پٹھان اور سواتی قبائل کے سرپھرے بھی ان سے مل جاتے۔

مجموعی طور پر کوہ سیاہ پر تمام متحارب نفری مشمولہ پٹھان و سادات وغیرہم بمشکل ہی چھ سات ہزار سے متجاوز ہوگی جس میں شاید نصف سے کم توڑے دار بنادیق سے مسلح ہے اور بقایا صرف تلوار یا نیزے کی مالک ہے۔ چگرزئیوں کے ساتھ ماورائے سندھ کے ایک یا دو ہزار مزید جنگ باز ہم قبیلہ بھی مل سکتے ہیں اور سواتی، الائی، نندہاری، ٹکری وال، دلیشی وال اور تھاکوٹی تیرہ چودہ ہزار نیم مسلح کا اضافہ کر سکتے ہیں بشرطیکہ اعلانیہ پالیسی سازگار ہو۔

جنرل سرجان میک کوئن کے تحت حالیہ مہم اکازئی، حسن زئی، پریاری سادات اور ڈلّی کے ہندوستانی اہلِ جنوں کے خلاف بھیجی گئی تھی۔ یہ ایک وسیع پیمانے پر قبائلیوں سے بدرجہا بہتر فوج کے ساتھ انجام دی گئی اور اس نے نہایت قلیل وقت میں تیز رفتاری کے ساتھ فیصلہ کُن کارروائی کی۔ صرف ایک دفعہ مٹھی بھر اہلِ جنوں یا مجاہدین نے بند و قچیوں پر حملہ کیا، دیوانہ وار حملہ جس میں میجر بیلی مارا گیا لیکن پھر کیا ہُوا؟ یہ سرباز ہراول دستہ صفحۂ ہستی سے مٹادیا گیا اور

باقیماندہ بھاگ کھڑے ہوئے، چٹانوں یا درختوں میں چھپ گئے یا گھات میں رہے۔ بہرحال یہ ایک کامیاب سبق تھا لیکن بلند پایہ حکمتِ عملی یا مستقل اثرات کے لحاظ سے شاید یہ مالی و جانی نقصان کا ہم پلہ نہ تھا۔ مجرم قبائل کو سخت سزا دی گئی، کافی مجاہدین ختم کر دیئے گئے، فصلیں اور گودام تباہ کر دیئے گئے یا قبضا لئے گئے (جو شاید حملہ آوروں کے نہ تھے) اور سرغنے گرفتار کر لئے گئے اور ان کے گاؤں جلا دیئے گئے۔ فوج بلند ترین چوٹیوں پر چڑھی، مشکل ترین وادیوں میں خیمہ زن ہوئی اور یہ ثابت کر دیا کہ ہمارے گولے اور سپاہی مجاہدین کے قلعوں کو سر کر سکتے تھے اور باغی بستیوں کو پتہ چل گیا کہ میدان کی مقدس تربیت گاہوں سے نکلنے والے داعیانِ بغاوت اتنے ہی بے اثر تھے جتنی ان کی روایتی چریں تو پیں۔ قبائل کو سرِ اطاعت خم کرنا پڑا اور عائد کردہ جرمانہ دینے کا وعدہ کرنا پڑا جبکہ ان کے حلیف اور ہمسائے ہمارے عقب پر نہایت بچ بچ کر فائر کرتے رہے مبادا ایک سرکاری مراسلہ پارلیمنٹ کا اجلاس بلانے کا جواز اور مزید غیظ و غضب کا موجب بنے۔

مہم اتنی مختصر تھی کہ ہمارے نقشوں کی غلطیاں درست نہ ہو سکیں اور شعبۂ جغرافیہ کی جغرافیائی معلومات میں اضافہ نہ ہو سکا اور جلد واپسی نے غلط فہمی بھی پیدا کی اور شورش پسند قبائل کسی آئندہ موقعہ کا انتظار کرنے لگے۔

معقول تر حل یہ تھا کہ سال ہا سال کے تجربات اور وعدہ شکنیوں کے حوالے سے ہم اعلان کرتے کہ ہمارا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا ہے اور ہم

سرحد کو سندھ تک بڑھا کر انہیں اپنی رعایا بنا رہے تھے۔ سندھ شمال اور مغرب کے ساتھ ساتھ قدرتی سرحد ہے گو اس کی گذرگاہ پر معلومات اور اس کے کناروں کے ساتھ سڑک کے امکانات اس وقت تک کسی نقشے پر نہ دکھائے گئے تھے[1]۔ دربند سے سڑک کچھ فاصلے کے لئے گھوڑ سوار کے لئے ٹھیک ہے لیکن حسن زئی علاقے میں کوٹکئی سے آگے مشکل ہے (جیسا کہ ہماری فوج کو تلخ تجربہ ہوا) اور اس سے بھی اوپر اتنی ڈھلوان ہے کہ خچر بھی نہیں چل سکتے۔ ایک دستۂ فوج نے تھاکوٹ کا چند گھنٹے میں طائرانہ جائزہ لیا لیکن چگر زئی علاقہ کے معائنہ کا موقع کھو دیا۔ تھاکوٹ سے اوپر کے علاقہ سے ہم سراسر نابلد ہیں اور شاید میجر بڈلف ہندوکش پر اپنی کتاب میں بالائی سندھ کے پردے میں کچھ بتا سکے؛

موجودہ نقشوں کے مطابق الائی وادیٔ شمال کی موزوں ترین سرحد ہے اور گیارہ بارہ ہزار فٹ اونچے سلسلہ سے جدا ہونے کے باوجود برطانوی ہزارہ سے ہم سرحد ہے۔ اسے عبور کریں تو ایک طویل سرسبز و شاداب وادی ہے، کوئی ۱۲ میل چوڑی، سندھ کے سیدھے رخ پر، اس کی وسطی ندی سرہان سندھ سے برکوٹ کے مقابل جا ملتی ہے اور ۱۵ ہزار سے بلند تر سلسلہ اسے شمال میں کوہستان سے جدا کرتا ہے۔

---

[1] ہماری چوکیوں سے بیس میل کے اندر کے دریا کو بہترین نقشوں پر بھی اندازاً نقطوں سے ظاہر کرنا، ایسے نقطوں سے جو ایک موقعہ پر کئی میل غلط ثابت ہوئے ایسی حماقت ہے کہ تبصرہ کی متحمل نہیں؛

یہ یا کوہِ سیاہ کو گھیرتی ہُوئی کوئی اور سرحد کم سے کم خرچ پر مسئلہ کو حل کر دیتی۔ مخالفت اتنی ہی ہوتی جتنی عارضی قبضہ کی لیکن اس کے فوائد زیادہ اور مستقل ہوتے، یوسفزئی قبائل پر خوشگوار اثر ہوتا، فوج کو صحت افزا چھاؤنی میسّر آتی جہاں پانی اور ایندھن وافر ہوتے اور ہم ایک بہترین حربیاتی مورچہ کے مالک ہوتے جو قدرتی دفاع کا کام بھی دیتا اور وادیٔ ہزارہ میں سے بآسانی نکلنے والی ریلوے لائن کے ذریعے عقبی مواصلات سے منسلک ہو جاتا! مزید برآں چند سال کی اچھی حکومت موجودہ وحشیوں کو اتنے ہی منضبط اور خوشحال بنا دیتی جتنے ہمسایہ اہلِ ہزارہ ہیں اور ہماری سرحدی پالیسی میں ٹھوس اصول کارفرما ہو سکتے!!

اُنتالیسواں باب
یاغستان کی ایک جھلک

ہماری سرحد سے تھوڑے ہی فاصلے کے اندر دریائے سندھ کے متصل علاقوں کی نسبت وسطِ ایشیا کے دُور افتادہ خطوں کے متعلق زیادہ معلومات حاصل ہیں۔ اِس کی وجہ بالائی سندھ کی غیر معمولی دشوار رسی ہے، بے محابا مجمع الجبال جن سے دریا گذرتا ہے، اتھاہ وادیاں جن میں صرف کسی نالے کے ساتھ ساتھ تنگ پگڈنڈیاں کھلتی ہیں جو سر پر معلق چٹانوں کے درمیان بہتے ہیں اور صرف مشاق چٹان پیما ہی ان پر چل سکتا ہے، سڑکوں کا نام و نشان نہیں، صرف لیکیں ہیں، برچ کی گندھی ہوئی شاخوں کے سوا کوئی پل نہیں جو ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ بل کھاتے ہیں اور جہاں سال کے اکثر مہینوں میں آمد و رفت کا کوئی امکان بھی نہیں ہوتا! مزید برآں جنون آمیز اور قانون شکن قبائل تاجروں اور مسافروں کا راستہ روک لیتے ہیں اور وہ ہماری سرحد کے ساتھ ہی مقیم ہیں۔ لیکن ان وسیع و زرخیز وادیوں اور پہاڑوں میں ایسے کثیر التعداد اور خوشحال لوگ ہیں جو قرنہا قرن سے گرد و پیش کے واقعات سے ٹس سے مس نہیں ہوئے اور اپنے رسم و رواج، زبان، نسل اور مذہب پر راسخ ہیں!

کوہ سیاہ کی حدود سندھ کے بائیں طرف پٹھان کی حدود متعین کرتی ہیں گو
وہ دائیں طرف کافی اوپر تک بھی موجود ہے۔ دور بنیر کے اوپر کی بغلی وادیوں میں
خالص النسل یوسفزئی ہیں جو سوات سے اپنے روابط قائم رکھے ہوئے ہیں۔
پھر مخلوط النسل قبائل آتے ہیں جن کی رگوں میں پٹھان خون اور گفتار میں پشتو کی
آمیزش ہے اور جو اکثر دینیچہ یعنی دو غلے کہلاتے ہیں۔ اس سے آگے
افغان نسل معدوم ہے یا صرف منتشر بستیوں تک محدود ہے۔ کافی فاصلے تک
دور دورہ اسلام کا ہی ہے جو قلعہ مجاہدین، پلوسا سے شروع ہوتا ہے۔ اس
مجاہد بستی کا واحد سہارا ہندوستانی حامیوں کے چندے اور عطیات ہیں۔ یہ لوگ
کوہ سیاہ مہم سے منتشر ہونے سے پہلے قواعد کرتے تھے، عربی میں حکم دیتے
تھے، جن میں توپوں سے سلامی دیتے تھے اور برطانیہ کی کافرانہ طاقت کو زیر و زبر
کرنے کے طوفان اٹھاتے تھے لیکن اب وہ تتر بتر ہو گئے ہیں اور ان سے
آگے کوہستان کی اکا دکا جگہوں پر ایسے مسلمان ملتے ہیں جو اپنے سر منڈواتے
ہیں، گھوڑے کے بے ہنگم بت پوجتے ہیں اور قرآن حکیم کے ایک لفظ سے بھی
آشنا نہیں!

ٹکری، نندہار اور دیشی کی نسبتاً مختصر لیکن زرخیز وادیوں میں اکثر لوگ
سواتی ہیں، مذہباً مسلمان، پٹھان ہونے کا دعوے کرنے والے لیکن نسلاً ملحقہ
وادیوں کے لوگوں سے زیادہ مربوط و منسلک! الائی وادی بزرگ تر اور عمدہ تر
ہے اور اس کا بھی یہی حال ہے، سندھ میں گرنے والی ایک ندی سے سیراب و
شاداب جس کا قریباً ایک چوتھائی سادات اور دیگر مذہبی برادریوں کے تصرف

میں ہے۔ سب میں آبپاشی فراواں ہے اور کافی چاول اور مکئی پیدا ہوتے ہیں۔ آلائی کے مشرقی سرے پر گھاس اور جنگل سے ڈھکی ہوئی پہاڑی ڈھلانیں ہیں اور ان پر گندم اور باجرے کے کھیت اور خوشحال گاؤں ہیں۔ اس وادی کی متحارب نفری ۰۰۰، ۷ ہے جبکہ اول الذکر تینوں کی ۰۰۰، ۸ اور یہ سب ترنڈ اور بٹاگرام کے خوانین کے تحت ہیں۔ دریا کے مقابل غوربند اور کنرا وادیاں ہیں اور آخر الذکر خالص سیّد بستی ہے۔ ایک ۰۰۰، ۱۵ فٹ اونچا سلسلہ آلائی کو کوہستان سے جدا کرتا ہے جو سندھ اور ہزارہ کے بالائی حصہ یعنی کاغان کے درمیان برفپوش چوٹیوں اور چٹانوں کا ایک ہزار مربع میل رقبہ حائل کر دیتا ہے اور پھر اس دریا کے مغرب کی طرف دیر اور چترال تک پھیل جاتا ہے۔ افغان دریائے کابل کے مغربی علاقہ یا اس علاقہ کو جہاں وہ قدیم تر باشندوں کو صرف جزوی طور پر ہی دبا سکتے ہیں "یاغستان" کا نام دیتے ہیں یعنی باغیوں یا آزاد لوگوں کا ملک۔ اس اصطلاح کے تحت وہ تمام چھوٹی چھوٹی جمہوریتیں آجاتی ہیں جو حاکم بالا کی منکر یا اس سے بے نیاز ہیں۔ ورائے سندھ کوہستان کا اہم پہلو دو وادیاں ہیں جو ہزارہ سے سندھ تک شرقاً غرباً پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ نیلا ندی اور شجر گاہ ہیں جن کو ۰۰۰، ۱۷ فٹ بلند سلسلہ جدا کرتا ہے۔ دونوں ندیاں علی الترتیب جلکوٹ اور پلاس کے مقام پر سندھ میں مل جاتی ہیں۔ برسبیل تذکرہ یہاں ایک اچھی سڑک بن سکتی ہے، کاغان یا بھوگرمنگ کا کوئی درہ کھول کر ہزارہ سے سندھ تک! اس وقت موجودہ اصطلاح کے مطابق کوئی سڑک نہیں اور سردی میں صرف دریا ہی واحد ذریعہ آمد و رفت ہے اور وہ بھی بار بار عبور کرنا پڑتا ہے۔ تجارت صرف عمارتی لکڑی تک محدود ہے

لیکن سندھ پر واقع پتن علاقہ کافی بڑا، زرخیز اور گنجان آباد ہے اور اگر مجمع الجبال کا کوئی صدر مقام ہو سکتا ہے تو پتن ہی شاید کوہستان کا صدر مقام ہو سکتا ہے۔

لوگ اس علاقے کو شینکاری یا شینوں کا علاقہ کہتے ہیں۔ سب مسلمان ہیں لیکن پٹھان نہیں، غالباً ہندی الاصل قبائل کے باقیات جو مسلمان حملہ آوروں کے دباؤ سے مسلمان ہو گئے۔ وہ طاقتور، ہٹے کٹے، متناسب الاعضاء، سیاہ فام، عقاب نظر، تیکھے نقوش والے، بہادر لیکن امن پسند، مہمان نواز اور مذہب میں اعتدال پسند بتائے جاتے ہیں اور کئی وادیوں میں تو ہنوز ہندوانہ رسوم کے پابند اور بت پرست ہیں۔ کئی بولیاں (جن کا بڈلف نے بہت دلچسپ ذکر کیا ہے) سنسکرت پر مبنی ہیں لیکن ان میں پشتو کا بھی کافی عمل دخل ہے۔ وہ اور شمال اور شمال مغرب کے قبائل بعض مبصرین کے مطابق درد ہیں اور علاقہ دردستان ہے لیکن جہاں تک ان کا تعلق ہے یہ اصطلاح گمراہ کن ہے۔ سندھ پر کوہلی اور پلوس کے قریب کچھ لوگ درد ضرور کہلاتے ہیں لیکن وہ ایک فرومایہ سا قبیلہ ہیں، مختلف النوع نسلوں کے درمیان جو مختلف بولیاں اور زبانیں بولتی ہیں اور مختلف ناموں سے پکاری جاتی ہیں۔ اگر لفظ درد اغلباً آریہ ماخذ کے لوگوں کا مظہر نہ ہو تو پھر اس کا ان پر اطلاق نہیں ہو سکتا۔ زبان، پوشاک، عادات اور نسل میں وادئ سندھ کی یہ برادریاں گلگت، استور (کشمیر) اور لداخ کے لوگوں سے بہت مماثل ہیں جیسا کہ کننگھم نے بیان کیا ہے۔

ایک اور ہزار مربع میل کا مزید پہاڑی علاقہ چلاس ہے جو جنوب

میں کچھ فاصلے تک ہزارہ کا ہم سرحد ہے اور کوہستان، سندھ اور کشمیر کے درمیان واقع ہے۔ یہ برادریاں مہاراجہ کشمیر کی اطاعتگزار ہیں اور بکریوں یا خاک زر بطور خراج دیتی ہیں اور ایک تو سالانہ تین یرغمالی کشمیر بھیجتی ہے لیکن ریاست کے افسر نہ مداخلت کرتے ہیں اور نہ چلاس آتے ہیں کیونکہ اقتدار نمائی مزاحمت پیدا کر سکتی ہے۔ یہ دریا کشمیر، گلگت یا یاسین سے اتنی ناقابلِ رسائی ہیں کہ معمولی سی مزاحمت بھی ایک بڑے لشکر کو روک سکتی ہے۔ سکھوں کی کشمیر سے فرستادہ مُہم چلاس میں بُری طرح ناکام ہوگئی تھی۔ یہاں کی بلند ترین چوٹی "ننگا پربت" (ننگا پہاڑ) ہے جو ۲۶،۷۰۰ فٹ ہے۔ یہ ایک شاندار چوٹی ہے لیکن گلگت کے مقابلے پر محض ایک پہاڑی کیونکہ اس کے مختصر سے رقبہ میں بیس چوٹیاں ۲۰ تا ۲۴ ہزار فٹ اور آٹھ چوٹیاں ۲۴ تا ۲۷ ہزار فٹ بلند ہیں۔ باقی چلاس زیادہ تر برفوں اور چٹانوں پر مشتمل ہے، ۱۱،۰۰۰ فٹ سے زیادہ بلند جس کے اوپر نیچے ۵،۰۰۰ فٹ تک صنوبر کے جنگلات ہیں اور اس سے نچلی ڈھلوانوں اور کوئی نصف درجن بڑی وادیوں میں گھاس اور جنگلی سبزیات جیسے ریوند چینی، گاجر، پیاز وغیرہ ہوتی ہیں جو جانوروں کا مَن بھاتا کھاجا ہیں۔ سندھ کی طرف کچھ کھیت بھی ہیں، بالخصوص چلاس گاؤں کے اردگرد کی وادیوں میں لیکن مجموعی منظر سنسکرت لفظ 'پربت' کی تصویر ہے' ننگا اور کم شجر پہاڑ۔ بارش قریباً ناپید، بس سال میں ایک ہی دفعہ ہو جائے تو غنیمت ہے لیکن پہاڑی ندیوں سے آبپاشی خوب کی جاتی ہے۔

لوگ کوہستانیوں کی نسبت نو مسلم ہیں، سوات کے ملاؤں کے طفیل اور اپنے ہمسایوں کی نسبت کافی پُرجوش اور با عصبیت ہیں۔ بعض کا اپنا اپنا مذہب ہے اور

ایک قبیلہ تو گھوڑے کا بے ڈھب بُت پُوجتا ہے جس کا نام طیبنس گھوڑا ہے۔
اکثر سنّی ہیں اور شیعہ کو برداشت نہیں کرتے اور اُسے غلامی کا موقعہ بھی نہیں
دیتے۔ وہ بیرونی دنیا سے بالکل منقطع نہیں ہیں جیسا کہ ہم سمجھتے ہیں۔ بالائی سوات
سے کنڈیا وادی میں سڑکیں آتی ہیں، یاسین سے ساؤین اور تنگیر وادیوں تک (جو
خوب وسیع و زرخیز ہیں) بلکہ سندھ تک، کاغان (ہزارہ) سے درّہ بیوسر کے
راستے (سات دن کی مسافت) اور کشمیر میں کشن گنگا وادی سے درّہ شونتو کے ذریعے
پانچ دن کا سفر ہے۔ مزید برآں کشمیر کا موجودہ ریذیڈنٹ سری نگر کے قریب
جھیل وُلر سے درّہ راج دینگاں کے ذریعے سکاردو تک اور وہاں سے درّہ کنوری
کے ذریعے وادیٔ استور تک اور سندھ پر واقع بُنجی سے گلگت تک کوئی ۱۷۰
میل لمبی سڑک بنوا رہا ہے جو فوجی سڑک ہوگی اور مواصلات کو بہتر بنائے گی۔ موجودہ
سڑکیں صرف پیادوں کے لئے ہیں اور سردی میں بند رہتی ہیں۔ اس میں بھی شک
ہے کہ آیا سندھ سے چلاس بھی پہنچ سکتے ہیں یا نہیں اور اسی دشوار رسی کی وجہ
سے یہ برادریاں مختلف قومیتوں کی طرح الگ تھلگ رہی ہیں۔ یاغستان کا طغرائے
امتیاز یہی چھوٹی چھوٹی آزاد جمہوری ریاستیں ہیں۔ مسٹر ڈریو نے تھاکیچ کا ذکر کیا
ہے جو صرف گیارہ مکانوں پر مشتمل ہے لیکن ان ننھی مُنّی ریاستوں کا نظامِ حکومت
اتنا ترقی یافتہ ہے کہ شاید کٹر نظریہ پرست کو بھی مطمئن کر دے۔ مسٹر بڈلف کے
مطابق ہر گاؤں بہادری، زورِ خطابت اور وسیع مشربی کی بُنیاد پر امیدواروں
میں سے اپنا نمائندہ یا "جشترو" چُنتا ہے اور اندرونی طور پر آزاد ہے۔ اس
کی اپنی پارلیمنٹ ہے "سگاس" جس کے دروازے سب پر کھلے ہیں اور کوئی

بھی بحث میں حصّہ لے سکتا ہے بلکہ جشترو دوسروں کو مشورہ کی دعوت دیتے ہیں اور بغور سُنتے ہیں گو شاذ و نادر ہی مانتے ہیں۔ نظامِ وفاق بھی موجود ہے۔ ہر گاؤں کی پارلیمنٹ صرف ایک جشترو کو نمائندہ بنا کر وفاقی سگاٹس میں بھیجتی ہے اور یہ بھی سب کے لئے کھُلی ہے۔ لوگ اپنی بھڑاس نکال لیتے ہیں تو ایک سیٹی زور سے بجتی ہے جس کے بعد صرف جشترو ہی بول سکتے اور ووٹ دے سکتے ہیں۔ سگاٹس فوجداری مقدمات نہیں سُنتی بلکہ یہ اہلِ مذہب کا دائرہِ اختیار ہے جو رسم و رواج کو بھی مدِنظر رکھتے ہیں۔ قتل شاذ و نادر ہوتا ہے اور قریبی ترین عزیز کا ذاتی معاملہ ہے لیکن خونی جھگڑے زیادہ دیر نہیں چلنے دیئے جاتے۔ اکثر ریاستوں میں غلامی کا رواج ہے۔ بہت سی وادیوں کے قدیم ترین اداروں میں عجیب ترین رسم یہ ہے کہ مئی تا ستمبر یعنی گرمی میں مرد عورت الگ الگ رکھے جاتے ہیں۔ بہار میں نوجوان اپنے ریوڑ پہاڑوں میں لے جاتا ہے اور پھر سردی تک وہ خیالاتِ عشق کو اپنے دماغ سے نکال دیتا ہے۔ بوڑھی عورتیں اس ضابطہ پر عملدرآمد کی ذمہ دار ہیں اور خلاف ورزی پر جرمانہ کیا جاتا ہے۔

کوہستان اور چلاس نے ہمسایوں کی حیثیت سے ہمارے لئے کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کیا اور نہ ہی شاید وہ ایسا کریں بشرطیکہ خطرناک بستیاں ان میں جڑ نہ پکڑیں یا ان کی پناہ میں نہ آئیں۔ الائی والوں اور ہزارہ کے گوجروں کے کبھی کبھی کوہستانیوں سے جھگڑے ہوئے جس کا سبب کوہستان کے جنوب مشرق کونے میں واقع علف زار اور چراگاہ، چرواہی میں قدم اندازی تھی اور کاکاخیل کے چوب سوداگروں کے ساتھ

بھی حال ہی میں ایک جھگڑا ہوا لیکن کوہستانی جرگہ نے ہمارے افسروں کے
ساتھ معاملہ طے کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ دونو ہمارے ساتھ تجارت کرتے
ہیں۔ ان کی پیداوار زیادہ تر ریوڑوں اور گلّوں سے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ
خاکِ زر اور عمارتی لکڑی بھی وہ دریا کے ذریعے اٹک بھیجتے ہیں۔

ایسی ریاستوں کی متحارب نفری کا اندازہ غیر یقینی بھی ہے اور
بے اہمیت بھی۔ ہو سکتا ہے وہ کسی مشترکہ دشمن کے خلاف متحد ہو جائیں لیکن
ہمارے خلاف ایسا اتحاد بے معنی ہوگا کیونکہ اُن کے آلات فرسودہ و کہنہ ہیں
ان کی اصل طاقت ان کا قدرتی محلِّ وقوع ہے جس میں ہم مخل نہیں ہونا چاہتے
ان کی کمزوری یہ حقیقت ہے کہ وہ ایک زوال پذیر نسل ہیں جو پٹھان جیسی طاقتور
نسل کے سامنے ہیچ ہیں۔ وہ انہیں نکال بھی سکتی ہے اور جذب بھی کر سکتی
ہے۔ اس کی طاقت میں روز بروز اضافہ ہوگا اور جشترو اور دیہاتی پارلمانوں
کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں مرورِ زمان کے ساتھ قعرِ گمنامی و نیستی میں گرتی جائیں گی۔

لیکن یہاں سے ہی، ہزارہ اور سندھ سے، کشمیر کی مغربی سرحد کے
کوہستان سے کابل کے شمالی کوہستان تک بلند چوٹیوں اور الگ تھلگ وادیوں کا
ایک سلسلہ ہے جس میں ایسے لوگ رہتے ہیں جن کا مستقبل روز بروز ہندوستان
اور اس کے سرحدی دفاع کے نکتۂ نظر سے اہم تر ہوتا جا رہا ہے۔ چلاس کے
شمال میں اور بنیر، سوات، دیر، بجوڑ اور کنار وادیوں سے پرے کچھ کم
مانوس ریاستوں کا ایک سلسلہ ہے جو ناگر، ہنزہ، گلگت، یاسین، چترال
وغیرہ پر مشتمل ہیں اور ان کے مزید مغرب میں ہنوز نامحرم و نامعلوم کافرستان ہے

یہ محض قزاق قبائل کا مجموعہ نہیں ہیں بلکہ زمیں بستہ اور وسیع زرعی آبادیاں ہیں جن کے بہت سے حکمران خاندان پشت ہا پشت سے مسلسل برسر اقتدار ہیں۔ لوگ مختلف نمونوں کے ہیں۔ ہندو، منگول اور تاتار عناصر کے پہلو بہ پہلو پٹھان، آریہ اور شاید یونانی عناصر بھی موجود ہیں یا ایک حالیہ روسی مبصر کے مطابق (جو زار کے لئے "قدرتی رعایا کا متلاشی تھا") بلا شک و شبہ سلاو" ہیں۔ عقائد کے اعتبار سے چٹان میں کندہ بدھ کی مورتیاں، قدیم ترین برہمنوں کی رسومات، شیئوں کا نظریہ کہ گائے کی ہر چیز غلیظ اور ناپاک ہے، الگ تھلگ وادیوں میں زرتشت کا اثر اور آتشکدے، قدیم آریہ رسمیں اور لنگم، درخت اور منتر کی پوجا سب یہاں موجود ہیں اور ان سب کے اوپر اسلام نہایت سکون و اطمینان سے غالب آرہا ہے جسے سوات اور بنیر کے پیر اور مُلا زور شور سے یہاں پھیلا رہے ہیں۔

قبائل اور ذاتیں بھی ہماری قریبی سرحد اور ہندوستان سے مختلف ہیں۔ یہ ایسی زبان اور بولیاں بولتے ہیں جو مخصوص وادی کے باہر ناقابل فہم ہے۔ بڈلف نے دس ایسی زبانوں کی فرہنگ دی ہے جو کوئی خاص ماہر لسانیات ہی سلک درجہ بندی میں لاسکتا ہے۔ معاشرے شراب خوری اور عیش پسندی میں ڈوبے ہوئے ہیں جو گھی کے لئے سرداب تعمیر کرتے ہیں اور اسے اس وقت پختہ سمجھتے ہیں جب یہ ایک صدی پڑے پڑے گہرا سرخ ہو جاتا ہے، جو رقص کو دونوں اصناف کے لئے قومی تفریح اور پولو (چوگان) کو قومی کھیل سمجھتے ہیں، جو اب بھی طرزم کے

جھوٹ سچ کے لئے اُسے آگ سے گذارتے ہیں اور جو عام حد سے اِتنے پاک ہیں کہ رسم کے مطابق مہمانداری کے لیے میزبان اپنی بیوی بھی مہمان کو پیش کر دیتا ہے۔ یہ ممالک اور ان کے لوگ عظیم ترین نسلیاتی اور سیاسی اہمیت کے حامل ہیں اور شا، ڈریو، لیٹنر اور بڈلف نے بعض پہلوؤں کی نقاب کشائی کی ہے تاہم بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

اِن سب کے شمال میں ہندوکش دریائے جیحوں اور دریائے سندھ کے درمیان کا بین الدریائی فرار ہے جس کے درّے اِتنے مشکل ہیں کہ بڑی فوج کے گذرنے کا سوال ہی نہیں۔ لیکن جوں جوں ان کے متعلق ہمارا علم بڑھتا ہے ووں ووں معلوم ہوتا ہے کہ ایک چھوٹی فوج بہ آسانی کئی جگہوں سے داخل ہو سکتی ہے اور پھر کسی مرکزی وادی میں پڑاؤ ڈال سکتی ہے جیسے چترال جسے بعض اوقات حاکم کا لشکر کا صدر مقام کہا جاتا ہے۔ یہ کافی بڑی اور زرخیز ہے اور یہاں سے داخل شدہ فوج جنوب میں گلگت یا جلال آباد کی طرف بڑھ سکتی ہے اگر ایسے مداخلت کار وہاں ٹھہر جائیں اور کابل یا کشمیر یا ہماری سرحد کے پٹھان جنونیوں پر اپنا اثر و رسوخ قائم کر لیں تو ایک فتنۂ عظیم اُٹھ سکتا ہے جس کا سدِباب ضروری ہے۔

اِسی دلیل کی بنا پر ان ممالک کا افغانستان کے زیرِ تسلط چلے جانا غیر مستحسن ہے۔ کشمیر اور کابل کے درمیان ایک درجن آزاد اور حریف ریاستوں کا وجود ان دونوں کی دغابازی کا توڑ ہے۔ پچھلے چند سالوں سے امیر عبدالرحمٰن ان پر دندان آز تیز کئے ہوئے ہیں۔ ان کی باہمی کشمکش کا فرستان میں غیر مختتم ہے اور یہ لوگ اپنے

مسلمان ہمسایوں سے بھی لڑتے ہیں اور آپس میں بھی لہٰذا امیر کو ایک عذر مداخلت مل گیا ہے اور مزید ریشہ دوانیاں جاری ہیں۔ کافرستان اور بجوڑ کے خلاف اس کی مہم بجوڑی مقاومت سے اتنی نہیں رکی جتنی اس کے قریب کشنواری بغاوت سے اور کسی سازگار وقت اس کی واپسی کے عزائم نے بے چینی پیدا کر دی ہے کیونکہ امیر کا سازگار وقت بہت تلخ ہوتا ہے۔

لہٰذا اوّلاً یہ سمجھنا ضروری ہے کہ یہ ریاستیں افغان حدِ اثر سے باہر سمجھی جائیں اور ثانیاً یہاں برطانوی اثر و رسوخ کے قیام کے لئے زیادہ موثر اقدامات لینے چاہئیں۔ چترال کو لوکہارٹ مشن کی روانگی اور گلگت میں ایک ریذیڈنٹ کی تعیناتی سے یہ عمل شروع کیا جا چکا ہے۔ کشمیر گلگت روڈ کا افتتاح اس میں معاون ہوگا اور ڈھاکا تک ریلوے لائن اسے مزید تقویت دے گی کیونکہ دستے فوری نوٹس پر جلال آباد پہنچ سکیں گے۔ ریاستیں انگریزی افسروں کو خوش آمدید کہنے کے لئے تیار ہیں بالخصوص کافرستان جو ایک ایسا ملک ہے جس کی ہمدردیاں اور رجحانات آریہ نسل سے زیادہ مشابہ و مشترک ہیں اور یہ چیز ہماری پوری شمال مغربی سرحد پر کسی اور جمعیت کو نصیب نہیں۔

اگر یاغستانی ریاستیں آزاد رہ سکیں تو فبہا ورنہ برطانوی اثر و رسوخ یہاں غالب ہونا چاہیئے اور جتنی جلدی اس کے قیام کے لئے براہِ راست اقدامات کئے جائیں اتنا ہی بہتر ہوگا۔

چالیسواں باب

وادیٔ ہزارہ

شیکسپیئر نے بالنگ بروک کی زبان سے جو کچھ انگریزی ضیافتوں کے متعلق کہلوایا ہے وہ بدرجۂ اتم ہر اُس بیانِ سرحد پر بھی پُورا اُترتا ہے جو ہزارہ پر ختم ہونا چاہیئے۔ "آخری لطیف ترین دَور، تاکہ اختتام لذیذ ترین ہو!" اور پوری سرحد کے ساتھ ساتھ کراچی سے کشمیر تک کوئی جگہ ایسی نہیں جو پہاڑوں کی رفعت، بے شمار ندیوں، تصویر خیز مناظر اور دلکش تنوّع کے اعتبار سے وادیٔ ہزارہ کی ہمسری کر سکے اور لطف یہ ہے کہ شاید ہی کوئی جگہ مختلف النوّع لوگوں یا خوشحال دیہات یا برطانوی حکومت کے سودمندانہ استحکام میں اس کے مقابلے پر آسکے: ایک طویل، گاؤدم جیسا علاقہ، خالص کوہی نوعیت کا، اردگرد بلند پہاڑوں کا جنگلہ ہوا ہے کشمیر کی جنت نظیر وادیوں سے جدا کرتا ہے اور کوہستان کی وسیع و بسیط چٹانی اور برفانی چوٹیوں سے بھی؛ اور وارفتہ جہلم اور اس کے معاونین اور درشت اور گمبھیر سندھ کے درمیان: شمال کی طرف جا اس کے دُور افتادہ اور برف پوش سلسلے ہیں جن کے وسط میں دیو ہیکل ننگا پربت ایستادہ ہے، مشرق کی طرف کاغان کی اونچی متعدد چوٹیاں جو اپنی

انتہا تک چراگاہ ہیں اور جہاں گھاس نہیں وہاں جنگل ہیں۔ مناظر کوہ کا ایک سلسلۂ دراز جو تختِ موسٰے کی ابدی برف سے جنوب کی طرف بڑھتا ہے دلربا پہاڑیوں سے ہوتا ہُوا اور حسین و جمیل مقامات سے گذرتا ہُوا، گلیات سے مری تک؛ مغرب کی طرف خوبصورت جنگلات سے لدے پھندے سلسلے، وادیاں اور چوٹیاں اپنی بے نظیر بلندی و دلکشی کے ساتھ اِسے سندھ میں گرنے والی سواتی وادیوں سے جُدا کرتے ہیں اور اگرور کے پُربہار راستوں سے پرے کوہِ سیاہ سرافراختہ ہے۔ ہموار زمین کا ہر قطعہ زیرِ کاشت ہے، ہری پور اور پکھلی کے ثمر بار کھیتوں سے لے کر دُور دراز ترین وادیوں میں نہایت محنت سے بنائی ہُوئی چبوترہ دار تنگ پٹیوں تک اور ہر جگہ کاشت کو فراواں آبپاشی میسّر ہے؛ پانی کے لئے ہماری سرحد ترستی ہے اور اِس کا فقدان ہمارے پہاڑوں کا نصف حُسن غصب کر لیتا ہے لیکن یہاں پانی ہر شکل میں موجود ہے؛ کاغان کی گہری نیلی اور پُرسکون جھیلیں؛ سندھ اور جہلم کے دندناتے ہوئے دھارے، تنگ تر کُنہار کے طوفانی نالے، ہر سمت سائیں سائیں کرتی ہوئی ندیاں اور نالیاں جو ہر کھیت کو سیراب کرتی ہیں، پن چکیوں کی صورت میں غلّہ پیستی، دھان کو صاف کرتی اور کپاس کو اُجلا کرتی ہیں اور جنہیں سواتی کاشتکار کی خادمائیں کہتے ہیں۔"

بے پناہ جنگل اور پانی، بے حساب گھاس اور ان گنت بھولی اور ہنستے بستے دیہات اور ہنستے کھیلتے گھرانے شاہد ہیں کہ کم از کم ہزارہ میں سلطنت امن ہے اور وادی کے عین وسط میں اِس سلطنت کی تجسیم ایبٹ آباد کی چھاؤنی اور

۱

صحت افزا مقام کی صورت میں نصیب ہے ! ایبٹ آباد کا بلند اختر مقام پہاڑوں
کے مناظر اور آب و ہوا اور میدانوں کی بسط و کشادگی کا سنگم ہے ! یہاں
انگریزی کوُچے منطقہ حارہ اور منطقہ معتدلہ کے پھلوں اور سبزیوں کے باغات
سے گذرتے ہیں اور انگریزی گلاب کے پھول اور گلبار جھاڑیاں دیودار، صنوبر،
شاہ بلوط اور چنار کی متنوع ترین قسموں کے پہلو بہ پہلو اپنا جوبن دکھاتے ہیں !
اور جہاں یہ بھی کہا جا سکتا ہے (محض شاعرانہ تاثر کے لئے نہیں بلکہ ایک تاریخی
حقیقت کے طور پر) کہ انگریزی تہذیب اور نظم و نسق نے بعض بہترین سرحدی
نسلوں کو باہمی جدال و قتال سے چھڑایا ہے اور ایک بے نظیر خوشحالی سے متمتع
کیا ہے ! یہ ضلع انگریزوں نے سکھ گورنر کی پسند کے مطابق ۱۸۴۷ء میں
جموں کی جنوبی سرحد پر ایک قطعۂ ارض کے بدلے لیا اور یہ اس وقت پُر آشوب تھا
لیکن ۱۸۴۸ء میں اسے اپنی تاریخ میں پہلی بار "مکمل طور پر پُرسکون" قرار
دیا گیا۔ اس وقت سے اس کی خوشحالی و ترقی کی کہانی ضلع کی سرکاری دستاویزات،
میجر ویس کی رپورٹ بند و بست اور گزیٹیر کے اعداد و شمار میں درج ہے لیکن
ان سے بھی بڑھ کر یہ خود اس علاقے کے چہرے بشرے پر مرقوم و مرئی
ہے ! صرف بیس سالہ برطانوی حکومت کے تحت اس کی آبادی ۵۰ فیصد
بڑھی، مزروعہ رقبہ دوگنا ہوا اور مویشیوں اور زرعی پیداوار کی مالیت دوگنا سے
بھی زیادہ ہو گئی۔ تیس سال میں معمولی ٹیکس سے مالیات دوگنا ہو گئے، درآمد
چھ گنا بڑھی اور کئی غیر اہم اشیا بے حد تجارتی اہمیت اختیار کر گئیں۔ دہاڑی کرنے
والا مزدور پہلے کھانے یا ایک آنہ یومیہ پر کام کرتا تھا اور اب گاؤں میں دو آنے

اور قصبوں میں چار آنے سے کم نہیں لیتا۔ جُلاہا جو ایک روپے کے بدلے سات
چادریں اور چودہ آنے کے لئے ایک نفیس پگڑی بُنتا تھا اب چار چادروں کے لئے
ایک روپیہ اور پگڑی کے لئے دو روپے لیتا ہے اور رنگریز چار آنے کی بجائے
آٹھ آنے کماتا ہے۔ اعداد و شمار کے مطابق اب مزدور کو مجموعی طور پر بہت زیادہ
ملتا ہے۔ وہ کھاتا ہے، پیتا ہے اور مگن ہے اور خود بھی خرچ کرنے کی استطاعت
رکھتا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اچھی اور مضبوط حکومت یہاں کی طرح
سرحد پر ہر جگہ کایا پلٹ کر سکتی ہے!

یہ بات نہیں کہ یہاں کے لوگ زیادہ ذہین و طباع ہیں بلکہ سرحد کے دوسرے
حصّوں کے مقابلے پر اُن کا پلڑا ہلکا ہی ثابت ہوگا۔ اپنی سابقہ شورش و لغاوت
کے باوجود ان میں پٹھان یا بلوچ کی سی شہ زوری اور مردانہ صفات نہیں ہیں اور
گو وہ مقدمہ بازی میں بہت تیز ہیں تاہم "جنگ کا فولادی اور آتشیں بستر"
ہزارہ کے اوسط باسی کو ہرگز پسند نہیں اور نہ اس میں تمنائے رفعت و عظمت
ہے، وہ انہیں آفریدیوں یا یوسفزئیوں کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ اُس کی وادی
کم جنگجو لوگوں کی آماجگاہ بنی رہی ہے اور وہ انہی کا زندہ نمونہ ہے۔ ابتداء میں
اس وادی میں مخلوط ہندی یا آریہ ماخذ کے لوگ آباد تھے۔ جب کمتر پٹھان
دلازاک پندرھویں اور سولھویں صدی میں وادئ پشاور سے نکالے گئے تو
وہ سندھ پار کر کے سیدھے ہزارہ آ گئے۔ سترھویں صدی میں تناولی بھی آ گئے۔ پھر
مہابن کی ڈھلانوں سے جدون آئے اور ایک پٹی پر قابض ہو گئے۔ قرلاغ ترک
جو اگر چنگیز خان کے ساتھ نہیں تو تیمور کے ساتھ آئے اور پکھلی میدان کے ایک

حصّہ پر متصرف ہو گئے۔ اسی طرح سادات نے جلال بابا کے تحت کاغان کو اپنا لیا، نچلے حصّوں میں ترین براجمان ہوئے اور آخر کار یوسفزئیوں نے سندھ پار کیا، ہر ایک کو تھوڑا تھوڑا پیچھے دھکیلا اور کوہ سیاہ میں متوطن و متمکن ہو گئے۔ اصلی نسل کے اس توزّع پر غور کیا جائے تو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ آبادی مخلوط ہے۔ سرسری طور پر موجودہ تقسیم حسب ذیل ہے: مانسہرہ کے شمال میں سواتی تقریباً ایک تہائی ضلع پر قابض ہیں؛ ہندی الاصل قبائل کے باقیات جیسے گوجر، گکھڑ، ڈھنڈ اور کرال مذکورہ آمیزش کے ساتھ جنوب اور جنوب مشرق میں براجمان ہیں، وسط کی ڈور وادی جدُّونوں کے پاس ہے، مغرب میں امب کی نیم آزاد ریاست میں تناولی مقیم ہیں۔ سواتی اور گوجر اگرور میں ہیں اور کوہ سیاہ کے یوسفزئی علاقہ تک پھیلے ہوئے ہیں اور سادات گھرانے ضلع کے طول و عرض میں بکھرے ہوئے ہیں۔

سواتی کی حالتِ زار کا نقشہ پہلے کھینچا جا چکا ہے۔ شیطان کے ساتھ اس کی زرعی شراکت ایک داستان ہے جو کئی ملکوں میں اپنے اپنے رنگ کے مطابق متداول ہے۔ پہلے معاہدہ کے مطابق سواتی نے مکئی بوئی، بالائی حصّہ اپنے لئے رکھا اور زمینی حصّہ شیطان کے لئے لے پایا۔ جب فصل کاٹنے کا وقت آیا تو حصّہ دار نے اپنے حصّہ کا شکوہ کیا تو سواتی نے انصاف کی خاطر معاہدہ کو اُلٹ کر دیا۔ اس کے بعد اگلے موسم میں اُس نے گاجریں بوئیں اور شیطان مغموم کو چھڑ جل دے دیا۔ اس پر اُس نے شراکت منسوخ کر دی۔ تناولی کسی وقت جنگجو ہوگا لیکن اب نہیں ہے۔ وہ عہد شکنی اور دیگر برائیوں میں سواتی کا ہم پلّہ ہے۔ کہاوت "تناولی کا قول صفر ہے" عین اس پر صادق اترتی ہے۔ جدون کا ماخذ کچھ بھی ہو لیکن سندھ پار

کرنے کے بعد سے وہ انحطاط پذیر ہے اور اب اپنے مہابن اقربا سے بہت کمتر ہے۔ ڈھنڈ اور کرال ہندو سے مسلمان ہوئے ہیں اور بے ایمان، چالباز اور بزدل مشہور ہیں۔ باہمی دغابازی کی وجہ سے ۱۸۵۷ء میں مری پر حملہ کرنے کی سازش کا پتہ چل گیا تھا اور اب اُن میں وہابیت کا رنگ آ گیا ہے۔ اِس گلدستۂ انسال کے بہترین لوگ گوجر اور گکھڑ ہیں ــــ محنتی کاشت کار، جفاکش کسان، مضبوط جسمانی ساخت، درمیانہ درجہ کے سپاہی اور پُرامن لیکن حوصلہ مند شہری نہیں اور ہماری پشت پناہی کے بغیر وہ شاید جم ہی نہ سکتے؛

مذہباً سب مسلمان ہیں۔ ہر عقیدہ کے ہندو صرف پانچ فیصدی سے ذرا زیادہ ہیں۔ مسلمان تعصّب سے مبرّا ہیں۔ اوسط قد وقامت پشاور کی اوسط سے یقیناً کم اور پٹھان اہلِ کوہ کے نفیس نمونوں سے تو مقابلہ ہی کیا؟ ڈھنڈ اور کرال پست قد ہیں۔ جدون اور تناولی گٹھے ہوئے نہیں ہیں، اگرور کے سواتی لاغر اور بے دَم ہیں لیکن کاغان کے سواتیوں میں بعض بہت گرانڈیل انسان بھی ہیں۔ وادی کے اکثر باشندوں کے خدوخال اگر کلاسیکی نہیں تو دلربا ضرور ہیں۔ عورتوں کی حیثیت وُہی جیسی پٹھانوں میں بالعموم، قیمتی جائداد لیکن بیویوں کی بجائے خدمتگار بالخصوص سواتیوں میں لیکن سواتی اور اعوان زئی عورتیں خوش وضع ہیں اور اکثر گوجر مستورات حسین وجمیل ہیں۔ قبائلی اطوار پر ایک کہاوت ان کا لبِّ لباب ہے: "سواتی کی محنت شاقہ، جدون کی چکّی، دلازاک کی طوائف، ترک کی مستی و بیخودی اور ترین کی حکومت خود اختیاری"۔ سواتی کی بیوی کھیت کی مزدور ہے، جدُن خاتون اکثر چکّی پر جاتی ہے اور رات بھر وہاں ٹھہرتی ہے اور لبا اوقات داغدار ہو کر

واپس آتی ہے، دلآزاک مستورات بھی مائلِ عیش وعشرت ہیں، ترک کاہل الوجود اور نازبرداری کے متمنّی ہیں اور ترین محکوم زن ہیں ؛

اِتنے مختلف النوّع لوگوں کی سماجی عادات اور قبائلی رسومات کے خاکہ کے لئے بمصداق "سفینہ چاہیئے اِس بحرِ بیکراں کے لئے" کافی جگہ درکار ہوگی۔ ان کا مشترک عنصر یہ ہے کہ وہ سب کے سب خاصی اطاعتگزار رعایا ہیں۔ کُھلم کُھلا تشدّد نایاب ہے، قاتل کی گولی اور چُھرا اُن کے یہاں فریب اور سازش کا رُوپ دھار لیتے ہیں اور بیشتر لوگ ہمسایوں کا خون کرنے کی بجائے صابرآنہ و تساکرانہ محنت مشقت کی طرف مائل ہیں۔ پھر بھی خوبصورت ترین پہاڑی وادیوں کی ملکہ، وادئ اگرور سازش د شورش کا اڈّا ہے اور ہر وقت کسی نہ کسی فتنہ کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔ ۱۸۶۸ء میں خان کو لاہور لے گئے اور کڑی نگرانی میں رکھا اور بحال ہونے کے کچھ عرصہ بعد تک امن وامان رہا لیکن کوہ سیاہ کے قبائل کے ساتھ اگرور کی حالیہ سازباز اِس طرف ہماری مشکلات کا بنیادی سبب بنی ہے اور ہر وقت چوکنّا رہنے کی ضرورت ہے ؛

تمّت بالخیر

ہماری مطبوعات

چند نئی تصانیف کے علاوہ بلوچستان وملحقہ علاقوں میں انیسویں صدی اور اس سے پہلے ادوار کے تاریخی، جغرافیائی، سماجی، ثقافتی اور قبائلی حالات و واقعات سے متعلق نایاب کتب کے اردو تراجم :-

نام کتاب	مصنف	
• بلوچ قوم کی تاریخ	محمد سردار خان بلوچ	پروفیسر انور رومان
• بلوچستان تاریخ کے آئینے میں	جسٹس خدا بخش مری	پروفیسر سعید احمد رفیق
• مہمات بلوچستان	کامل القادری	
• بلوچستان ماقبل تاریخ سے بیسویں صدی تک	ملک محمد سعید	
• بلوچستان قدیم و جدید تاریخ کی روشنی میں	میر گل خان نصیر	
• بلوچستان کے سرحدی چھاپہ مار	جنرل ڈائیر	میر گل خان نصیر
• تاریخ خوانین قلات	اخوند محمد صدیق اور مرزا احمد علی، احمد	میر گل خان نصیر
• بلوچ قبائل	لونگ ورتھ ڈیمز	کامل القادری
• براہوی رسوم	ڈینس برے	کامل القادری
• پٹھان اور بلوچ	ایڈورڈ۔ ای۔ ابلیور	پروفیسر انور رومان
• بلوچستان اور سیستان کے خدوخال	جی۔ پی ٹیٹ	پروفیسر انور رومان
• سفرنامہ قلات	چارلس میسن	پروفیسر انور رومان
• بلوچستان	اے۔ ڈبلیو ہیوگز	پروفیسر انور رومان
• سفرنامہ بلوچستان و سندھ	پوٹینگر	پروفیسر انور رومان
• سیستان	جی۔ پی ٹیٹ	پروفیسر انور رومان
• شمال مغربی پاکستان اور برطانوی سامراج	میکمن	پروفیسر انور رومان
• مری بلوچ کلچر	رابرٹ پہرسن	پروفیسر ریاض صدیقی
• افغانستان دارا سے امان اللہ تک	میکمن	پروفیسر ریاض صدیقی
• مشرقی افغانستان کے خانہ بدوش قبائل	کیپٹن رابنسن	پروفیسر سعید احمد رفیق
• وسط ایشیا میں روس کے عزائم	پوپوسکی	نذیر حق
• قلات انیسویں صدی میں		پروفیسر ایم راشد الحق

نسا ٹریڈرز

nisa traders

6-BROWN GYMKHANA BUILDING, QUETTA (PAKISTAN)

PHONE : 74681-73528